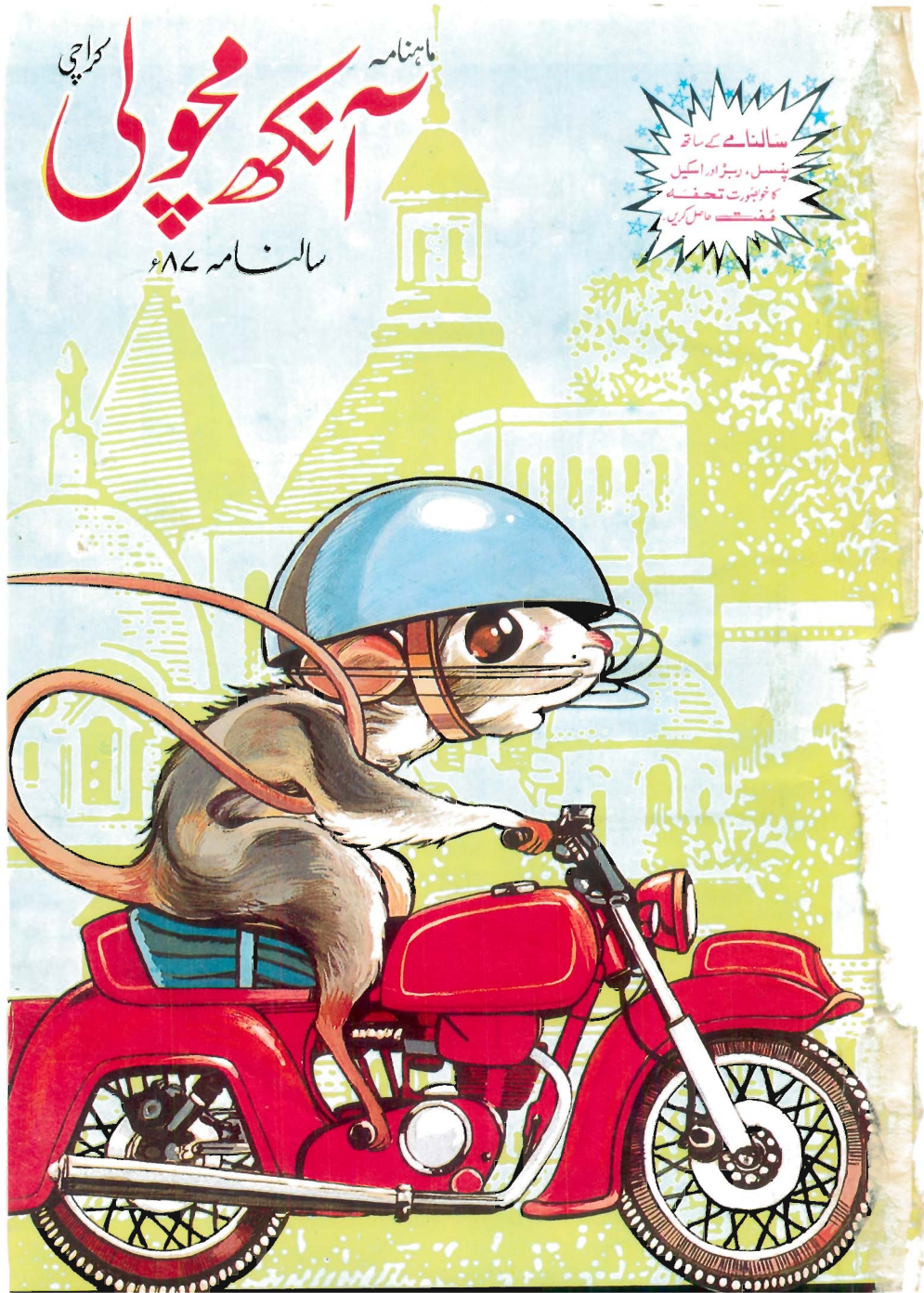
ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

سالنامہ ۸۷ء

سالنامے کے ساتھ
پنسل، ربڑ اور اسکیل
کا خوبصورت تحفہ
مفت حاصل کریں۔



Wobbly gobbly

AHMED

Six Fantastic Fruity Flavour







CONTINENTAL BEVERAGES (PVT) LTD.

D-210, ESTATE AVENUE S. I. T. E., KARACHI-16

تیراک توتا





آپ نے پانی کی سطح پر بعض لوگوں کو سلپ ہوتے ہوئے دیکھا ہوگا۔

پانی پر پھسلنے والے کھیل کو اسکینگ SKIING کہتے ہیں یہ کھیل عام انسانوں کے لئے آسان نہیں ہے اور کجا یہ کہ اسے کوئی جانور یا انسان کھیلے مگر حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سانچو نام کے یہ مٹھو میاں بڑے مزے میں یہ کھیل کھیلتے ہیں اور اس کھیل کی بدولت انہیں بڑی شہرت حاصل ہوئی ہے۔ ویسے بھی یہ اپنی نسل کے نایاب طوطے ہیں۔

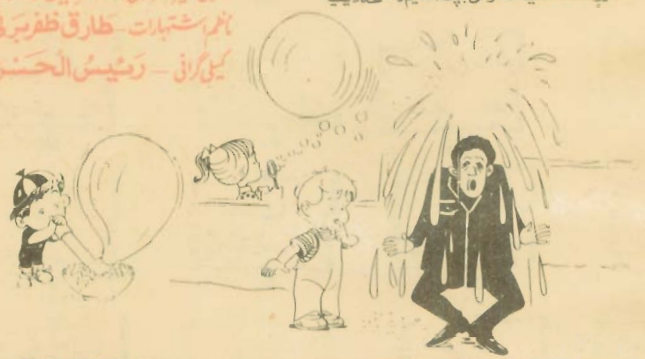
سانچو کی عمر سات سال ہے ہم انسانوں کی تو مجبوری ہے کہ دریا کو تیر کر یا اسکینگ کے ذریعے پار کریں۔ سانچو تو اڑ کر بھی دریا پار کر سکتا ہے لیکن یہ ان کا شوق ہے ان کے مالک کا کہنا ہے کہ مستقبل میں سانچو میاں طوطوں میں واٹر اسکینگ کے چیمپئن بھی ہو سکتے ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے طوطا شو میں سانچو نے اپنے دوسرے کمالات بھی دکھائے تھے جس میں ایک اونچے تار پر ننھی بائیسکل کا چلانا دس تک گنتی گننا اور پانی میں اسکینگ کرنا شامل ہے پھر انہوں نے اپنی ایک فلم کے لئے اداکاری بھی کی ہے۔ اس قسم کے طوطے جنوبی امریکہ میں پائے جاتے ہیں ان کو مکاؤ نسل کے طوطے کہا جاتا ہے سانچو کے ٹرینر یا استاد راولگھ آرمز نے ان کی تربیت پر سات مہینے صرف کئے اور سانچو نے اچھے شاگردوں کی طرح اپنے استاد کا ہر کہا مانا اور اُسے بالکل تنگ نہ کیا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی

جلد نمبر ۲ ۔ شمارہ نمبر ۱
جولائی ۱۹۸۰ء ۔ ذیقعد ۱۴۰۰ھ
قیمت : ۱۰ روپے
زرِ سالانہ کے لیے خصوصی بچت اسکیم کا صفحہ دیکھیے

سرپرست ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
مدیرِ اعلیٰ ۔ ظفر محمود شیخ
مدیرِ مسئول ۔ تجمل حسین چشتی
مدیرانِ آزمائی ۔ ابجد اسلام ابجد
محمد سلیم مغل
مدیرِ معاون ۔ محمد اعظم منہاس
قانونی مشیرِ اعزازی ۔ عدیل احمد عدیل
ناظمِ اشتہارات ۔ طارق ظفر برنی
کیلی گرافی ۔ رئیس الحسن



ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ دیگر کہانیوں کے کردار اور واقعات فرضی ہیں۔ کسی تقابلِ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا۔

ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے حقوق بحقِ ادارہ محفوظ ہیں۔ پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جاسکتی

گرین گائیڈ اکیڈمی

ادارہ اشاعت برائے
تعلیم و تربیت سیرتِ اطفال
زیرِ سرپرستی
(ضیاء الدین میموریل آرگنائزیشن)

ناشر : ظفر محمود شیخ ۔ طابع : زاہد علی ۔ مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ، کراچی

برائے خط و کتابت و مقامِ اشاعت :۔ گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲۔ ڈی نورس روڈ سائٹ، کراچی

حسنِ ترتیب

گیت — ابوالسلام امجد ۱۹
سب سے عظیم کہانی — انور سدید ۲۱
اچھی کتابیں اچھے رسائل — سید کاشان جعفری ۲۵
جلیبیاں — احمد ندیم قاسمی ۳۰
گپ بازنگ — علی نوری ۴۵
بھیا اور بہنا — ثاقب رحیم الدین ۴۹
آمنا سامنا — خالد اقبال ۵۷
ملاقات ایک جھوٹ سے — نعیم موج ۶۷
جھوٹا بھرم — ذیشان بن صفدر ۷۵
ماما — پروفیسر عنایت علیخان ۸۳
پاکستان نظم — پروفیسر عنایت علیخان ۹۱
پتوار — اسماء ہارون ۹۳
اے خدا میرے گھر آجا — اظہر زین ۹۶
ذہانت — اختر عباس ۱۰۱
فیصل مسجد ایک تعارف — ۱۰۸
سبق — نعیمہ خاتون شمع ۱۱۱
پھول پتیاں جمع کرنا — عقیل عباس جعفری ۱۱۷
شکھ چین کا محل — زینت ہمایوں ۱۲۱
اتنی سی بات — غازی مختار ۱۲۷
بات بتنگڑ — منتخب لطائف ۱۳۷
جنگل میں کرسمس — ایم وائی صنم ۱۴۰
میٹھے بول (آدابِ زندگی) — اعظم عظامس ۱۴۵
چڑیا کا ایک منا نظم — اعظم عطیہ صدیقی ۱۲۵
پاشیلٹ — مصطفیٰ چاند ۱۴۷

آخری قدم
ردی میں بدلتا ہے ۱۹۲

میں نیل ہوں
سید ابو احمد عاکف ۱۷۰

گپ شپ
خاور عابد نظامی ۱۸۱

انجام
محمد امان خان بدل ۱۸۳

زبان کی کہانی
محمد خالد ۱۸۷

نئی زندگی
طاہر نقوی ۱۹۳

کومان کا آدم خور
محمد سعید عباس ۱۹۹

انکل آئی کیو بوٹ
سائنسی سوالات جوابات ۲۰۳

برگد کا درخت
محمد عبدالرحمٰن خان ۲۰۷

جب چنگاری شعلہ بنی
صدف مہین کاظمی ۲۱۱

محنت کا پھل
چینی کہانی ۲۱۹

سحر ہونے تک
فائزہ مباحث ۲۲۰

زبان جسم جہان بان نظام
۲۲۵

پاسبان (سلسلہ وار ناول)
الف مک سلیم ۲۴۰

واپسی
سید عبدالودود شاہ ۲۴۹

فرض شناس
کلثوم واحد ۲۵۲

شام ڈھلے
ایم افضل ۲۵۹

دو گنجے گنجے بچے
احمد طلب صدیقی ۲۶۳

اچھی بہن
محمد جاوید خالد ۲۷۳

دائرہ معلومات
۲۷۸

وائے ڈبل اے
گل بیتانی ۲۸۳

چھپا رستم
حافظ ذوالجلال ارباب ۲۹۶

ایڈیسن
محمد سلیم مغل ۳۰۱

بچوں کی منتخب تحریریں
۳۰۵

آؤ ملائیں ہاتھ
۳۲۶

ایک صفحہ امی ابو کے لئے
۳۳۰



اچھی بات

ایک شخص جو ننگے سر اور ننگے پاؤں تھا اور جس کے پاس کوئی سواری بھی نہ تھی۔ عرب جانے والے ایک قافلے کے ساتھ سفر کر رہا تھا اور اپنی دُھن میں کہتا جاتا تھا کہ "نہ میں اونٹ پر سوار ہوں نہ اونٹ کی طرح میری پشت پر بوجھ ہے نہ کسی ملک کا بادشاہ ہوں نہ کسی بادشاہ کا غلام نہ مجھے کوئی غم ستاتا ہے نہ فکر۔ آرام اور آزادی کے ساتھ زندگی گذار رہا ہوں" ایک اونٹ پر سوار شخص نے اسے دیکھا اور کہا "اے شخص اس حالت میں ہمارے ساتھ کہاں جا رہا ہے تیرے بھلے کی کہتا ہوں لوٹ جا۔ راستے کی سختیاں تجھے ہلاک کر دیں گی" اس شخص نے سوار کی بات پر کچھ توجہ نہ دی اور برابر سفر کرتا رہا جب قافلہ ایک مقام پر پہنچا تو اس اونٹ پر سوار کو معمولی سی تکلیف ہوئی اور وہ مر گیا۔ اس کی موت کی خبر مشہور ہوئی تو وہی بے نوا مسافر اس کی میّت پر آیا اور کہا "ہم تو اس سختی میں زندہ ہیں لیکن تو ہر طرح کی آسائش میں رہتے ہوئے مر گیا۔" (حکایت سعدی)

قرآنی آیات، احادیث مبارکہ اور مقدس نام آپ کے مطالعے اور معلومات کے لئے شائع کئے جاتے ہیں۔ ان کا احترام اور انہیں بے حرمتی سے بچانا آپ کا دینی فرض ہے۔ اگر کوئی ایسا کاغذ کہیں گرا ہوا نظر آجائے جس پر آیات، احادیث یا متبرک نام لکھے ہوتے ہوں تو آپ انہیں کسی محفوظ مقام پر رکھ دیں یا پاک صاف پانی میں بہا دیں۔

اب فیصلہ کر لیجئے...

ایک سال بیت گیا۔ ایک سنگِ میل عبور ہوا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ۳۶۵ دن گذر گئے آپ کو احساس بھی نہیں ہوا کہ آپ نے ایک سال کی قلیل مدت میں اٹھارہ سو سے زائد صفحات پڑھ لیئے۔ آنکھ مچولی کے ۱۲ شماروں کو ایک دوسرے کے اوپر رکھ کر دیکھیں تو حیرت سی ہوتی ہے کہ صرف ۵۲ ہفتوں میں ۹ سینٹی میٹر بلند ایک ضخیم کتاب یا پھر ایک چھوٹا سا انسائیکلوپیڈیا تیار ہو گیا۔ آنکھ مچولی کے پہلے خوشگوار سال کی تکمیل پر ہم آپ کی خدمت میں سالنامہ پیش کر رہے ہیں جس کی سالگرہ سے وہ خود ہی سج دھج کر آپکے پاس آ رہا ہے.... آنکھ مچولی اپنی سالگرہ پر آپ سے کوئی تحفہ نہیں چاہتا بس آپ کی توجہ اور آپ کی محبت چاہتا ہے اس لئے کہ محبت سے بڑا کوئی تحفہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ سالنامہ پڑھیئے اور اپنے تاثرات سے آگاہ کیجئے... ہمیں بتایئے کہ ہم سے کہاں کوئی بھول ہوئی ہمیں کیا کرنا چاہیئے تھا اور ہم کیا نہ کر سکے؟ آپ کی تنقید اور آپکے مشوروں کی روشنی میں ہم نے اسے بنایا ہے اسی روشنی میں ہم اپنے سولہویں پہلے شمارے سے بارہویں اشاعت تک اس کی خوبصورتی میں اضافہ بھی ہوا ہے... یہ آپ ہی کے مشوروں کے باعث ممکن ہوا۔ بچوں کے ادب کے نام پر بہت کچھ چھپ رہا ہے۔ بہت کچھ بک رہا ہے مگر سچ سچ کہیئے۔

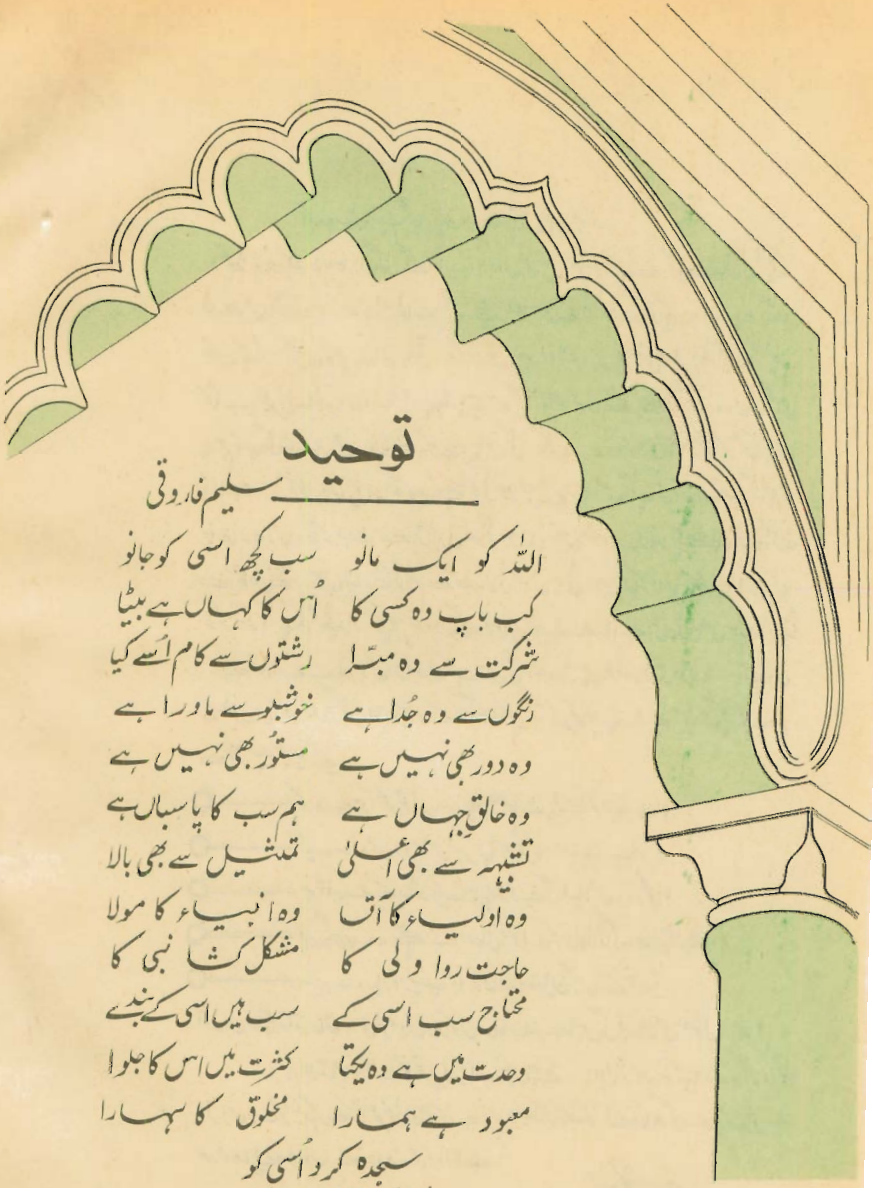
- کون ہے جو آنکھ مچولی سے زیادہ صفحات پڑھنے کو دیتا ہے؟
- ایک سال میں دو خاص نمبرس کا طرّہ امتیاز ہے؟
- ہر شمارے کے ساتھ ایک حسین تحفہ دینے کی بنیاد کس نے رکھی؟
- چار رنگوں سے سجے ہوئے اضافی صفحات کون باقاعدگی سے دیتا ہے؟
- سب سے زیادہ دلچسپ کہانیاں اور مضامین کس کے ہیں؟

اور ان سب کے ساتھ ساتھ۔ اتنی خوبیوں والا کون سا ماہنامہ ہے جس کی قیمت بھی معقول ہے؟

ہم ان تمام سوالات کا تحریری جواب نہیں چاہتے... ہمیں تو بس یہ کہنا ہے کہ اگر واقعی دل اس بات کو تسلیم کرلے کہ آنکھ مچولی ہی بہترین ہے تو پھر یہ فیصلہ کر لیجئے کہ "اسے باقاعدگی سے پڑھنا بھی ہے اور اسے اپنے دوستوں سے متعارف بھی کروانا ہے۔"

آپ کا دوست،

ظفر محمود شیخ



توحید

سلیم فاروقی

اللہ کو ایک مانو — سب کچھ اسی کو جانو
کب باپ وہ کسی کا — اُس کا کہاں ہے بیٹا
شرکت سے وہ مبرّا — رشتوں سے کام اُسے کیا
رنگوں سے وہ جُدا ہے — خوشبو سے ماورا ہے
وہ دور بھی نہیں ہے — مستور بھی نہیں ہے
وہ خالقِ جہاں ہے — ہم سب کا پاسباں ہے
تشبیہ سے بھی اعلیٰ — تمثیل سے بھی بالا
وہ اولیاء کا آقا — وہ انبیاء کا مولا
حاجت روا ولی کا — مشکل کشا نبی کا
محتاج سب اسی کے — سب ہیں اسی کے بندے
وحدت میں ہے وہ یکتا — کثرت میں اس کا جلوا
معبود ہے ہمارا — مخلوق کا سہارا

سجدہ کرو اُسی کو
آقا کہو اُسی کو



ھم پاک نبیؐ کی اُمّت ھیں

حفیظ الرّحمٰن احسنؔ

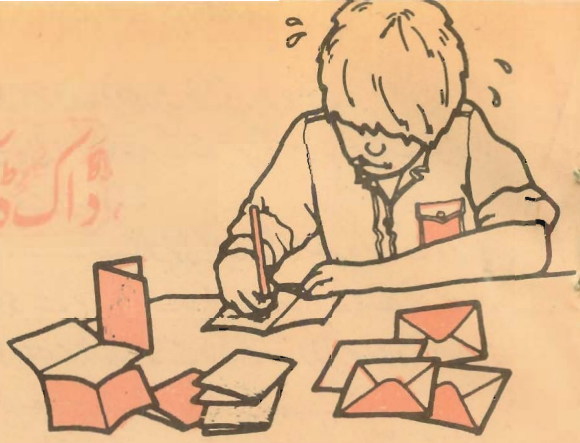
ھیں پاک نبیؐ کی اُمت ھم وہ الفت کرنے والے ھیں!
ھم ننھی منّی جانوں پر وہ شفقت کرنے والے ھیں
ھم سادہ فطرت والوں پر وہ رحمت کرنے والے ھیں

وہ سیدھی راہ دکھاتے ہیں
ہر پیاری بات سکھاتے ہیں

ھم ان سے محبت کرتے ھیں ھم ان کی اطاعت کرتے ھیں
ھم پر وہ خدا کی رحمت ھیں ھم کتنے ہی خوش قسمت ھیں
ہے شکر ھم ان کی اُمت ھیں ھم اِک پاکیزہ ملت ھیں

ھم اُمت پاک نبیؐ کی ھیں
ھم ملت پاک نبیؐ کی ھیں





ڈاک ڈاک کس کی ڈاک

(صفی الدین۔ ملتان) ——— بھیا آپ نے ہماری خیریت پوچھی ہے۔ اللہ کے فضل و کرم سے ہم خیریت سے ہیں۔ آپ نے لکھا ہے کہ سالنامہ کب آئے گا؟ لیجئے حاضر ہے! جہاں تک آپ کے قلمی دوستی کے تعارف کا تعلق ہے تو صورتِ حال یہ ہے اس وقت ہمارے پاس تعارف کی ایک لمبی فہرست موجود ہے۔ آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی آپ کی باری آئے گی انشاء اللہ آپ کا تعارف ضرور شائع کر دیا جائے گا۔

(قیصرہ حماد، واہ کینٹ) ——— قیصرہ بہن۔ آپ کی جانب سے عید کی مبارک باد اور رسالے کی پسندیدگی پر ہم آپ کے شکر گذار ہیں۔ آپ کی دعائیں شاملِ حال رہیں تو انشاء اللہ "آنکھ مچولی" ترقی کی راہ پر گامزن رہے گا۔

(شاہینہ جلال۔ میرپور خاص) ——— آنکھ مچولی آپ کو بہت عزیز ہے۔ ہمیں یہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی آپ کو شکایت ہے کہ ہم آپ کے خط کا جواب نہیں دیتے۔ لیجئے اب آپ کی شکایت دور ہو گئی آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ صرف تعریف و توصیف پر مشتمل خطوں کے جواب ہم نہیں دیتے۔ ذرا آپ ہماری راہنمائی بھی تو کیا کریں۔ تاکہ ہم آنکھ مچولی کو آپ کے لئے "بہت عزیز" کے بجائے "بہت ہی عزیز" بنانے میں کامیاب ہو سکیں۔

(محمد بلال ملک، تلہ گنگ) ——— بھیا بلال۔ آپ قلمی دوستی میں اشاعت کے لئے اپنا تعارف شائع شدہ کوپن پر لکھ کر ایک پاسپورٹ سائز بلیک اینڈ وہائٹ تصویر کے ساتھ روانہ فرما دیں۔ تصویر اصل ہو فوٹو اسٹیٹ نہیں۔ اُمید ہے آپ ہماری بات سمجھ گئے ہوں گے۔

(شہزاد کامران، حیات آباد پشاور) ——— شہزاد۔ آپ ہر ماہ باقاعدگی سے آنکھ مچولی خریدتے ہیں۔

ہم آپ کے ممنون ہیں۔ آپ کو کہانیاں لکھنے کا شوق ہے تو ضرور اس شوق کو پروان چڑھائیے۔

دیکھیں۔ ہم آپ کی تحریر دیکھے بغیر شائع ہونے یا نہ ہونے کے متعلق کچھ نہیں بتا سکتے۔ آپ کہانی روانہ فرما دیں اچھی اور معیاری ہوئی تو ضرور شائع کی جائے گی۔

(روبینہ احمد، لیاقت آباد، کراچی) ——— آنکھ مچولی کی پسندیدگی کا شکریہ۔ آپ نے تجویز دی ہے کہ دائرۂ معلومات کے علاوہ بھی انعامی سلسلے شروع ہونے چاہئیں۔ آپ سالنامے کا مطالعہ کر لیجئے۔ اس میں دائرہ معلومات کے علاوہ مزید انعامی سلسلے موجود ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وقتاً فوقتاً کبھی مقابلہ، مضمون نویسی یا تحریری مباحثہ وغیرہ کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ ہمیں آپ کی تجاویز کا آئندہ بھی انتظار رہے گا۔

(راشد منہاس، لانڈھی، کراچی) آپ نے پوچھا ہے کہ نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے ساتھیوں کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا ہے۔ ان ساتھیوں کے بہت بڑی تعداد میں خطوط اور رپورٹ کارڈ ہمیں موصول ہوئے ہیں۔ نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے دوستوں کو "سرٹیفکیٹ آف پوزیشن" کا سرٹیفکیٹ ماہ جولائی میں ارسال کر دیں گے نمایاں پوزیشن والے سب ساتھیوں کا انٹرویو آنکھ مچولی میں شائع کرنا ممکن نہیں۔۔۔ ہم انشاء اللہ باصلاحیت اور ذہین بچوں سے آپ کو ملواتے رہیں گے، اس سلسلے کا پہلا انٹرویو مارچ ۸۷ء کے شمارے میں "ڈوڈو" کا تھا اُمید ہے آپ کو پسند آیا ہو گا۔

(راحت صلاح الدین، منگھو پیر، کراچی) ——— تتھی راحت۔ ہمیں آپ کی کہانی مل گئی ہے۔ اور قابلِ اشاعت بھی ہے آپ اطمینان رکھیں جلد ہی شائع ہو سکے گی۔ آپ کو "حق اسکواڈ" اور "روبی" بھی بدلتا ہے بہت پسند ہیں۔ واقعی بچوں کی اکثریت بھی انہی سلسلوں کو بہت پسند کرتی ہے۔ آپ کی آئندہ تحریروں کا انتظار رہے گا۔

(جمیل احسن تبسم، میاں چنوں) ——— آپ کی ارسال کردہ دو عدد کہانیاں اور لطیفے موصول ہو گئے ہیں۔ کہانیاں تو پڑھنے کے بعد ہی بتا سکیں گے کہ کیسی ہیں۔ البتہ لطیفے ہم نے پڑھے ہیں۔ یقین مانیے یہ لطیفے تو ہم پہلے بھی کئی مرتبہ سُن چکے ہیں اور سُن سُن کر اتنے سُن ہو گئے ہیں کہ ہنسنے کو دل ہی نہ چاہا۔ آپ مایوس نہ ہوں اور پھر کوشش کر دیکھیں اور نئے لطیفے ارسال کریں۔ ٹھیک ہے نا۔

(شہزاد انور، ریلوے کالونی، راولپنڈی) ——— بھیا۔ دائرہ معلومات ماہ مئی ۸۷ء کے آخری سوال کا جواب آیت اللہ خمینی ہی ہے۔ لیکن شائد آپ کو معلوم نہیں اُن کا معروف نام روح اللہ خمینی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی یہی جواب درست مانا ہے۔

(نوازش عباس، ماڈل کالونی، کراچی) ——— بھیّا بہت بہت نوازش کہ آپ نے ہمیں "آدھی ملاقات" کے لئے یاد فرمایا۔ آپ کا کہنا دُرست ہے کہ آنکھ مچولی بچّوں کے ادب میں ایک الگ اور منفرد مقام رکھتا ہے۔ دُعا کریں "آنکھ مچولی" کی یہ انفرادیت برقرار رہے۔ اور ہماری بھی کوشش ہے اس کا ہر شمارہ خاص شمارہ ہو۔

(وقاص عزیز شیخ، فیصل آباد) ——— آپ نے لکھا ہے کہ ہمیں آپ سے کون سی دشمنی ہے کہ آپ کے خطوں کا جواب نہیں دیتے؟ وقاص بھائی۔ ہمیں آپ سے کیا، کسی سے کوئی دشمنی نہیں، ہم پاکستان ہی نہیں دُنیا کے ہر بچّے کو اپنے سے قریب سمجھتے ہیں۔ اور ہاں۔ ہماری محفل میں شریک ہونے کے لئے کوئی شرط نہیں اور سچ پوچھئے تو ہم "شرط" کے قائل بھی نہیں ہیں۔ بس آپ کا خط ہماری تعریف ہی پر مشتمل نہیں ہونا چاہئے، بلکہ ہمیں ہماری غلطیوں پر توجّہ دلائیں۔ ہمیں اچھے اچھے مشوروں سے نوازیں۔ اور لکھیں کہ آپ آنکھ مچولی کو کیسا دیکھنا چاہتے ہیں۔ آپ کے اِس پیارے ماہنامے میں کن کن چیزوں کی کمی ہے۔ کون سے نئے سلسلے شروع کئے جائیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر دیکھیں ہم جواب دیتے ہیں یا نہیں۔

(عادل مجید، آدم جی نگر، کراچی) ——— ماہ جون کے شمارے "عید اسپیشل" کا سرورق آپ کو بہت پسند آیا ہے۔ ہمیں خوشی ہوئی۔ آپ کی مبارکباد اِن سطور کے ذریعے "اُلٹا درخت" لکھنے والے مصطفیٰ چاند اور حق اسکواڈ لکھنے والے اخلاق احمد تک پہنچا رہے ہیں۔ آپ کی تحریریں ہمارے پاس موجود ہیں اور باری کی منتظر ہیں۔

(بصیر الدین گاہوٹھی، ہالا سندھ) ——— آپ اور آپ کے اسکول کے دوست "آنکھ مچولی" کو بہت چاہتے ہیں۔ آنکھ مچولی کے تمام چاہنے والوں تک ہمارا شکریہ پہنچا دیں۔ آپ کی دعا ہے کہ "رسالہ دن بدن ترقی کرے" ہم اس پر آمین کہتے ہیں،

(مظہر شاہ بخاری، پنڈ دادن خان) آپ نے پُوچھا ہے کہ میں ششماہی خریدار بن سکتا ہوں۔ اچھے بھیّا۔ ہمارے ہاں ششماہی خریداری اسکیم فی الحال نہیں ہے۔ ہاں اگر آپ سالانہ خریدار بننا چاہیں تو خوش آمدید۔ سالانہ خریدار بننے کا طریقہ یہ ہے کہ ۹۰/- روپے کی رقم بذریعہ منی آرڈر ہمیں ارسال کر دیں۔ رقم موصول ہوتے ہی ماہنامہ آپ کو جاری کر دیا جائے گا اور گھر بیٹھے بہ حفاظت آپ کو مل جایا کرے گا۔

ملک بھر سے لاتعداد ساتھیوں کے خطوط موصول ہوئے ... اچھی اچھی تجاویز، بہترین مشورے اور تنقید و تبصرے ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔ جہاں بدنصیبی میں ہم آنکھ مچولی کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کر رہے ہیں، ہم ان تمام ساتھیوں کے ممنون ہیں جنہوں نے ہمیں خط لکھے ... فرداً فرداً تمام خطوط کے جوابات دینا ممکن نہیں ہے اس لیے ہم نے چند منتخب خطوط کے جواب دیئے ہیں بقیہ نام "شکریہ" اور اس امید کے ساتھ شائع کر رہے ہیں کہ ساتھیوں کا یہ تعاون ہمیں ہمیشہ حاصل رہے گا ——— (ادارہ)

- احسان اللہ، ڈیرہ اسماعیل خان
- نثار احمد راجو، سنجوال
- الطاف حسین چشتی، گوجرانوالہ
- محمد شفیق، کوٹ بدرودین، قصور
- محمد علی صابر، ابراہیم پان ہاؤس گوادر
- ابرار احمد، لالہ رخ، پشاور
- آصف کامران، تونسہ شریف
- کامران سلیم، سندھی ہوٹل، نیو کراچی
- مقصود احمد، اورنگی ٹاؤن، کراچی
- گلشن کمار، متونگ، بلوچستان
- سبطِ شبیر، لطیٰ ٹاؤن، کراچی
- گل شیر، بازہ گیٹ، پشاور
- نجیب الدین محمد، یونیورسٹی کیمپس، پشاور
- نظیر احمد گاھوٹھی، ہالا، سندھ
- شفیق الرحمٰن، حالی نگر، حیدرآباد
- سیف الاسلام، کورنگی، کراچی
- مظہر علی، مقام نامعلوم
- عارف امیر عامر، راولپنڈی
- اختر حسین، پٹیل پاڑہ، کراچی
- محمد معروف انصاری، سکھر
- کاشف شفیق، کراچی
- محمد ندیم لطیف، سیالکوٹ۔
- شاہد محمود، پاک گیٹ، ملتان
- سہراب علی، لانڈھی، کراچی
- اویس عزیز، فیصل آباد
- شفیق محمد، برنس روڈ، کراچی
- محمد اعجاز خان، جام شورو
- امجد علی شاہ، طاہر پیر، خان پور
- محمد نعیم شفیع، بہاولپور
- ناظمہ احمد، امرپورہ، راولپنڈی
- وسیم بن اشرف، بورا روڈ، میاں چنوں
- ہنسہ نقی، واپڈا کالونی، حیدرآباد
- نگینہ یوسف، گلیانہ، کھاریاں
- رضوان احمد، ملیر، کراچی
- افروز اظہر، ناظم آباد، کراچی
- شاہد محمود، فتح جنگ، اٹک
- جے، آئی، ساغر، بلدیہ ٹاؤن، کراچی
- ثاقب مسعود، ہاؤسنگ کالونی، جہلم
- ثنازیہ، گلبرگ، پشاور
- الطاف احمد قریشی، دادو
- نوید الدین، جنگل خیل، کوہاٹ
- افتخار علی، حمزہ، مردان
- بدرالدین بلوچ، بھیلاں
- ریاض احمد سولنگی، کوٹڑی
- غلام نبی، جناح روڈ، سانگھڑ
- طارق احسان، لیاقت آباد، کراچی
- مختیار احمد وٹو، اوکاڑہ
- سلیم جان مروت، بنوں
- سجاد علی فخر، لاہور کینٹ
- اسماء خورشید، نامعلوم
- ارشد الہدیٰ عادل، مقام نامعلوم
- عبدالقادر، پسنی، مکران
- قاسم محمود، راولپنڈی
- اشرف جاوید، حمدپورہ، اوکاڑہ
- سعدیہ رفیق ورک، سیالکوٹ
- مسعود احمد، گلبرگ، کراچی
- ایس اے عظیمی، نیو کراچی
- منصب علی ساجد، ضلع بھکر
- عمران اکرم، سانده خورد، لاہور
- فاروق احمد، جیب بینک لانڈی کوتل
- شوکت اکبر، بھربا روڈ، نوابشاہ
- سید عمران شاہ، مقام نامعلوم
- رفیق زاہد، گوادر، بلوچستان
- عبداللہ ہارون، محمد علی سوسائٹی، کراچی
- عبدالوحد، سعود آباد، کراچی
- ثمینہ نبی برڑو، مکلی، ٹھٹھہ

سالنامہ

خالد امان خان

یہ لو بچو! پڑھو! حاضر تمہارا سالنامہ ہے
تمہاری ہی دعاؤں کا نتیجہ سالنامہ ہے
خوشی تم کو یقیناً سالنامہ دیکھ کر ہوگی
ہمیں بھی ہے مسرت حسبِ وعدہ سالنامہ ہے
یہ دیدہ زیب، دلکش، خوبصورت اور پسندیدہ!
ہمارا بھی تمہارا بھی یہ سب کا سالنامہ ہے
نہ ہوگا عذر تم کو اس کی قیمت میں اضافے کا
تمہیں معلوم ہے اب کے رسالہ سالنامہ ہے
تم اپنے مشورے لکھ کر سپردِ ڈاک تو کر دو
کہو تم کو پسند آیا یہ کیسا سالنامہ ہے
بھرا پورا ہوا خالد یہ اچھا سالنامہ ہے
ہمہ اقسام کے مضمون، قصے اور لطائف سے

اِک نیا کمال
اِک نیا معیار

نئے دَور کی نئی پینسل

Goldfish
DELUXE PENCIL



شاہ سنز لمیٹڈ
ڈی ۸۸ - ایس - آئی - ٹی - ای - کراچی
فون: ۲۹۳۴۵۱، ۲۹۳۴۵۲

Midas Khi

حمیرا لطیف

اس مہینے کا نام کیسے پڑا؟

جولائی

سال کا ساتواں مہینہ

قدیم روم کے مشہور حکمراں جولیس سیزر نے اس مہینے کو اپنا نام دیا۔ جولیس سیزر نے اور بہت سے کام کرنے کے ساتھ کلینڈر کی ترتیب بھی درست کی مہینوں کی اس نئی ترتیب نے اسے ساتویں مہینے کے نام کے بارے میں مشکل سے دوچار کر دیا پرانے کلینڈر میں یہ پانچواں مہینہ تھا اور اسی وجہ سے کوئنٹلس کہلاتا تھا۔ کوئنٹلس کے معنی پانچواں کہنا تو بڑا عجیب ہوگا اس لئے اس نے ساتویں مہینے کو اپنا نام دیدیا۔ اور جولیس سے یہ مہینہ جولائی ہوگیا

منتخب اقوال

زادِ راہ



● ایک قوم کسی دوسری قوم کا مذاق نہیں اڑائے عجب نہیں کہ وہ اُن سے بہتر ہوں۔

(قرآن حکیم)

● خدا کے نزدیک بدترین شخص وہ ہے جو ناحق کسی بات پر زیادہ جھگڑنے والا ہو۔

(حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

● تمہاری گفتگو بتادے گی تمہارے دل میں کیا ہے۔

(حضرت غوث الاعظمؒ)

● آج مسلم نوجوان کو صحیح تعلیم کی ضرورت ہے۔ تعلیم کی اہمیت میں کلام نہیں کیونکہ صحیح اور موثر تعلیم میں کسی قوم کی بنیاد ہوتی ہے۔

(قائداعظمؒ)

● معمولی اخراجات کی اہمیت کو نظرانداز نہ کرو ایک چھوٹا سا سوراخ بڑے جہاز کو ڈبو سکتا ہے۔

(لیاقت علیخاںؒ)

● فتح حاصل کرنا چاہتے ہو تو صداقت سے کام لو طاقت سے نہیں۔

(سقراط)

● اگر تمہاری قسمت اونگھ رہی ہے تو فکر نہ کرو تم اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔

(مولانا ظفر علیخانؒ)

● جھوٹے انسان کو دوہری لعنت سے دوچار ہونا پڑتا ہے لوگ اس کی باتوں پر یقین نہیں کرتے اور وہ لوگوں کی باتوں پر یقین نہیں کرتا۔

(برناڈشا)

● ترش غذا جلد بوڑھا کرتی ہے۔ بدن دبلا کرتی ہے۔ اور پٹھوں کے لئے نقصان دہ ہے۔ شیریں غذا بدن کو گرم کرتی ہے اور نمکین غذا بدن کو خشک اور دبلا کرتی ہے۔

(بوعلی سیناؒ)

● چاپلوس اس لئے آپ کی چاپلوسی کرتا ہے کہ وہ آپ کو بیوقوف سمجھتا ہے۔ لیکن آپ ـــــ اس کے منہ سے اپنی تعریف سن کر پھولے نہیں سماتے۔

(ٹالسٹائی)

گیت

امجد اسد امجد

آیا گرمی کا مہینہ
سر سے لے کر پیروں تک
پسینہ ہی پسینہ
آیا گرمی کا مہینہ
سورج جب جب آنکھ دکھائے
دھرتی ڈر سے پگھلی جائے۔
پنکھے کے نیچے بھی بیٹھے ٹھنڈا سایا۔
ملے کہیں نا۔
آیا گرمی کا مہینہ
گرمی میں جب گھر سے نکلو۔
ٹوپی، چھتری، سر پہ رکھو۔
تھوڑا نمک بھی ڈالو اس میں بچو جب بھی
پانی پینا۔
آیا۔ گرمی کا مہینہ۔

ہم نے دیکھا اک روبوٹ
پہنے تھا وہ اوور کوٹ؛
دھیرے دھیرے چلتا تھا وہ
ٹم ٹم ٹم ٹم جلتا تھا وہ
ناک تھی اس کی آلو جیسی
آنکھیں تھیں جیسے اخروٹ
ہم نے دیکھا اک روبوٹ
اچھا سا اک نام تھا اس کا
چلتے رہنا کام تھا اس کا
فوراً واپس مڑ جاتا ہے۔
کہتے تھے جب اس کو "لوٹ"
ہم نے دیکھا اک روبوٹ
پہنے تھا وہ اوور کوٹ



یہ سایہ دار شجر اور اس میں دُور اندیشی کا ثمر

میعادی بیمہ پالیسی کے ساتھ

خاندان کے لئے ماہانہ آمدنی کا بے مثال منصوبہ

اس خصوصی منصوبے کے تحت بیمہ دار کی وفات کی
صورت میں خاندان کے لئے فوری طور پر حسب ذیل ادائیگیاں کی جاتی ہیں۔

- بیمہ کی پوری رقم
- حادثاتی موت کی صورت میں بیمے کی ڈبل رقم
- تمام جمع شدہ بونس ادا
- پالیسی کی باقی ماندہ میعاد تک باقاعدہ ماہانہ آمدنی

بیمۂ زندگی — آج کا تحفظ، کل کی خوشحالی

تفصیلات کے لئے اسٹیٹ لائف کے نمائندے سے رابطہ قائم کیجئے

۳۰ جون سے پہلے بیمہ پالیسی لیجئے اور انکم ٹیکس بچائیے۔

اسٹیٹ لائف

انشورنس کارپوریشن آف پاکستان

United

PID-1-3-87

سب سے عظیم کہانی



انور سعد

کہانیاں تو آپ نے بہت سُنی ہوں گی. جب سے انسان اس دنیا میں آیا ہے کہانی سن رہا ہے، کہانی سنا رہا ہے. جب وہ جنگلوں میں رہتا تھا تو بھی کہانی سنتا، سناتا تھا اور آج ایٹم اور الیکٹرانک دور میں بھی کہانیاں ختم کیسے ہوں. یہاں تو ہر روز ہزاروں لاکھوں کہانیاں جنم لیتی ہیں. اس زمین پر اس وقت اربوں انسان آباد ہیں اور نہ جانے ایسے ہی کتنے اربوں کھربوں انسان اس دنیا میں آئے اور چلے گئے دنیا کے پہلے انسان آدمؑ تھے. لیکن وہ کب اس زمین پر تشریف لائے یہ تو اللہ کے علاوہ کوئی نہیں بتا سکتا اب آپ خود ہی سوچیں اتنی پرانی دنیا اور اس میں اتنے انسان آنے

اور گئے۔ اور سبھی اپنے پیچھے بیشمار کہانیاں چھوڑ گئے اتنی کہانیوں کو تو یکجا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہاں جب دنیا ختم ہوجائے گی اور قیامت برپا ہوگی اور ہر انسان اللہ کے سامنے حاضر ہوجائے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ہر شخص کو دیکھنے، سننے اور پڑھنے کی اتنی زبردست قوت دے گا کہ ہم ہر کہانی کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہوں گے۔ وہ کہانی بھی جو کسی ایک شخص سے دنیا میں کسی بند کمرے میں یا دریا میں غوطہ لگا کر بنائی ہوگی اور جسے دنیا کے کسی انسان نے نہ دیکھا اور نہ سُنا۔

بچو! ان اربوں کھربوں کہانیوں میں ایک کہانی ایسی بھی ہے، جو سب سے عظیم کہانی ہے اور جسے دنیا کے ایک دور کے انسان نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ایسی کہانی نہ کبھی پہلے بنی تھی اور نہ اب تک بن سکتی ہے اس کہانی کی پوری تفصیل حرف بہ حرف اس دنیا میں موجود ہے اس وقت میں اس کہانی کے چند اور مختصر سے حصّے ہی سنا سکتا ہوں۔ باقی آپ کا کام ہے کہ آپ امّی سے ابّو سے اپنے دوسرے عزیزوں سے، اپنے اساتذہ سے اور سکول کی لائبریری سے تفصیلات معلوم کریں۔

آپ دیکھیں گے کہ جیسے جیسے آپ کہانی کی تفصیل پڑھ رہے ہیں ایک حیرت انگیز تبدیلی آپ کی زندگی میں آرہی ہے۔ پہلے آپ افسردہ اور رنجیدہ تھے اب آپ کے چہرے پر مسکراہٹ تیرتی ہے۔ کبھی آپ کم ہمت تھے۔ اور ہر وقت گھبراہٹ سی طاری رہتی تھی اب آپ اطمینان سے پُر زندگی گزار رہے ہیں کبھی آپ اللہ کی عبادت سے جان چُراتے تھے اب اس کے آگے سجدہ ریز ہو رہے ہیں۔

یہ کہانی دنیا کی سب سے عظیم کہانی اس لئے ہے کہ یہ دنیا کے سب سے عظیم شخص سے وابستہ ہے۔ اب چونکہ اس سے عظیم شخص اس دنیا میں پھر کبھی نہیں آئے گا۔ اس لئے اس سے اچھی کہانی بھی نہیں بن سکتی اب تک آپ میں سے بے شمار عقلمند بچے اس شخصیت کا نام جان چکے ہوں گے جی ہاں! یہ کہانی محمدؐ کی کہانی ہے کہتے ہیں نبی تو بچپن سے ہی نبی ہوتا ہے حضورؐ بھی ایسے ہی تھے۔ آپ کے ہمجولی کھیل تماشوں میں لگے رہتے لیکن آپؐ کسی سایہ دار درخت کے نیچے گھٹنوں بیٹھے دنیا کے مسائل پر غور کر رہے ہوتے۔ اپنے، پرائے سبھی ان کی غیر معمولی ذہانت سے متاثر ہوجاتے آپ بڑوں کا احترام کرتے ہر کسی کے کام آتے، دوسروں کا غم آپ سے دیکھا نہ جاتا نرم انداز میں گفتگو کرتے لیکن مصائب اور مشکلات برداشت کرنے میں سخت جان تھے آپ ملنسار تھے۔ سب سے مسکرا کر ملتے۔ گندی اور غلیظ باتیں آپ کی زبان سے کبھی نہ نکلیں آپ گانے بجانے

کی محفلوں سے دور رہتے۔ جب بڑے ہوئے تو تجارت کا پیشہ اختیار کیا قیس بن السائبؓ جو آپ کے شریک کاروبار رہے تھے۔ بیان کرتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے بیشتر جمع شریک نہ ملا اگر آپ کا سامان لے کر (دساور) جاتے تو واپسی پر آپ ہمارا استقبال کرتے اور خیریت پوچھ کر لوٹ جاتے (لیکن سال سے متعلق کوئی بات نہ کرتے) اور بعد میں حساب کتاب کے وقت محبت و تکرار نہ کرتے۔ دوسرے لوگ سب سے پہلے اپنے مال کی بات کیا کرتے تھے لیکن اگر آپؐ ہمارا سامان تجارت لے کر باہر جاتے تو واپسی پر جب تک کوڑی کوڑی کا حساب چکا نہ دیتے تو نہ جاتے اس لئے آپؐ ہم میں الامین (دیانت دار اور راست باز) کے لقب سے معروف تھے۔

حضورؐ دنیا کے مسائل سے پریشان تھے۔ نیکی، شرافت کا چلن ختم ہو چکا تھا۔ ظلم، وحشیت اور جاہلیت کا دور دورہ تھا۔ انسان، انسان کے خون کا پیاسا تھا۔ کسی کے گھر میں اگر لڑکی پیدا ہوتی تو اس کے والدین اسے زندہ ہی زمین میں دفن کر دیتے۔ معصوم بچوں کے ساتھ والدین کا رویہ ظالمانہ تھا۔ بچے اپنے بڑوں کے نافرمان تھے۔ حضورؐ جب ان حالات سے گھبرا جاتے تو غار حرا میں جا کر خاموشی کے ماحول میں غور و فکر کرتے۔

سوچتے کیا تدبیر کروں کہ دنیا ان مسائل سے آزاد ہو جائے انسان پر سے انسانوں کی غلامی کی زنجیریں کیسے توڑوں؟

اللہ کے فرشتے جبریلؑ اللہ کا پیغام لے کر غار حرا میں آ گئے۔ وحی نازل ہوئی آپ اللہ کے نبیؐ اور رسولؐ بن گئے اللہ کے چہیتے رسولؐ سب نبیوں سے افضل آپ کو اللہ تعالیٰ نے کہا کہ آپ رحمت اللعالمین ہیں یعنی پوری دنیا کے لئے رحمت ہیں۔

ایک بوڑھی عورت بازار سے سامان خرید کر گھر جانے لگی سامان زیادہ ہو گیا۔ اس سے اٹھتا ہی نہ تھا۔ تھوڑی دور چلی ہانپنے لگی۔ اُدھر سے ایک نوجوان کا گذر ہوا انہوں نے سامان اٹھا لیا اور بوڑھی عورت کو آگے آگے چلنے کو کہا وہ چلتی رہی اور راستے میں بتاتی رہی کہ بیٹا! اس شہر میں ایک ایسا شخص ہے جو اپنے آپ کو اللہ کا نبیؐ کہتا ہے۔ لیکن میں تو کہتی ہوں کہ وہ جادوگر ہے جادوگر لوگوں کو اپنے باپ دادا کے دین سے بہکا رہا ہے۔ تم بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو اس سے دور ہی رہنا۔ کہیں وہ تمہیں نہ بہکا دے۔ اتنے میں بوڑھی عورت کا گھر آ گیا۔ نوجوان نے سر سے سامان اُتار کر نیچے رکھا تو عورت اسے کچھ رقم نکال کر دینے لگی۔ نوجوان نے کہا کہ اماں۔ میں نے مزدوری نہیں کی

میں نے تو اپنا فرض ادا کیا ہے۔ بوڑھی عورت بہت حیران ہوئی کہ کیسا انسان ہے۔ ایسا شخص تو میں نے آج تک نہیں دیکھا پوچھا بیٹے تمہارا نام کیا ہے نوجوان نے کہا کہ میں ہی محمد رسول اللہ ہوں بوڑھی حیرت سے دیکھتی رہی اور اس نے اسی وقت اسلام قبول کر لیا۔

ایک اور بوڑھی عورت حضورؐ سے اسی لئے نفرت کرتی تھی کہ وہ ان کے بتوں اور دیوتاؤں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ حضورؐ کا اس کے گھر کی طرف سے روزانہ گذر ہوتا بوڑھی عورت نفرت کا اظہار اس طرح کرتی کہ اپنے گھر کا سارا کوڑا کرکٹ آپؐ پر ڈال دیتی۔ حضورؐ ایک لفظ بھی نہ کہتے۔ خاموشی سے گذر جاتے وہ روز آپ کے انتظار میں رہتی کہ جیسے ہی آپؐ آئیں اور وہ کوڑا ڈالے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ وہ کوڑا پھینکنے نہ آئی حضورؐ کو کچھ تشویش ہوئی اسی طرح دو چار دن گذر گئے اور بوڑھی عورت نہ آئی۔ حضورؐ نے لوگوں سے معلوم کیا کہ وہ بوڑھی عورت کہاں ہے معلوم ہوا کہ وہ کئی دنوں سے شدید بیمار ہے حضورؐ فوراً اس کے گھر گئے۔ اجازت لی اور اندر داخل ہوئے۔ دیکھا تو واقعی بیمار تھی۔ حضورؐ نے اپنی دشمن کی عیادت کی۔ اس کے صحت کے لئے دعا کی۔

یہ تھا حضورؐ کا کردار۔ آپ کو انسانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ نفرت اگر تھی تو شرک سے، جاہلیت سے۔ انسان سے نہیں بلکہ اس کے گندے اعمال سے مکہ کے کفار نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی مسلمانوں کو جلتی ریت پر لٹا کر پیٹا گیا۔ کئی مسلمان اذیت کی تاب نہ لا کر شہید بھی ہو گئے۔ لیکن حضورؐ نے کسی کے لئے بد دعا نہ کی۔

حضرت عمرؓ اسلام لانے سے قبل حضورؐ کے شدید دشمن تھے اور سب سے بڑے دشمن ابوجہل تھے۔ آپ نے دونوں کے لئے دعائیں کی تھیں یا اللہ تعالیٰ عمرؓ بن خطاب یا ابوجہل کو اسلام لانے کی توفیق دے۔ حضورؐ کی دعا قبول ہوئی اور عمرؓ نے اسلام قبول کیا۔

رسولؐ کی زندگی کے تو ایسے بیشمار واقعات ہیں۔ ان کے انتقال کو چودہ سو سال سے زیادہ ہو گئے۔ لیکن آپؐ کا ذکر جاری ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود کہا تھا کہ میں آپ کے ذکر کو بلند کر دوں گا۔ ہزاروں مصنفین نے ان کی زندگی پر کروڑوں اربوں الفاظ لکھ دیے لیکن پھر بھی کہانی کا حق ادا نہ ہوا اگر ان کی زندگی کی روشنی سے چند شعاعیں ہی حاصل کرنے میں آپ کامیاب ہو جائیں۔ تو دنیا سے لیکر آخرت تک آپ کی زندگی روشن ہو جائے کامیابیوں کے روشن ستارے آپ کے قدموں پر ڈھیر ہو جائیں۔

سیّد کاشان جعفری

اچھی کتابیں اچھے رسائل

ساتھیو ، آپ میں سے بہت سوں نے "میگیل دے سیرواتیسے" کا نام یقیناً سنا ہوگا سیرو واتیسے اسپین کے معروف کہانی نگار، شاعر اور مصنف ہی نہیں ایک اچھے ڈرامہ نویس بھی تھے۔ بچّوں کے لئے چھوٹی چھوٹی دلچسپ کہانیاں لکھنے والوں میں انہیں پہلا کہانی نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ وہ ۱۵۴۷ء میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۱۶۱۶ء میں انہتر سال کی عمر میں ہوا۔ یہ ان کی ہی ایک کہانی کا ترجمہ ہے۔



بہت قدیم زمانے کی بات ہے۔ اسپین کے لامانچا نامی گاؤں میں ایک لڑکا رہا کرتا تھا، اُس کا نام "کیوجانا" تھا۔ کیوجانا گاؤں میں تنہا رہتا۔ اس کا اپنا ذاتی مکان تھا اور تھوڑی سی زرعی زمین۔ جسے اُس نے بٹائی پر دیا ہوا تھا۔ اُسے اپنے حصّے کی جو بھی پیداوار ملتی اُسی سے اپنی گزر بسر کرتا۔ خود اُسے سوائے قصّے کہانیوں کی کتابیں پڑھنے کے اور کوئی کام نہ تھا۔ قصّے کہانیوں میں بھی اُسے جنّ بھوتوں، جادوگروں اور پریوں کی ہی کہانیاں پسند تھیں۔ ان کہانیوں کو پڑھ پڑھ کر وہ خود کو بھی کسی کہانی کے بہادر ہیرو کی طرح سمجھنے لگا تھا۔ اُس کے دماغ میں بیٹھے بٹھائے یہ بات سما گئی کہ وہ ساری دنیا کو تنہا فتح کر سکتا ہے۔

آخر اُس نے ایک دن فیصلہ کر ہی لیا کہ وہ کب تک یوں ہی اپنی عمر ضائع کرتا رہے گا۔ مرنے سے قبل دنیا کو فتح کرنے کا کام ہی انجام دیتا جائے۔ تاکہ آئندہ زمانے کی آنے والی نسلیں اس کارنامے کی کہانی پڑھ کر اس کے متعلق سوچیں اُس پر فخر کریں۔ یوں وہ رہتی دنیا تک امر ہو جائے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنے جھلنگا، ٹوٹے پھوٹے پلنگ پر سے اُٹھا، ایک پرانے ٹنکے میں رکھی ہوئی اپنے مرحوم باپ کی بہت ہی پرانی اور بوسیدہ پوشاک نکالی اور اُسے جھاڑ کر پہن لیا۔ باہر دروازے پر اس کا مریل گھوڑا مکھیوں کی یلغار سے پریشان دم ہلا ہلا کر کئی دن کی خشک گھاس سے اپنا پیٹ بھرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ کیوجانا نے گھوڑے کو تھان سے کھولا اور اس کی پیٹھ پر زین کس کر دنیا فتح کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ روانگی سے پہلے اس نے گاؤں بھر میں گھوم پھر کر اپنا نام کیوجانا کے بجائے "ڈان کوئیگ جوٹ" رکھنے کا بھی اعلان کیا۔

گاؤں سے باہر نکلا تو ایک اور لڑکا "سانچو پانچا" بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ ڈان نے بڑے فخر سے اتراتے ہوئے اس سے کہا کہ جب میں نیا ملک فتح کروں گا تو اُس کا گورنر سانچو کو ہی بناؤں گا۔

چلتے چلتے، انہیں شام ہو گئی، وہ اپنے گاؤں سے کافی دور نکل آئے ایک جگہ انہوں نے بہت سی ہوائی چکیاں دیکھیں۔ ڈان سمجھا کہ یہ ہوائی چکیاں دیو، یا بھوت ہیں۔ اُس نے ان پر اپنی زنگ خوردہ پرانی تلوار سے حملہ کیا تو ہوائی چکیوں کے پنکھوں سے ٹکرا کر خود ہی بُری طرح زخمی ہو گیا۔ پھر وہ دونوں ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں ہریالی اور شادابی کا راج تھا۔ قریب ہی ایک ٹھنڈے میٹھے پانی کی ندی بہہ رہی تھی۔ وہ دونوں اپنی سواریوں سے اتر کر نرم مخملی گھاس پر بیٹھ گئے۔ اپنے، اپنے گھوڑے اور گدھے کو انہوں نے میدان میں گھاس چرنے کے لئے چھوڑ دیا۔ اور خود بھی اپنے، اپنے تھیلوں سے کھانا نکال کر کھانے لگے۔

جس جگہ ڈان کا گھوڑا اور سانچو کا گدھا چر رہا تھا۔ وہیں خچروں کا ایک غول بھی چرنے آگیا۔ دراصل وہ میدان اُن خچروں کی پرانی چراگاہ تھی۔ خچروں نے جب اپنے درمیان ایک اجنبی گھوڑے اور گدھے کو دیکھا تو بہت

حیران ہوتے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُن کی یہ حیرانگی ناراضگی اور احتجاج میں تبدیل ہوگئی۔ وہ سب مل کر اُن دونوں اجنبی جانوروں کو اپنے گھیرے میں لینے کی کوشش کرنے لگے۔ خچروں کے مالک نے غول کے اندر یہ افراتفری دیکھی تو وہ بھی گدھے اور گھوڑے کو میدان سے نکالنے کے لئے اپنا موٹا سا ڈنڈا لے کر آگے بڑھا۔

اور اسے ڈرا کر میدان سے نکالنے کی کوشش کرنے لگا۔ ڈان نے جو کھانا کھانے کے بعد ایک سائے دار درخت کے نیچے لیٹا آرام کر رہا تھا یہ دیکھ کر غصے میں آگیا اور فوراً اپنی قدیم، یادگار، زنگ آلود تلوار لے کر اُس شخص کے مقابلے پر پہنچا جو گھوڑے اور گدھے کو چراگاہ سے باہر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، پہلے تو وہ شخص اپنی چراگاہ میں دو نئے جانوروں کے گھس آنے پر ہی ناراض تھا۔ ڈان کو مقابلے پر دیکھا تو اُس کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ پہلے تو اُسے ڈان کی تلوار اور اُس کے عجیب و غریب حلیئے پر ہنسی آئی مگر پھر سنجیدہ ہو کر مقابلے پر ڈٹ گیا۔ ڈان کو تلوار چلانا تو کیا لاٹھی کے وار سے بچنا بھی نہیں آتا تھا۔ کہانیاں پڑھ پڑھ کر اگر ہر کوئی تلوار باز بن جاتا تو پھر بات ہی کیا تھی۔ تلوار بازی کے لئے تو تربیت حاصل کرنی پڑتی ہے۔ ڈان نے تو کبھی اس سے پہلے تلوار بازی کا کوئی عملی مظاہرہ تک نہ دیکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چرواہے کے دو چار نپے تلے لاٹھی کے ہاتھوں سے وہ ڈھیر ہو گیا۔ اور بیہوش ہو کر نیچے گر پڑا۔۔۔

چرواہے کے جانے کے کافی دیر بعد ڈان کو ہوش آیا۔ اور بڑی مشکل سے کراہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب میدان میں خچر ایک بھی باقی نہیں رہا تھا۔ اس کا ساتھی سانچو ایک درخت پر ابھی خوف سے چھپا اپنی جان کی خیر ـــــ منا رہا تھا۔ گھوڑا اور گدھا قریب ہی بڑی بے فکری اور آزادی سے چر رہے تھے ڈان لنگڑاتا ہوا درخت کے نیچے آیا اور کراہتے ہوئے بولا۔ ارے تم تو ابھی تک خوف سے کانپ رہے ہو، اس قسم کے مقابلوں میں ایسا تو ہوتا ہی ہے۔ آؤ نیچے اترو اب آگے چلیں۔

سانچو بڑی مشکل سے نیچے اترا، ڈان نے اپنے تھیلے میں سے دوا نکال کر زخموں پر لگائی اور اِدھر اُدھر سے خشک لکڑیاں جلا کر تھوڑی سنکائی بھی کی۔ اس سے فارغ ہو کر وہ دونوں اپنی اپنی سواری یعنی گھوڑے اور گدھے پر سوار ہو کر سفر پر آگے بڑھنے لگے سفر کے دوران سارے راستے ڈان سانچو سے باتیں کرتا رہا۔ وہ اُسے سمجھا رہا تھا کہ دیکھو، میں کس قدر بہادر اور مہم جو شخص ہوں، اتنے ساروں کا تنہا مقابلہ کر تا رہا پھر بھی پیٹھ نہیں دکھائی۔ اگر میں بیہوش نہ ہو جاتا تو ایک ایک کو تلوار کی زد پر رکھ کر وہ مزا چکھاتا کہ ساری زندگی ہی یاد کرتے بلکہ وہ سب بھاگے اسی خوف سے ہیں کہ میں ہوش میں آنے کے بعد کہیں بدلہ نہ لے لوں .. حالانکہ چوٹوں کے درد سے ڈان ٹھیک طرح گھوڑے کی پشت پر بیٹھ بھی نہیں پا رہا تھا۔ اسی طرح سفر کرتے کرتے کافی رات ہو گئی۔ جب اندھیرا بہت بڑھ گیا تو انہوں

نے سرائے میں ٹھہر کر رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جلدی ہی وہ ایک سرائے میں جا پہنچے، ڈان نے سرائے کے مالک سے اپنا تعارف شہزادے کی حیثیت اور سانچو کا ایک گورنر کی حیثیت سے کرایا۔

سرائے کا مالک اس تعارف سے بہت متاثر ہوا، اُس نے اپنی سرائے کے بہترین آرامدہ کمرے اور بستر اُن کے حوالے کئے، اور خاطر تواضع میں کوئی کمی اٹھا نہ رکھی۔ اس کا خیال تھا کہ جب شہزادہ اور گورنر یہاں سے رخصت ہوں گے تو اسے قیمتی انعامات سے بھی نوازیں گے۔ یوں وہ ان سے کافی کمائے گا۔ لیکن ہوا اُس کے قطعی برعکس.... روانگی کے وقت ڈان مسکراتے ہوئے سرائے کے مالک سے بولا۔ میرا خیال ہے کہ تم مجھ سے اپنی خدمت، مہمان نوازی اور سرائے میں ٹھہرنے کا معاوضہ تو لوگے نہیں۔ میں ایک مہم پر نکلا ہوں، جلد ہی میں ساری دنیا کو فتح کر لوں گا۔ یہ کہہ کر جیسے ہی ڈان نے چلنے کے لئے قدم بڑھایا... سرائے کا مالک اس کے راستے کی دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔ جناب شہزادے صاحب مجھے آپ کی مہم سے کیا لینا۔ آپ دنیا فتح کریں، یا شکست کھائیں۔ مجھے گورنری یا وائسرائے بننے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ آپ بس یہاں تین یوم قیام کرنے خوراک و خدمت کا معاوضہ ادا کریں ہم غریب لوگ ہیں۔ ڈان نے بغیر جواب دیئے بڑی اکڑفوں کے ساتھ اپنا قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ سرائے کے مالک نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور پھر جو اُس کی پٹائی شروع کی تو اللہ دے، بندہ لے والا منظر تھا۔ اُس کے ساتھ سرائے کے دوسرے ملازم بھی ڈان کی پٹائی میں شریک ہو گئے۔ اِدھر سانچو نے یہ حال دیکھا تو اُس نے چپکے سے ہی کھسک جانے میں عافیت سمجھی اور وہاں سے کسی نہ کسی طرح نکل بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

سرائے کا مالک اور اُس کے ملازمین جب ڈان کی پٹائی کرتے کرتے تھکن سے بے حال ہو گئے۔ تب کہیں جا کر اُسے اس مصیبت سے رہائی ملی۔ کئی آدمیوں نے مل کر پٹتے، پٹتے بیہوش ہو جانے والے ڈان کو ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھایا اور سرائے سے کافی دور جا کر اُسے چھوڑ آئے۔ سانچو جو اُس کا گھوڑا لے کر گاؤں کے باہر آن چھپا تھا اُس کے پاس پہنچا اور پانی کے چھینٹے چہرے پر دے کر دامن کی ہوا سے پنکھا کر کے اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ جیسے ہی ڈان ہوش میں آیا سانچو زار و قطار رو کر کہنے لگا پیارے ڈان.... معاف کرنا۔ میں تو تمہاری مدد کرنا چاہتا تھا۔ مگر جیسے ہی دیوار پر چڑھا کسی جن نے مجھے پیچھے سے پکڑ کر کھینچ لیا اور میں گر پڑا، مجھے بھی بڑی سخت چوٹ آئی ہیں۔ کہتے کہتے وہ اور بھی شدت کے ساتھ رونے لگا۔ ڈان، ہمت کر کے اُٹھا وہ سانچو کے رونے کو دیکھ کر اپنی پٹائی کی تکلیف بھول گیا۔ اُسے تسلی دیتے ہوئے اُٹھا۔ پھر اپنے تھیلے میں سے دوا نکال کر خود لگائی اور سانچو کی چوٹوں پر بھی۔ پھر دونوں کچھ دیر آرام کر کے اپنی نئی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

تھوڑی دور چلنے کے بعد ڈان کو دور فاصلے پر ایک شخص گدھے پر سوار جاتا نظر آیا وہ شخص بہت معمولی

سالباس پہنے ہوا تھا۔ اور دھوپ سے بچنے کے لئے اُس نے تانبے کا ایک بڑا کٹورا اپنے سر پر الٹا کر کے رکھا ہوا تھا۔ ڈان نے محسوس کر لیا کہ وہ شخص غریب ہی نہیں کمزور بھی ہے۔ فوراً سانچو کو مخاطب کر کے بولا، دیکھو میں اُس شخص سے مقابلہ کر کے ابھی اُسے زیر کرتا ہوں۔ پھر تم بھی میری تلوار بازی کے قائل ہو جاؤ گے۔ یہ کہہ کر اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور آناً فاناً اُس اجنبی شخص سے آگے جا کر اُس کا راستہ روک لیا۔ دونوں میں پہلے تکرار ہوئی اور پھر تلواریں چلنے لگیں۔ ڈان نے جلد ہی اُس کمزور شخص کو وہاں سے جان بچا کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بھاگتے میں اُس شخص کا سر پہ اوڑھا ہوا کٹورا بھی گر پڑا۔ جسے اُس نے رک کر اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ ڈان نے خود وہ کٹورا اٹھا کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ دیکھا .... میں نے آخر اُسے میدان چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر دیا نا... میرے سامنے تو کوئی ٹک ہی نہیں سکتا.. میں ایک بے مثال جنگجو اور بہادر لڑکا ہوں۔ سانچو اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا... اب وہ پھر آگے بڑھنے لگے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ نرم چمکیلی دھوپ میں سفر کرنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ کافی دور نکل گئے۔ دوپہر ڈھل رہی تھی۔ انہوں نے سوچا اب کسی جگہ رک کر کھانا کھانا اور آرام کرنا چاہیئے۔ اسی خیال پر عمل کرنے کے لئے وہ جگہ کا انتخاب کرنے کے لئے اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔ اچانک ڈان کی نظر اپنے عقب میں چند سواروں پر پڑی۔ جو نہایت تیزی سے گھوڑے دوڑاتے اُسی کی طرف آ رہے تھے اس سے پہلے کہ وہ آنے والوں کو پہچان سکتے یا ان کی آمد کا سبب جان سکیں سوار دیکھتے ہی دیکھتے اس کے قریب پہنچ گئے اور انہوں نے دونوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ اب وہ سواروں کو پہچان گئے یہ اُسی کے گاؤں کے لوگ تھے اور گاؤں سے ان دونوں کی تلاش میں نکلے تھے۔ گاؤں کے پرائمری اسکول کا ہیڈ ماسٹر اُن سواروں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ اُس نے آگے بڑھ کر ڈان سے کہا کہ وہ یہیں سے اپنے گاؤں واپس لوٹ چلے، سارا گاؤں اس کی اور سانچو کی گمشدگی سے بے حد پریشان ہے۔ سانچو نے جب انہیں ڈان کے ارادوں سے مطلع کیا تو ہیڈ ماسٹر سوچ کر بولا۔ اس میں ڈان کی عقل و شعور کا اتنا دخل نہیں ہے جتنا اُن جن، بھوتوں، جادوگروں کی کہانیوں کی کتابوں کا ہے۔ اس کا صرف اور صرف واحد علاج یہی ہے کہ نہ صرف ڈان کے گھر میں موجود ان تمام کہانی کی کتابوں کو جلا کر خاک کر دیا جائے بلکہ گاؤں اور جہاں بھی ایسی کتابیں ملیں انہیں فوراً جلا دیا جائے۔ تاکہ انہیں پڑھ کر پھر کوئی لڑکا عملی دنیا سے فرار اختیار نہ کرے۔ پھر وہ اُن دونوں کو سمجھا بجھا کر گاؤں واپس لے آیا۔ اُس نے گاؤں لوٹتے ہی ڈان سے ساری کتابیں لے کر انہیں چولہے میں جلنے کے لئے ڈال دیا۔ اس کے بعد گاؤں بھر میں منادی کرا دی کہ جس جس کے پاس ایسی کتابیں موجود ہوں انہیں جلا کر تلف کر دیں۔ پھر اُس نے ڈان کو ایسی کتابیں اور بچوں کے رسائل پڑھنے کو دیئے جن کے مطالعے کے بعد وہ ایک عملی انسان بن گیا۔ اب وہ اپنی زمین پر خود بھی کام کرنے لگا تھا۔

قالین کی صفائی میں سب سے اعلیٰ





ٹپ ٹاپ

ڈرائی کلینرز

فون :- ۴۱۴۴۶۴
۴۳۰۱۴۳

علامہ اقبال روڈ

پی ای سی ایچ ایس





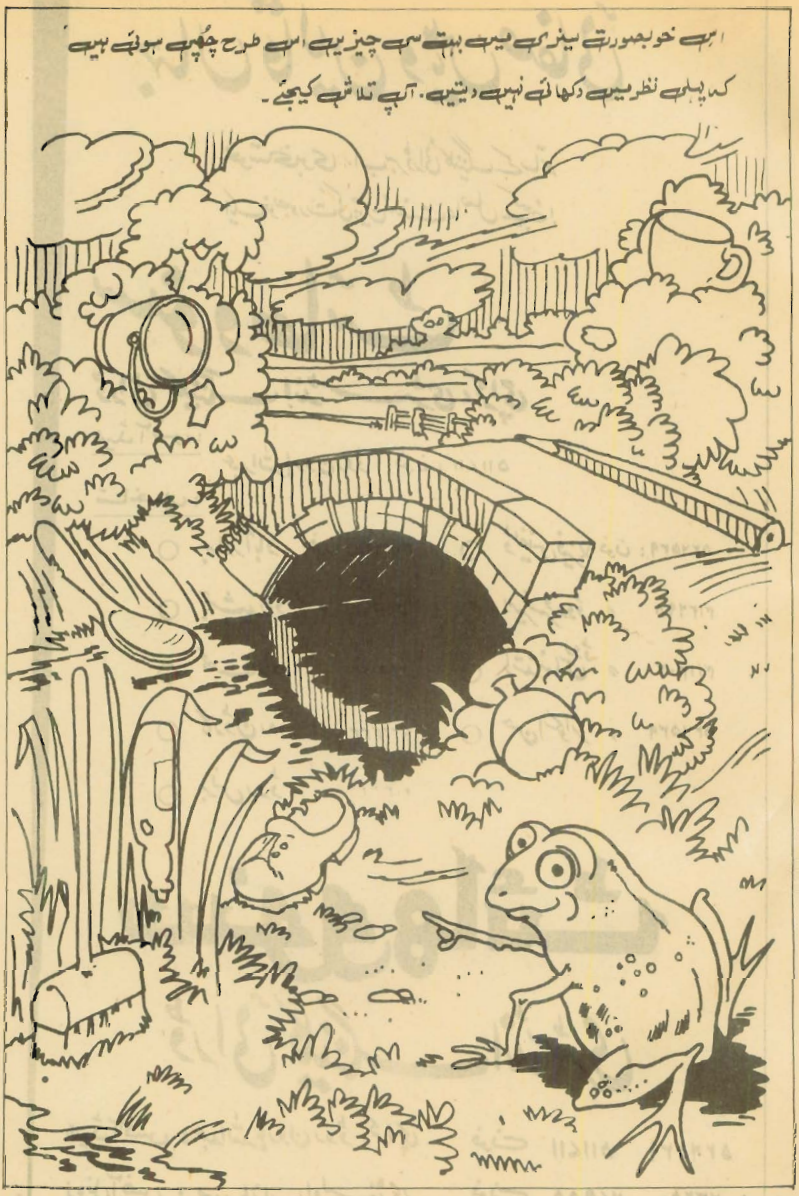
حسن اپارٹمنٹس
۴۴۰۰۴۰

ڈیفنس سوسائٹی
۵۴۲۱۶۳

کلفٹن
۵۳۰۳۶۹

ناظم آباد
۶۱۳۸۱۶

اس خوبصورت سین میں بہت سی چیزیں اس طرح چھپی ہوئی ہیں
کہ پہلی نظر میں دکھائی نہیں دیتیں۔ آپ تلاش کیجئے۔



جہاں قالین وہیں صفائی

خوشخبری :۔ اب ہر ڈرائی کلیننگ کے ساتھ
ایک خوبصورت کی چین "مفت حاصل کیجئے!

سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری، کراچی

ہیڈ آفس :
عبداللہ ہارون روڈ فون : ۵۱۱۷۱۱

شاخیں :

- بہادر آباد فون : ۴۱۳۶۹۵
- ڈیفنس فیز ۲ فون : ۵۲۶۵۳۹
- جمشید روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- امیر خسرو روڈ " ۴۱۳۶۹۵
- کھارادر " ۲۲۵۸۰۳
- راشد منہاس روڈ " ۴۱۱۳۰۲
- گارڈن روڈ " ۷۲۲۲۳۳
- حسن اسکوائر " ۵۲۶۵۳۹
- برنس روڈ " ۲۰۲۲۲۶

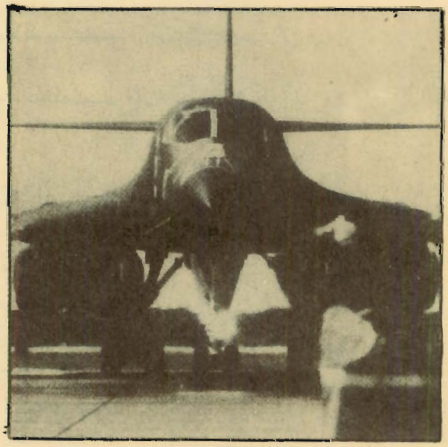
سنو وھائٹ

ڈرائی کلیننگ انڈسٹری

ہیڈ آفس : عبداللہ ہارون روڈ ۔ کراچی فون ۵۱۱۷۱۱ ۵۲۶۵۳۹
زونل آفس : صدر بازار ۔ راولپنڈی فون ۶۷۹۸۸ ۶۳۲۵۰

شازمین

بی ون ۔ بمبار طیّارہ



جنگ میں فضائیہ کی اہمیت کے پیش نظر طیاروں کی رفتار، بلندی تک پرواز کی صلاحیت، زیادہ سے زیادہ اسلحہ لے جانے کی گنجائش کے علاوہ بالکل ٹھیک ٹھیک نشانہ لگانے اور دشمن سے فضا میں معرکے کے وقت بہترین داؤ پیچ کے قابل بنانے کی کوششیں مسلسل جاری ہیں ابھی تک تو الیف ۱۶ کی تیز رفتاری اور حملے کی صلاحیت قابل رشک تھی لیکن امریکہ نے ایک اور طیارہ تیار کر لیا ہے جو ۱۹۹۰ء تک عام ہو جائے گا۔ اس نئے طیارے کا نام بی ۔ ون بی (B-1B) ہے۔

پندرہ سال تک مختلف تجرباتی مراحل سے گذرنے کے بعد امریکی کانگریس نے اس طیارے

کی بڑے پیمانے پر تیاری کی منظوری دے دی ہے

بی۔ون بی ایک سپرسانک بین البراعظمی طیارہ ہے۔یعنی اِس طیارے کی خوبی یہ ہے کہ یہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم میں جا کر حملہ کر سکتا ہے۔نہایت تیز رفتار طیارہ ہے۔

۱۹۹۰ء تک ایسے سو طیارے تیار کر لئے جائیں گے۔دراصل بی قسم کے طیارے بمبار طیارے ہوتے ہیں اس طرح کے طیاروں میں بی ۵۲ بہت مشہور رہا ہے۔

بی ون بی طیارے میں کیا خوبی ہے اِس چارٹ سے ملاحظہ کیجئے۔

بی ون بی

کام ——— نہایت جدید ترین بمبار

عملہ ——— چار افراد (پائلٹ، کو پائلٹ، حملہ کرنے والا شخص اور دفاع کرنے والا شخص)

کھلے پروں کی طرف چوڑائی ——— ۱۳۵ فٹ

بند پروں کے بعد چوڑائی ——— ۷۸ فٹ

کل لمبائی ——— ۱۴۷ فٹ

بلندی ——— ۳۴ فٹ

وزن ——— زیادہ سے وزن لے کر اڑنے کی صلاحیت: ۴ لاکھ ۷۷ ہزار پونڈ

زیادہ سے زیادہ مزید وزن ایک لاکھ ۲۵ ہزار پونڈ۔

اسلحے کی گنجائش ——— ایٹمی اور عام بم شارٹ رینج اٹیک میزائلز اور کروز میزائیل اور مزید دوسرے اسلحے۔

انجن ——— ۴ راجن ۳۰،۷۸۰ پونڈ کے جنرل الیکٹرک کے تیار کردہ۔

رفتار ——— سپرسانک آواز سے تیز رفتار۔

دائرہ کار ——— بین البراعظمی۔دوبارہ ایندھن لیے بغیر یہ ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک جا سکتا ہے۔






The Perfect Combination

AHMED

Taste of the tastiest tomatoes
—Ahmed Tomato Ketchup.



یہ ہوئی نا بات

امّی جان ہمیں ہمیشہ ننگے پاؤں چلنے سے منع کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ اگر تم ننگے پاؤں چلوگے تو پاؤں میں کوئی کانٹا یا شیشہ لگ جائے گا اگر ہم امی جان کا کہنا نہیں مانتے تو اکثر ایسا ہوتا کہ ہمارا پاؤں شیشے کے ٹکڑے پر پڑا اور تلوؤں سے خون بہنا شروع ہو گیا لیکن جناب جزیرہ ٹرینیڈاڈ کے رہنے والے ڈریڈ ول پیری ہرنانڈیز کا کہنا ہے کہ وہ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے ٹکڑوں پر پاؤں کے بل کود سکتے ہیں اور ان کے پاؤں کو ذرا بھی نقصان نہیں پہنچتا ڈریڈوں صاحب اپنے اس دعوے کو سچ ثابت کرنے کیلئے ٹوٹے ہوئے شیشوں پر کودے اور دیکھ لیجئے ذرا بھی زخمی نہیں ہوئے



احمد ندیم قاسمی

جلیبیاں

ہم گورنمنٹ سکول کیمبل پور میں جماعت پنجم کے طالب علم تھے ایک دن گھر سے فیس اور فنڈ کے چار روپے لے کر سکول پہنچے تو پتہ چلا کہ آج فیس لینے والے ماسٹر غلام محمد چھٹی پر ہیں اور فیس کل لی جائے گی۔ دن بھر تو یہ چار روپے ہماری جیب میں چپ چاپ پڑے رہے مگر جب ہم چھٹی



کے بعد سکول سے نکلے تو یہ روپے بولنے لگے ٹھیک ہے روپے بولتے نہیں ہیں۔ بجتے ہیں یا کھنکتے ہیں مگر بھئی اس روز تو وہ بولے۔

ایک روپیہ کہنے لگا "سوچتے کیا ہو؟ سامنے کی دکان پر کڑھاؤ میں سے جو تازہ تازہ جلیبیاں نکل رہی ہیں تو یونہی تو نہیں نکل رہی ہیں۔ جلیبی کھانے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ کھاتے ہیں جن کی جیب میں روپے ہوتے ہیں اور روپے یونہی تو نہیں ہوتے۔ روپیہ تو خرچ کرنے کی چیز ہے اور اسے وہی لوگ خرچ کرتے ہیں۔ جنہیں جلیبیاں اچھی لگتی ہیں۔"

ہم نے کہا: "دیکھو بھئی چار روپو۔ ہم بڑے اچھے لڑکے ہیں۔ ہمیں گمراہ نہ کرو ورنہ ٹھیک نہیں ہو گا۔ گھر میں اتنا کچھ کھانے کو مل جاتا ہے کہ بازار کی چیزوں کی طرف ہم دیکھنا تک گناہ سمجھتے ہیں پھر تم ہماری فیس اور فنڈ کے روپے ہو۔ آج ہم تمہیں خرچ کر بیٹھیں گے تو کل سکول میں ماسٹر غلام محمد اور اس کے بعد قیامت میں اللہ میاں کو کیا منہ دکھائیں گے تم شاید نہیں جانتے کہ ماسٹر غلام محمد خفا ہو کر کسی کو بنچ پر کھڑا کرتے ہیں تو چھٹی کی گھنٹی تک اسے بٹھانا بھول جاتے ہیں بہتر یہ ہے کہ تم ہمارے کان نہ کھاؤ اور ہمیں سیدھا گھر جانے دو۔"

روپوں کو ہماری یہ بات اتنی بری لگی کہ سب ایک ساتھ بولنے لگے ایک دم اتنا شور مچا کہ بازار میں سے گزرنے والے لوگ، ہماری طرف اور ہماری جیب کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے ان دنوں کا روپیہ کمبخت بجتا بھی بہت زیادہ تھا آخر گھبرا کر ہم نے چاروں روپوں کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا تو وہ چپ ہو گئے۔

چند قدم چلنے کے بعد ہم نے اپنی انگلیوں کو ڈھیلا کیا تو سب سے پرانا روپیہ بولا: "ہم تو تمہارے بھلے کی بات کر رہے ہیں مگر تم ہو کہ ہمارا ٹینٹوا دبائے بیٹھے ہو۔ سچ سچ بتاؤ۔ کیا تازہ تازہ گرم جلیبیاں کھانے کو تمہارا اپنا جی نہیں چاہ رہا ہے؟

پھر اگر آج تم ہمیں خرچ کر بیٹھو گے تو کل کیا تمہیں وظیفے کی رقم نہیں ملے گی؟ فیس کے روپوں کی مٹھائی کھا لو۔ وظیفے کے روپوں کی فیس ادا کر دینا۔ قصہ ختم پیسہ ہضم۔"

ہم نے کہا۔ تم جو بات کہہ رہے ہو وہ ٹھیک بات تو نہیں ہے مگر کچھ ایسی غلط بات بھی نہیں ہے ایک بات مانو۔ تم اپنی بک بک بند کرو اور ہمیں ذرا دیر تک سوچنے دو۔ ہم کوئی ایسے ویسے لڑکے نہیں ہیں۔

پرانا روپیہ بولا: ٹھیک ہے۔ تم ایسے ویسے لڑکے نہیں ہو مگر یہ مت بھولو کہ یہ جلیبیاں بھی کوئی ایسی ویسی جلیبیاں نہیں ہیں۔ تازہ ہیں اور میٹھے میٹھے رس سے بھری ہوئی ہیں۔

منہ میں پانی تو بھر آیا مگر ہم اس سیلاب میں آسانی سے بہہ جانے والے نہیں تھے۔ سکول میں ہم بڑے ہونہار بچوں میں گنے جاتے تھے۔ چوتھی جماعت کے امتحان میں ہم نے چار روپے مہینے کا وظیفہ بھی جیتا تھا۔ پھر ہم ایک کھاتے پیتے گھر سے سکول آتے تھے اس لئے ہمارے بڑے ٹھاٹ تھے اب تک کبھی پٹے نہیں تھے بلکہ ماسٹر جی نے کئی لڑکوں کو ہم سے پٹوایا تھا اتنے رعب داب والا بچہ بازار میں کھڑے ہو کر جلیبیاں کھانے لگے؟ نہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ بات ٹھیک نہیں ہے۔ روپوں کو ہم نے مٹھی میں دبایا اور گھر آ گئے۔

اس روز روپوں کو خرچ ہونے کا ایسا شوق تھا کہ باتیں کرتے کرتے ان کی آوازیں بھرا گئیں۔ ہم گھر جا کر پلنگ پر بیٹھے تو وہ بولنے لگے۔ ہم کھانا کھانے چلے تو وہ چیخنے لگے۔ ہم نے بستر پر کروٹیں بدلنا شروع کیں تو وہ رونے لگے تنگ اٹھے اور ننگے پاؤں بازار کی طرف بھاگ نکلے۔ گھبرائے ہوئے تو تھے ہی۔ حلوائی کو اکٹھی ایک روپے کی جلیبیاں تولنے کو کہہ دیا۔ حلوائی نے حیران ہو کر ہماری طرف یوں دیکھا جیسے وہ پوچھ رہا ہے کہ اتنی جلیبیاں لادنے کے لئے ریڑھی کہاں ہے؟ وہ بڑا سستا زمانہ تھا۔ ایک روپے کی اتنی جلیبیاں ملتی تھیں جواب دس روپے میں بھی نہ ملیں۔ اس نے ایک پورا اخبار کھولا اور اس پر جلیبیوں کا ایک ڈھیر لگا دیا۔

ابھی ہم یہ ڈھیر سمیٹ ہی رہے تھے کہ دور سے ہمیں اپنا ٹانگہ آتا دکھائی دیا چچا جان کچہری سے واپس آ رہے تھے ہم جلیبیوں کے ڈھیر کو سینے سے چمٹائے ایک گلی میں بھاگ نکلے۔ ایک محفوظ موڑ پر پہنچ کر جو ہم نے جلیبیاں کھانا شروع کیں تو اتنی کھائیں، اتنی کھائیں کہ اگر اس وقت کوئی ہمارے پیٹ کو ذرا سا دبا دیتا تو جلیبیاں ہمارے کانوں اور نتھنوں میں سے لٹک پڑتیں۔

گلی میں محلے بھر کے لڑکے جمع ہو گئے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں دیکھنے لگے۔ ہم سیر تو ہو ہی چکے تھے اس لئے موج میں آ گئے اور ایک ایک جلیبی ان کو بھی تھما دی۔ وہ خوش ہو کر کودتے اور چیختے ہوئے ادھر اُدھر گلیوں میں بھاگ گئے مگر شاید ان سے یہ خوش خبری سن کر نئے بچے آ نکلے ہم نے لپک کر حلوائی کی دکان سے ایک اور روپے کی جلیبیاں خریدیں اور واپس آ کر ایک مکان کے چبوترے پر کھڑے ہو کر بچوں میں یوں بانٹ دیں جیسے یوم آزادی پر گورنر صاحب

غریبوں مسکینوں میں چاول بانٹتے ہیں۔ اب تک ہمارے اردگرد بچوں کا ایک بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا تھا اور گداگروں نے بھی ہلّہ بول دیا تھا۔ اگر بچے بھی اسمبلی کے ممبر بن سکتے تھے تو اس دن ہماری کامیابی یقینی تھی اسی لیے کہ یہ ہجوم ہمارے جلیبی والے ہاتھ کے ایک ذرا سے اشارے پر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا۔ ہم نے باقی دو روپوں کی بھی جلیبیاں خرید کر بانٹ دیں۔ اس کے بعد نل پر آ کر ہاتھ منہ دھوئے اور یوں مسمی صورت بنا لیئے گھر واپس آ گئے جیسے ہم نے جلیبی کی صورت عمر بھر نہیں دیکھی۔

جلیبیاں تو ہم نے کھالیں مگر انہیں ہضم کرنا مشکل ہو گیا۔ بھر سانس کے ساتھ ڈکار آ رہی تھی۔ اور ہر ڈکار کے ساتھ ایک آدھ جلیبی کے باہر نکل پڑنے کا ڈر مارے ڈال رہا تھا شام کے بعد مارے باندھے کھانا بھی کھانا پڑ گیا۔ اگر نہ کھاتے تو نہ کھانے کی وجہ پوچھی جاتی اور اگر بیماری کا بہانہ کرتے تو ڈاکٹر بلوا لیا جاتا اور اگر ڈاکٹر ہماری نبض دیکھ کر کہہ دیتا کہ منّا جلیبیوں کا ایک ڈھیر ڈکارے پڑا ہے تو جان پر بن آتی۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ہم ساری رات پیٹ کے درد کے مارے جلیبی بنے پڑے رہے وہ تو خدا کا شکر ہے کہ چاروں روپوں کی جلیبیاں ہمیں کو نہیں کھانا پڑی تھیں ورنہ دوسرے بچے تو جب باتیں کرتے ہیں تو ان کے منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ ہم دنیا کے پہلے بچے ہوتے جس کی ہر بات پر اس کے منہ میں سے ایک تلی تلائی جلیبی ٹپک پڑتی۔

بچوں کے معدے نہیں ہوتے۔ ہاضمے کی مشینیں ہوتی ہیں سو صبح تک ہماری مشین بھی چالو رہی اور ہم ہر روز کی طرح منہ دھو کر ایک چاق چوبند طالب علم کی طرح اسکول کی طرف چلے ہمیں معلوم تھا کہ آج پچھلے مہینے کا وظیفہ مل جائے گا اور اس رقم سے فیس ادا کر کے ہم جلیبیوں کو پوری طرح ہضم کر لیں گے۔ مگر وہاں جا کر پتہ چلا کہ اس مہینے کا وظیفہ تو اگلے مہینے ملے گا۔ چکر آ گیا۔ ایسا لگا جیسے ہم سر کے بل کھڑے ہیں اور اب چاہیں بھی تو پاؤں کے بل کھڑے نہیں ہو سکتے۔

ماسٹر غلام محمد نے بتایا کہ تفریح کے گھنٹے میں فیس لی جائے گی۔ تفریح کی گھنٹی بجی تو ہم بستہ بغل میں دبائے اسکول سے نکلے اور ناک کی سیدھ میں یوں چلنے لگے جیسے اگر ہماری راہ میں کوئی پہاڑ یا دریا نہ آیا تو ہم ہمیشہ چلتے رہیں گے اور جب ہم وہاں پہنچیں گے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے

اور آسمان شروع ہو جاتا ہے تو وہاں اپنے اللہ میاں سے کہیں گے کہ اللہ میاں اب سے ہماری توبہ بس اب سے ہمیں بچا لیجئے اور کسی فرشتے کو حکم دیجئے کہ وہ ہماری جیب میں صرف چار پیسے ڈال جائے ہم آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ان چار روپوں سے فیس ہی ادا کریں گے جلیبیاں نہیں اڑائیں گے۔

ہم وہاں تو نہ پہنچ سکے جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں ہاں ضرور پہنچ گئے جہاں سے کیمبل پور کا ریلوے اسٹیشن شروع ہو جاتا ہے۔ بزرگوں نے ہمیں بتا رکھا تھا کہ ریل کی پٹڑی پر سے نہیں گزرنا چاہیئے اس لئے ہم وہیں پٹڑی کے پاس رک گئے۔ ٹھیک ہے بزرگوں نے ہمیں یہ بھی بتا رکھا تھا کہ فیس کے روپوں سے مٹھائی نہیں کھا لینی چاہیے مگر نہ جانے اس دن یہ بات ہمارے ذہن سے کیوں اتر گئی تھی۔

ریل کی پٹڑی کے پاس ایک سایہ دار درخت تھا۔ ہم وہیں بیٹھ گئے اور سوچنے لگے کہ کیا اس دنیا میں ہم سے زیادہ بدنصیب بچہ بھی کوئی ہو سکتا ہے! شروع شروع میں جب روپوں نے ہماری جیب میں شور مچایا تھا تو ساری بات کتنی سیدھی سادی لگتی تھی۔ یہی کہ فیس کے روپوں کی مٹھائی کھا جاؤ اور کل سکول سے وظیفہ لے کر سکول ہی میں فیس ادا کر ڈالو۔ ہم نے سوچا تھا کہ دو اور دو ہمیشہ چار ہوتے ہیں پانچ کبھی نہیں ہو سکتے ہمیں کیا پتہ تھا کہ کبھی کبھی پانچ بھی ہو جاتے ہیں۔ اگر ہمیں پتہ ہوتا کہ وظیفہ اگلے مہینے ملے گا تو جلیبیاں کھانے کا پروگرام بھی اگلے مہینے پر ٹال دیتے۔ اب ذرا اس جلیبیاں کھا لینے کے جرم میں ہم زندگی میں سکول سے پہلی بار غیر حاضر ہوئے تھے اور یہاں ریلوے اسٹیشن کے ایک سنسان گوشے میں ایک درخت کے نیچے سکڑے بیٹھے تھے۔

درخت کے نیچے بیٹھنے کے بعد پہلے تو ہمیں تھوڑا سا رونا آیا پھر یہ سوچ کر ہمیں یہ ہنسی آگئی کہ یہ جو ہم آنسو بہا رہے ہیں تو یہ آنسو نہیں ہیں جلیبیوں کے رس کے قطرے ہیں۔ جلیبیوں سے ہمیں فیس اور فیس سے ماسٹر غلام محمد کا ڈنڈا اور ماسٹر غلام محمد کے ڈنڈے سے خدا یاد آگیا۔ ہم نے آنکھیں بند کر لیں اور بڑی رقت کے ساتھ دعا مانگنے لگے۔

اللہ میاں۔ ہم بڑے نیک لڑکے ہیں۔ ہمیں پوری نماز یاد ہے۔ قرآن مجید کی آخری دس سورتیں بھی ازبر ہیں۔ آپ چاہیں تو ہم سے پوری آیۃ الکرسی ابھی ابھی سن لیجئے۔ عرض فدوی کی یہ ہے کہ یہ جو ہم نے فیس کے روپوں کی جلیبیاں کھا لی ہیں تو چلیے، ہم مانے لیتے ہیں کہ ہم سے غلطی ہو گئی۔

ویسے ہم نے یہ جلیبیاں اکیلے نہیں کھائیں اتنے بہت سے بچوں کو کھلائی ہیں لیکن خیر ہو گئی غلطی اگر ہمیں یہ پتہ ہوتا کہ وظیفہ اگلے مہینے ملے گا تو ہم جلیبیاں نہ کھاتے نہ کھلاتے۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا اب آپ یوں کیجئے کہ ہمارے بستے میں چار روپے رکھ دیجئے۔ چار روپوں سے ایک پیسہ بھی زیادہ ہوا تو ہم روٹھ جائیں گے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اگر ہم نے فیس کی رقم سے پھر کبھی مٹھائی کھائی تو جو چور کی سزا۔ سو اللہ میاں۔ بس آج ہماری مدد فرما دیجئے۔ آپ کے خزانے میں کسی چیز کی کمی نہیں۔ ہمارا چپڑاسی تک ہر مہینے پندرہ بیس روپے لے جاتا ہے تو اللہ جی۔ ہم تو آخر ایک بڑے افسر کے بھتیجے ہیں کیا آپ ہمیں چار روپے بھی نہیں دیں گے؟"

دعا کے بعد ہم نے نماز، آخری دس سورتیں، آیتہ الکرسی، کلمہ طیبہ، غرض وہ سب کچھ پڑھ ڈالا جو ہمیں یاد تھا۔ پھر ہم نے اپنے بستے پر "پھوہ" کی اور جب بسم اللہ کہہ کر بستہ کھولا تو بھئی سچ کہا تھا کسی نے۔ قسمت کے لکھے کو کون مٹا سکتا ہے۔ بستے میں چار روپے چھوڑ چار پیسے بھی نہیں تھے بس چند کتابیں اور چند کاپیاں تھیں۔ ایک۔ پنسل تھی۔ ایک پنسل تراش تھا اور ایک پرانا عید کارڈ تھا جو ہمارے ماموں نے ہمیں پچھلی عید پر بھیجا تھا۔

زور زور سے رو دینے کو جی چاہا مگر پھر خیال آیا کہ سکول میں چھٹی ہو گئی ہو گی اور بچے گھر جا رہے ہوں گے۔ ہم تھکے ہارے وہاں سے اٹھے اور بازار میں آکر سکول میں چھٹی کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے تاکہ بچے نکلیں تو ہم بھی ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے گھر یوں پہنچیں جیسے سیدھے سکول سے آرہے ہیں۔

ہمیں یہ خیال ہی نہ آیا کہ ہم جلیبیوں والے حلوائی کی دکان کے پاس کھڑے ہیں اچانک حلوائی کی آواز آئی۔ "کیوں بھئی۔ تولوں ایک روپے کی؟ کیا آج جلیبیاں نہیں کھاؤ گے؟"

جی میں آئی اس سے کہہ دیں کہ جلیبیاں تو خیر نہیں کھائیں گے۔ ہاں آج ہم تمہارا کلیجہ بھون کر کھانا چاہتے ہیں مگر اس روز ہماری طبیعت کچھ علیل سی ہو رہی تھی اس لئے آگے بڑھ گئے۔

دوسرے دن بھی ہم نے یہی کیا۔ گھر سے تیار ہو کر نکلے۔ سکول کے گیٹ تک آئے اور وہاں سے ریلوے اسٹیشن پر آنکلے۔ اس درخت کے نیچے بیٹھ کر وہی دعائیں مانگنا شروع کر دیں بار بار عرض کیا کہ "اللہ میاں" آج تو دے دیجئے آج تو دوسرا دن ہے۔

پھر کہا: "اچھا تو آیئے ایک مزے کا کھیل کھیلیں۔ ہم یہاں سے اس سگنل کی طرف چلے جاتے ہیں آپ پیچھے سے اس بڑے سے پتھر کے نیچے چار روپے رکھ جایئے۔ ہم سگنل کو چھو کر واپس آئیں گے اور یہ پتھر اٹھا کر دیکھیں گے تو نیچے چار روپے پڑے پا کر لطف آ جائے گا۔ تو پھر تیار ہو جایئے۔ ہم چلے سگنل کی طرف۔ ون۔ ٹو۔ تھری"

ہم سگنل تک گئے۔ مسکراتے ہوئے واپس آئے مگر وہ پتھر اٹھانے کا حوصلہ نہ ہوا۔ اگر نیچے سے روپے نہ نکلیں تو؟۔ پھر سوچا اگر نکل پڑے تو؟۔

آخر ہم نے بسم اللہ کہہ کر پتھر جو اٹھایا تو نیچے سے ایک بہ لمبا بالوں بھرا کیڑا بل کھاتا ہوا اٹھا اور ہماری طرف بڑھا۔ ہم چیخ مار کر بھاگے اور ایک بار پھر سگنل کو چھو آئے۔ پھر کچھ دیر کے بعد پنجوں کے بل چلتے ہم درخت کے نیچے پہنچے پوری کوشش کی کہ ہماری نظریں اس پتھر کی طرف نہ اٹھیں مگر جب ہم وہاں سے بستہ اٹھا کر چلے تو پتھر کی طرف ایک بار دیکھنا ہی پڑ گیا اور پتہ ہے وہاں ہم نے کیا دیکھا ہم نے دیکھا کہ کیڑا صاحب پتھر کے اوپر کنڈل مارے بیٹھے ہیں اور ہماری دیکھ رہے ہیں۔

اس کے بعد ہم وہاں سے یہ سوچ کر چلے کہ کل وضو کر کے اور صاف کپڑے پہن کر یہاں آئیں گے اور صبح سے دوپہر تک نماز پڑھتے رہیں گے۔ اس پر بھی خدا نے ہمیں چار روپے نہ دینے تو کسی سے جلّا کاٹنے کا طریقہ سیکھیں گے۔ آخر ہمیں چار روپے ہمارا خدا نہیں دے گا تو اور کون دے گا۔ چچا جان کو چار روپے دینے تھے۔ وہ تو ہمیں دے چکے۔ اب خدا کے سوا ہمارا اور کون ہے۔

مگر اس دن ہم ظاہر ہیں سکول سے اور اصل میں ریلوے اسٹیشن سے گھر واپس پہنچے تو پکڑے گئے۔ سکول سے ہماری غیر حاضری کی رپورٹ پہنچ چکی تھی۔ یہ بتانا فضول ہے کہ اس کے بعد کیا ہوا۔ صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ اس کے بعد وہی ہوا جو ہوتا ہے۔ یعنی ایک کے دو دو دکھائی دیتے ہیں اور دن کو تارے نظر آنے لگتے ہیں۔

وہ تو جو ہوا سو ہوا لیکن ساتویں آٹھویں جماعت تک ہم یہی سوچتے رہے کہ اگر اس روز اللہ میاں ہمیں چار روپے بھیج دیتے تو کسی کا کیا بگڑ جاتا اس کے بعد ہی ہم اس نتیجے تک پہنچے کہ اگر اللہ میاں یونہی مانگنے پر دے دیا کرتے تو انسان آج بھی چیل کوؤں کی طرح درختوں میں گھونسلے بنائے بیٹھے ہوتے اور اب تک انہوں نے جیلبی بنانے کا فن بھی نہ سیکھا ہوتا۔

آپ کی پسندیدہ اور مقبول ترین

بلّی مارکہ

میٹرو ملن

اگربتّی



بھینی بھینی

اور مسحور کُن خوشبو والی

بلّی مارکہ

میٹرو ملن اگربتّی

سیلوفین ایئر ٹائٹ پیکنگ میں

ٹیئر اِسٹریپ کے ساتھ

تمام ممتاز ڈیلروں سے دستیاب ہے۔

تیار کردہ:

میٹرو اگربتّی کمپنی پوسٹ بکس نمبر ۴۸۸۔ کراچی

فون: ۲۹۲۷۳۷ - ۲۹۰۸۷۷ - ٹیلیکس: ۲۳۴۳۴ میٹرو پی کے

علی نوری کے قلم سے

دلچسپ مقابلے کی رُوداد

کِک باکسنگ





دو مایہ ناز کک باکسر جنہوں نے دوبئی میں منعقد ہونے والے مقابلے میں حصّہ لیا۔

نہتے رہتے ہوئے یا غیر آتشیں ہتھیار استعمال کرتے ہوئے دشمن سے اپنے بچاؤ کو مارشل آرٹ کہا جاتا ہے اور مارشل آرٹ کی بھی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں جوڈو، کراٹے، شوتوکان، ناگامن، ٹی کوانڈو اور دیگر طرز کے مقابلے شامل ھیں۔

دراصل خود حفاظتی تیکنیک مشرقِ بعید کے ممالک جیسے جاپان کوریا، چین اور تھائی لینڈ کی ایجاد ہے۔ لیکن آج کل یہ دنیا بھر میں اتنا مقبول ہے کہ اسے کھیل کا درجہ حاصل ہوگیا ہے۔ نہ صرف مارشل آرٹ کی عالمی چمپئن شپ منعقد ہوتی ہے بلکہ انہیں ایشیائی اور اولمپک گیمز میں بھی شامل کیا گیا ہے۔

مارشل آرٹ میں جدّت اور دلچسپی پیدا کرنے کے لئے ان میں مختلف اضافے اور ترمیم کی گئی ہیں۔ ان میں ایک انتہائی دلچسپ کک باکسنگ ہے۔

گک باکسنگ دراصل مارشل آرٹ کے کراٹے، ٹی کوانڈو اور شوتوکان اسٹائل کو ملاکر ایک کھیل بنایا گیا ہے۔ جو "فل یا ڈبلی کنٹیکٹ" کی بنیاد پر لڑا جاتا ہے۔

یہ ایک نہایت دلچسپ کھیل ہے۔ جو مارشل آرٹ کے لباس "گی" پہن کر ہاتھوں میں باکسنگ گلوز اور پیروں میں ہیوی ویٹ کے مخصوص جوتے پہن کر باکسنگ رنگ میں لڑا جاتا ہے۔

گزشتہ دنوں متحدہ عرب امارات کی ریاست دبئی میں گک باکسنگ کے تین قومی مقابلے دبئی کپ کے نام سے منعقد ہوئے۔ جس میں میزبان ملک دبئی، پاکستان اور بھارت کے گک باکسرز نے حصہ لیا۔ دبئی کے کھلاڑی شوتوکان، پاکستان کے کھلاڑی ٹی کوانڈو اور بھارتی کھلاڑی کراٹے کے ماہر مانے جاتے ہیں لیکن ان تینوں مارشل آرٹس کو ملاکر ایک کھیل گک باکسنگ کی تشکیل کے بعد تینوں ممالک کے مارشل آرٹ کھلاڑیوں نے نئے مرتب کردہ قواعد و ضوابط کے تحت ہی تربیت حاصل کی اور مقابلوں میں حصہ لیا۔

ہمیں بھی ان مقابلوں کو دیکھنے کی (یقیناً لڑنے کی نہیں، ویسے ہی ہم مار پیٹ سے گھبراتے ہیں) دعوت ملی تو ہم بھی پاکستان گک باکسنگ ٹیم جسے اسپانسرز کے نام پر پی کے اے واٹی ٹیم" کا نام دیا گیا ہے کے ساتھ دبئی جا پہنچے یہ مقابلے جمعرات ۲۲ اپریل کو دبئی کے نہایت ہی خوبصورت النصر ریزرلینڈ (تفریح گاہ) کے ٹینس کورٹ پر قائم کئے گئے رنگ میں ہوئے۔ ان مقابلوں کو دیکھنے کے لئے مقامی باشندوں کے علاوہ امارات میں مقیم پاکستان اور بھارت کے باشندوں کی کثیر تعداد بھی رنگ کے اطراف موجود تھی۔ جو اپنے اپنے ملک کے پرچم لئے اپنے باکسروں کے حق میں فلک شگاف نعرے بلند کر رہے تھے۔

پہلا مقابلہ پاکستان کے فرانسس اور بھارت کے راجن کے درمیان ہوا۔ دونوں گک باکسرز تقریباً ہم وزن اور قد میں برابر تھے۔ لیکن فرانسس نے شروع ہی سے اپنے تابڑ توڑ مکوں اور لاتوں سے راجن کو رنگ کے ایک کونے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ گو کہ راجن شروع ہی سے اس مقابلہ میں پوائنٹس کی بنیاد پر پیچھے رہے لیکن ناک آؤٹ سے بچنے کے لئے انہوں نے اپنے سر اور جسم کا کامیابی سے دفاع کیا۔ تین راؤنڈ کے اس مقابلے میں فرانسس کو راجن پر پوائنٹس کی بنیاد پر کامیابی حاصل ہوئی۔

اس طرح پاکستان نے پہلا ہی مقابلہ جیت کر برتری حاصل کرلی۔ لیکن یہ برتری دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ کیونکہ دبئی کے محمود رضا نے دوسرے مقابلے میں پاکستان کے محمد عمر کو تیسرے اور آخری راؤنڈ کے آخری لمحات میں ایک سخت اور خونی مقابلہ کے بعد ناک آؤٹ کر کے دبئی کو پہلی کامیابی دلادی۔ تیسرے مقابلے میں دبئی ہی کے افشین امیر علی جو دنیا کے ایک مانے ہوئے شوتوکان مارشل آرٹ کھلاڑی ہیں نے بھارت کے رزمک کو دوسرے





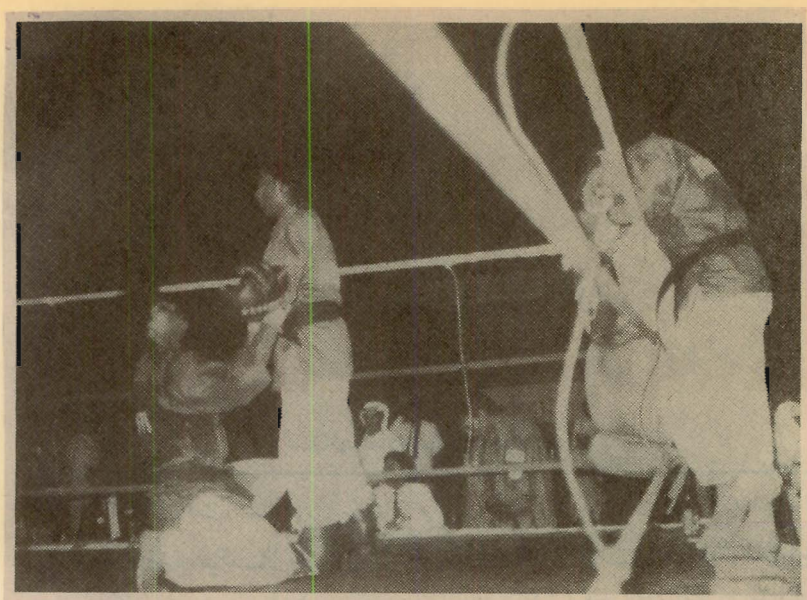
پاکستان کے دو بہترین کھلاڑی۔

ہی راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے دبئی کی برتری کو مستحکم کر دیا۔ رزمک نے ذہن لڑا کر یہ مقابلہ لڑا۔ لیکن وہ بالآخر اپنے ہم حریف سے زیادہ دیر تک مزاحمت نہیں کر سکے۔ غلام (دبئی) اور محمود خان (پاکستان) کے درمیان مقابلہ نہایت سخت اور سنسنی خیز رہا۔ غلام پہلے راؤنڈ میں حاوی رہے اور انہوں نے محمود کی غلطیوں کا فائدہ اٹھایا۔ لیکن دوسرے راؤنڈ میں محمود خان نے جو قومی ویلٹر ویٹ باکسنگ چمپئن بھی رہ چکے ہیں۔ غلام پر تابڑ توڑ حملے کئے اس طرح دوسرا راؤنڈ ان کا رہا۔ تیسرے راؤنڈ میں محمود نے ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا مظاہرہ کیا اور اپنے کو بچائے بغیر حریف پر حملے کئے۔ جس کے نتیجہ میں وہ صرف ۲ پوائنٹس کے فرق سے مقابلہ ہار گئے۔ دبئی کے غلام نے بھارت کے نواز قادر خان پر واک اوور کے ذریعہ کامیابی حاصل کر کے دبئی کی کامیابی کو یقین بنا دیا۔ نواز قادر بمبئی میں ایک حادثہ میں زخمی ہو جانے کے باعث دبئی نہ آ سکے۔

لیکن اس کے بعد پاکستان کے اعظم علی نے نہایت ہی دلیرانہ کھیل کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے زبردست مکوں اور گھسن کی بدولت دبئی کے عماد کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے پاکستان کو مقابلوں کی سیریز میں دوسری کامیابی دلائی۔ عماد وزن میں اعظم سے بہت بھاری تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اعظم کی پھرتی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اعظم نے مار مار کر ان کا چہرہ لہولہان کر دیا۔ جس کی وجہ سے ریفری نے دوسرے ہی راؤنڈ میں مقابلہ روک دیا۔

ساتویں مقابلے میں دبئی کے کپتان شاہرام (بلیک بیلٹ ہولڈر) نے بھارت کے انول کو پہلے راؤنڈ میں اپنی پہلی ضرب سے ناک آؤٹ کر کے مقابلہ جیت لیا۔ انول کو اپنی چال آزمانے کا موقع ہی نہیں ملا۔

بھارت جسے ابھی تک کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ بالآخر ان کے کپتان بھارتی کراٹے ایسوسی ایشن کے



دبئی میں ہونے والے مقابلے کا ایک منظر۔

صدر جاوید خان نے پاکستان کے خلیل نظامی کو دوسرے راؤنڈ میں ناک آؤٹ کر کے اپنے ملک کے لئے واحد کامیابی حاصل کی۔ جاوید خان سے خلیل نظامی کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ لیکن خلیل نظامی نے نہایت سنجیدگی سے اپنے حریف کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اور حیرت انگیز طور پر مقابلہ کو آگے بڑھا لے گئے۔

آخری مقابلے میں پاکستان ٹیم کے کپتان شاہد علی صدیقی نے بھارت کے اجوتا ریڈی کو باآسانی پوائنٹس پر شکست دے کر پاکستان کے لئے تیسری کامیابی حاصل کی۔ شاہد علی اس مقابلہ میں شروع سے آخر تک ریڈی پر چھائے رہے۔ اور اپنی مرضی سے مقابلہ لڑتے رہے۔ آخری مقابلہ جو ٹیگ ٹیم (جوڑی دار مقابلہ) مقابلہ تھا۔ اس میں پاکستان کے فرانسس اور محمد عمر نے بھارت کے راجن اور تھول کو شکست دی۔

اس طرح دبئی نے ۵ مقابلے جیت کر دبئی کپ حاصل کیا۔ جبکہ پاکستان نے ۴ مقابلے جیت کر دوسری اور بھارت نے ایک مقابلہ جیت کر تیسری پوزیشن حاصل کی۔ ریفری کے فرائض ایران کے راج پور تلوئی نے انجام دیئے۔ ٹیگ ٹیم مقابلہ کے ریفری سرفراز سرور تھے۔ منصفین میں سرفراز سرور (پاکستان)، گلن ہیلن (برطانیہ) اور رزمک (بھارت) شامل تھے۔ ان مقابلوں کے اختتام پر شیخ احمد بن سعید المکتوم نے انعامات تقسیم کئے۔



بھیّا اور بہنا

ثاقبہ رحیم الدین

"سندر بن" بنگال کا بڑا ہی گھنا اور سرسبز جنگل تھا۔ ندی کے کنارے کا شور، چڑیوں کی چہکار اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، سب کا دل موہ لیتے تھے۔ سورج نکلتا تو اس کی کرنیں سندر بن کے گرد چاندی کا جال بن دیتیں اور چاند ابھرتا تو پیلی پیلی چاندنی میں وہ نہا جاتا۔ اس سے ذرا دور ایک نیک دل راجہ کا محل تھا۔

راجہ اور رانی بڑے رحم دل، انصاف پسند اور نیک تھے۔ تمام رعایا چین سے تھی۔ دونوں اپنے بیٹے اور بیٹی کے ساتھ ہنسی خوشی دن گزار رہے تھے، دونوں بچوں کے اصل نام تو جانے کیا رکھے گئے ہوں گے مگر سب انہیں پیار سے راجو بابا اور بینا رانی کہہ کر بلاتے تھے۔ راجو شہزادہ عادات اور صفات میں ہیرا تھا اور بینا رانی بھی خوش مزاج بس یوں سمجھو کہ فرشتہ صفت تھی۔ محل میں دنیا جہان کا عیش و آرام اور پھر ماں باپ کا سایہ، دونوں سکھ کی فضا میں پرورش پا رہے تھے۔

کرنا خدا کا یہ ہوا ــــ کہ اچانک مہارانی شاموں شام باغ سے ٹہل کر آئی تو بخار ہو گیا۔ ہزار حکیم بلوائے گئے بخار کو نہ اترنا تھا نہ اترا۔ کئی دن گزرے، وہ حال سے بے حال ہوئے جاتی۔ آخر موت کا فرشتہ آن پہنچا۔ راجہ اور بچوں پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر یہ دنیا پھر دنیا ہے۔ بچے بھی چھوٹے تھے، کھیل کود میں لگ گئے۔

گوراجہ کو اپنی رانی سے بڑی محبت تھی۔ مگر مرنے والوں کے ساتھ کوئی مرا نہیں کرتا۔ جی ہے تو جہان ہے۔ راجہ کو 'مدھو پور' کے راجہ کی بیٹی پسند آگئی۔ دھوم دھام سے بیاہ رچایا۔ نئی رانی کے آنے سے محل کی رونق لوٹ آئی سات آٹھ سال بیت گئے۔ خدا نے راجہ کو چار بیٹے عطا کیئے۔

راجہ خوش تھا کہ سب بچے مل جل کر رہتے ہیں۔ فطرتاً وہ سادہ دل اور نیک تھا۔ جوں جوں عمر بڑھ رہی تھی، وہ خدا سے لو لگائے رہتا تھا۔ نئی رانی بالکل جدا فطرت کی مالک تھی۔ بناوٹ، دکھاوا، جھوٹ اور جلن و حسد اسکی رگ رگ میں بسا تھا۔ چاروں لڑکے راجو اور بینا سے شدید نفرت کرنے لگے۔ کبھی ان دونوں کی شکل و صورت اور ذہانت سے جلتے، کبھی دوسروں کے تعریف کرنے پر حسد کرتے۔ بھلے مانس، راجہ کو کانوں کان خبر نہ تھی۔

راجو کو تو بہت ہی اچھا پھل میز پر دیکھتا تو پہلے چھوٹے بھائیوں کو دیتا۔ بینا کھیل ہی کھیل میں بھائیوں کو لکھنا سکھاتی۔ راجو اور بینا مل کر سب سے چھوٹے شہزادے کو ہمیشہ جھولے کی زیادہ باریاں دیتے۔ دونوں بے خبر اور معصوم بھائی بہن سب سے سچی محبت کرتے تھے۔

ایک بار تیر اندازی کا مقابلہ ہوا تو راجو اوّل آیا، تیراکی میں بینا کا جواب نہ تھا۔ بڑے بڑے راجہ اور مہاراجہ مہمان آتے، تو دونوں پر خود بخود زیادہ توجہ دیتے۔ خدا کی مہربانیاں تو سب انسانوں اور بچوں پر ہوتی ہیں مگر نفرت اور حسد کی تاریکی سب خوبیوں کو نگل لیتی ہے۔ چاروں لڑکوں کو اپنے کمتر ہونے کا احساس پیدا ہوگیا۔ اور ہر وقت کے غصّے نے اُن کو بدصورت اور برا بنادیا۔ سچی بات ہے کہ بنا محنت تو آج تک کوئی اچھا نہیں بنا۔ اور پھر حسد تو ایسی بیماری ہے کہ اندر ہی اندر کھائے جاتی ہے۔

چاروں شہزادوں نے ماں سے صلاح کی اور وزیر زادے کی مدد سے راجو کے کھانے میں زہر ملوادیا۔ غلطی سے یا خوش بختی سے راجو سے برتن اُلٹ گیا اور وہ بچ گیا۔ ایک بار سازش کی کہ رانی دھوپ میں بال سکھا رہی تھی، کہ پیچھے سے سانپ چھوڑ دیا گیا۔ مارے ڈر کر وہ دم سادھے بیٹھی رہی۔ سانپ دائیں جانب سے گزر گیا ایک بار بھائی بہن گھوڑوں پر سوار ہوکر سیر کو گئے۔ کسی غریب کو روپے کی لالچ دی کہ جب فلاں درخت کے نیچے سے گزریں تو وزنی شاخ گرادی جائے۔ بس بھئی جسے مولا رکھے اُسے کون چکھے۔! گھوڑوں نے ایسی ایڑ لگائی کہ وہ تیزی سے نکل گئے اور شاخ ذرا دیر سے گری۔

راجو اور بینا اکثر گرمیوں کی چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی کھیلتے تو بہت دوستوں کو بلا لیتے کبھی کبھی کھیل میں بھائی بہن لڑ پڑتے۔ راجو روٹھ جاتا اور سب سے الگ ہوکر بیٹھ جاتا۔ کبھی تو وہ بغیر بتائے کھیل چھوڑ کر چلا جاتا تب بینا بڑے زور سے آواز دیتی "تم میرے بھیّا اور میں تمہاری بہنا" کٹی ختم، آؤ آؤ، پھر سے کھیلیں۔"

"سندر بن" میں یہ پیار بھری آواز بار بار گونجتی ۔ "تم میرے بھیّا اور میں تمہاری بہنا" یوں محسوس ہوتا کہ آس پاس، ککرو ندے اور بیری کی جھاڑیاں جھوم اٹھتیں۔ جھرنے کا پانی گنگنانے لگتا تھا۔ بنیا کی ایک سہیلی لیچی کے درخت میں پڑے رسّی کے جھولے کی پینگ بڑھانے لگتی تو شاخیں چُرچُر کرنے لگتی تھیں۔ چاند کی چاندنی، محبت کی روشنی بن کر ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔

وقت گزر رہا تھا۔ اور سوتیلی ماں کے دل میں حسد کی آگ بھی تیز ہو رہی تھی۔ آخر اُس نے ان موہنی صورتوں کو مٹانے کی ٹھان لی۔

شام ڈھلے، راجو اور بنیا سرسبز باغ میں کھیل رہے تھے۔ چار لڑکیوں نے مل کر، ہاتھ تھامے دائرہ بنایا۔ ایک لڑکی بیچوں بیچ کھڑی تھیں۔ راجو دائرے سے باہر تھا۔ اس نے سوال کیا "بول رے بول مچھلی کتا پانی۔ کر کر یا گلے گلے؟۔ بول رے مچھلی ساون آیا۔؟ کب آیا۔؟" اتنا کہنے کے بعد دائرے والے لڑکے تیز تیز چکّر کاٹنے لگے اور راجو نے تالی بجائی۔ ایک دو تین!!

خدا جانے کیا ہوا۔ اور کیسے سیاہ بادل اُمڈ آئے۔ زور کی آندھی آئی۔ اندھیرا چھانے لگا۔ بجلی چمکی اور سب ہی بچّے اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ ایسے میں دو اجنبی گھوڑے سوار بڑھے اور ایک تلوار سے راجو اور بنیا کو بُری طرح زخمی کیا۔ سیاہ چادروں میں اُن معصوم جانوں کو لپیٹا اور نامعلوم منزل کی طرف لے گئے۔ دونوں کو کنوئیں میں ڈالا اور منوں مٹی سے کنواں پٹ دیا۔

راجو اور بنیا خاک میں مل گئے۔ کنوئیں پر مٹی اور گرد و غبار کی ہزاروں تہیں چڑھ گئیں۔ سردی آئی گرمی آئی، برسات گزری، غرض سب رُتیں بیت گئیں۔ راجہ اللہ کو پیارا ہوا۔ چاروں شہزادے جوان ہوئے خوشیوں کے دن تھے اور مرادوں کی راتیں۔

سچ ہے کہ وقت کبھی ایک سا نہیں رہتا۔ ایک دوپہر ندی کا پانی چڑھنا شروع ہوا۔ ایسا سیلاب آیا کہ کیا مدھوپور اور کیا سندر بن۔ ساری بستی ڈوب گئی، ہر طرف بُو پھیل گئی۔ ایسا جل تھل ہوا کہ راج محل کا نشان نہ رہا۔

آج آبادی وہاں نام کو نہیں۔ ہو کا عالم ہے ہر طرف ویرانہ ہے۔ بس وئیں کے کچھ دور ہریالی ہے اور خودرو پودے نظر آتے ہیں۔ زمین میں نشیب کی وجہ سے بارش کا پانی جمع ہو کر، ایک تالاب میں تبدیل ہو گیا ہے۔ تالاب میں گلابی جنگلی کنول کے پھول نظر آتے ہیں۔ کنارے پر نازک سا چمپا کا درخت ہے۔

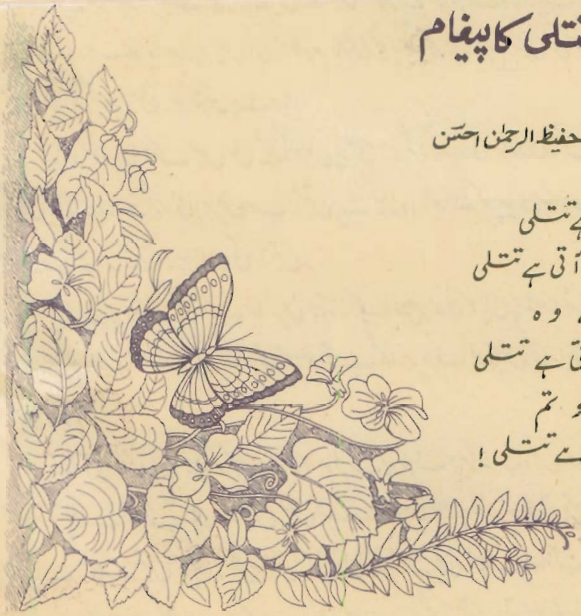
صدیاں بیت گئیں۔ اب بھی سیاح سندر بن سے گزرتے ہیں تو سنہری رنگت کے چمپا اور تالاب میں

گلابی کنول کی کلی کو دیکھ کر رک جاتے ہیں کہنے والے کہتے ہیں کہ زیادہ رُکے رہو تو جیسے جیسے چاندنی پھیلتی ہے فضا میں سریلی سی پیار بھری آواز سنائی دیتی ہے۔

"— تم میرے بھیّا اور میں تمہاری بہنا —"

حسد جلن اور غرور نے پوری آبادی اور شہزادوں کے نام کو پہلے بدنام اور پھر گمنام کر دیا محبت وخلوص اور دوستی وسچائی نے راجو اور بینا کو نیک نامی بخشی۔ اسی لئے تو پورب اور بنگال کی داستانوں میں ان کے نام موتی بن کر چمکے۔ ان ہی سے چمپا اور کنول کی مہک پھیلی۔ دریائے گومتی کنارے، آج بھی کٹھل کے درخت تلے ملاح یہ کہانی اپنے بچّوں کو سناتے ہیں۔ ہوا پھولوں کی اس مہک کو دُور دُور تک پھیلاتی رہتی ہے۔ کبھی تمہارے پاس اور کبھی ہمارے —





تتلی کا پیغام

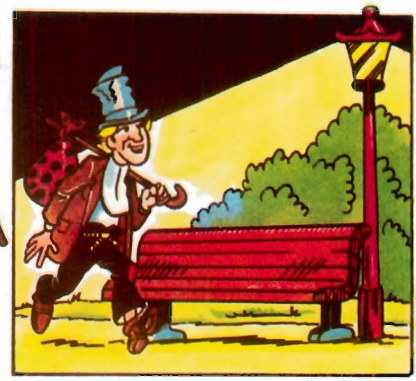
حفیظ الرحمٰن احسن

اِدھر اُدھر جاتی ہے تتلی
ہاتھ نہیں آتی ہے تتلی
ہر دم اُڑتی پھرتی ہے وہ
چین کہاں پاتی ہے تتلی
کام سے اپنے کام رکھو تم
ہم کو سمجھاتی ہے تتلی!


اِتنے سارے پھلوں کا
تازہ نکھار اِروپ
احمد
مِکسڈ فروٹ جام
TASTE AHMED PRESERVES !!!
AHMED'S
JAM
MIXEDFRUIT

کارٹون اسٹوری لکھیئے

ان ۶ تصاویر کو دیکھ کر آپ کی سمجھ میں کیا آیا؟ آپ جو کچھ
ی سمجھے ہوں ایک صفحے کی مختصر سی کہانی کی شکل میں ہمیں بھجوا دیں
مقابلۂ کارٹون کہانی میں شرکت کی آخری تاریخ ۳۰ جولائی ہے



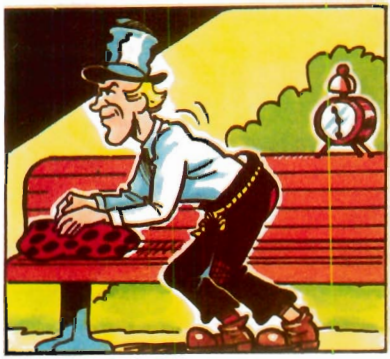
۱



۲



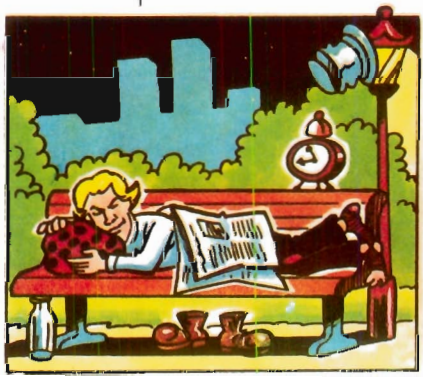
۳



۴



۵



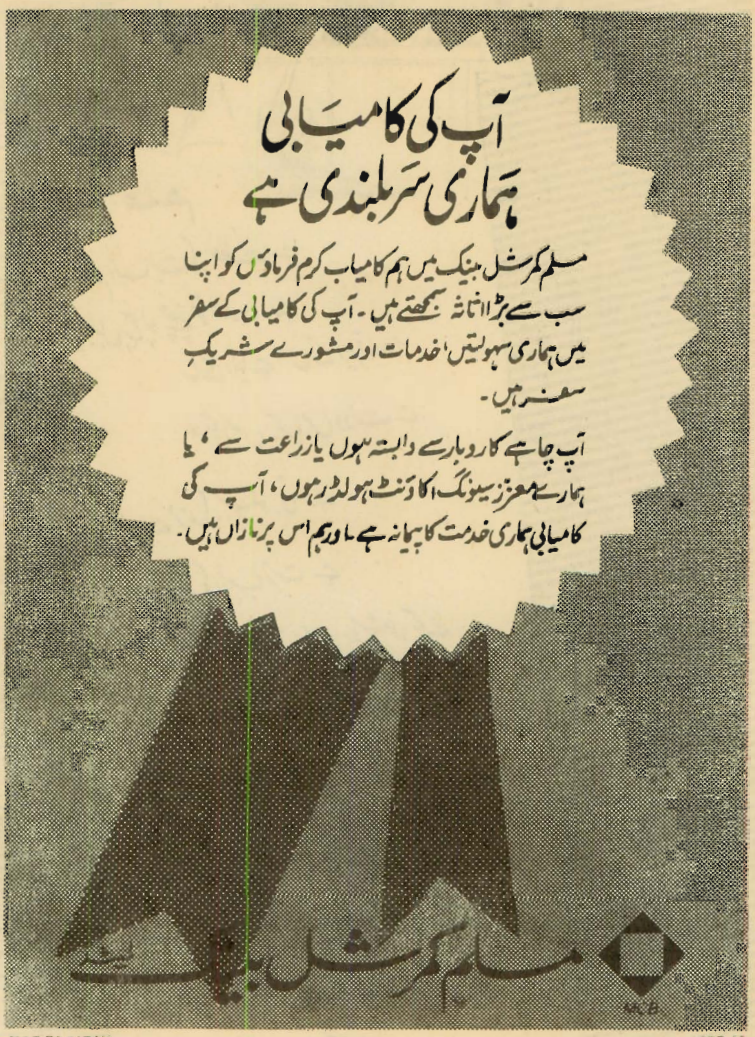
۶



محمد امان خان ملک

علم

علم انسانیت کی عظمت ہے
جہل سچ پوچھیے تو لعنت ہے
ساری دنیا ہے اس کے زیر قدم
علم کی جس کے پاس دولت ہے
علم سے زندگی سنورتی ہے
علم سے گھر کی زیب و زینت ہے
آج دنیا میں روشنی کے لئے
شمع علم کی ضرورت ہے
علم حاصل نہیں تو کچھ بھی نہیں
علم تہذیب ہے شرافت ہے
علم حاصل کرو کہ دنیا میں
علم سے آدمی کی عزت ہے
ہم زبوں حال ہو گئے ہیں کیوں
سچ ہے ہم میں بڑی جہالت ہے



NAB-84 PID(1)

MCB-15

آمنا سامنا

اخلاق احمد

حق اسکواڈ

تیسری اور آخری قسط

حق اسکواڈ کے چاروں ارکان امتحان میں کامیاب ہو چکے تھے۔ اور چھٹیاں گزار رہے تھے۔ چاروں ارکان اپنے فارغ ہیڈ کوارٹر میں اپنے اپنے کاموں میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مشق کرتے رہتے تھے۔ ایک دن شہریار نے سب کے سامنے پکنک کی تجویز رکھی۔ سب لوگ راضی ہو گئے۔ کھانے پینے کی چیزیں اور متفرقات کی تقسیم ہوئی۔ اور دریا پر پکنک منانے کا پروگرام طے کیا گیا۔ تمام تیاریوں کے ساتھ اسکاؤٹوں کی طرح ——— دوسرے دن شام کو حق اسکواڈ پکنک پر روانہ ہوا۔ دریا کے کنارے خیمہ لگانے کے بعد انہوں نے چائے بنانے کی تیاری شروع کر دی پھر مچھلیاں پکڑنے کا مقابلہ شروع ہوا۔ اس مقابلے کے لئے جاں کو چابک ایک موٹر سائیکل کی آواز خانی دی۔ سب لوگ جھاڑیوں کی آڑ میں لیٹ گئے موٹر سائیکل سوار نے ایک بوری کو دریا میں پھینکا۔ شہزاد اور شہریار یہ معلوم کرنے کے لئے کہ بوری میں کیا ہے۔ دریا میں کود پڑے۔ جب انہوں نے بڑی مشکل سے بوری کو دریا سے نکالا تو انہیں سخت حیرت ہوئی کیونکہ اس بوری میں ایک لڑکا بند تھا۔ وہ بیہوش تھا۔ انہوں نے اس کے پیٹ سے پانی نکالا۔ مصنوعی طور پر سانس بحال کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ لڑکا ہوش میں آ گیا۔ لڑکے نے اپنا نام اختر بتایا۔ حق اسکواڈ کے ارکان نے یقین دلایا کہ وہ اُس کے دوست ہیں تفصیلات کے بعد معلوم ہوا کہ اختر کے ماموں اُس کو پھینک کر گئے تھے۔ اُس نے بتایا کہ اُس کے والدین لاکھوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ جائیداد پر قبضہ کرنے کی خاطر ماموں نے مجھے بوری میں بند کیا اور دریا میں پھینک دیا۔

شہریار نے کہا کہ ہمیں اپنے ماموں کے پاس لے چلو۔ اختر بہت حیران ہوا۔ حق اسکواڈ کے ارکان اختر کے ماموں سے ملنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔

یہ چاروں لڑکے اختر کو بہت پیچھے چھوڑ کر آگے آگے چل رہے تھے اور تیز تیز باتیں کر رہے تھے۔ اختر جو یہاں سے تقریباً دو میل دور تھا، یہ سن کر گھبرا گیا کہ یہ لوگ کون ہیں اور کیا کہہ رہے ہیں۔ وہ ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ جب وہ لوگ ایک بنگلے کے پاس پہنچے تو اختر نے دیکھا کہ یہ بنگلہ اُس کے ماموں کا ہے۔ وہ حیران رہ گیا۔ اختر نے سوچا کہ یہ لوگ ماموں کو پکڑوانے جا رہے ہیں۔ اختر نے ان کو آواز دی۔ وہ لوگ رک گئے۔ اختر نے کہا کہ یہ بنگلہ میرے ماموں کا ہے۔ ماموں جان بہت اچھے آدمی ہیں۔ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوئے یہاں آ گئے ہوں گے۔ اختر آوارہ ہو گیا تھا اس نے بھاگ کر اس کی جائیداد کے کاغذات کس کے پاس ہیں اختر نے بتایا کہ ماموں اپنے بستر کے نیچے وہ کاغذات چھپائے ہوئے ہیں اختر نے کہا۔ ماموں ہر وقت سوتی کی طرح رہے ہوں گے کہ اختر آوارہ ہو گیا تھا اس نے بھاگ کیا ہے اور اس قبیل کی باتیں کر رہے تھے۔ ماموں جان کا کمرہ سڑک کے قریب تھا۔ ماموں جان ممانی جان کو اختر کے بڑھتے کا سارا قصہ سنا رہے تھے انہوں نے کہا کہ اختر اب تک مر چکا ہو گا انہوں نے کہا کہ مر چکا ہے یہی کہنا کہ اختر اپنے کسی آوارہ دوست کے ساتھ بھاگ گیا ہے اُس کو فلموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا ممانی کو یہ معلوم تھا کہ ان کے کام کون کرے گا لیکن ماموں نے کہا کہ ان کی راہ کا کانٹا نکل گیا ہے لیکن اختر زندہ تھا ان باتوں کو ایک کانسٹیبل نے سنا۔ اس میں ایک مرد مورت اور ان کا دو سالہ بچہ تھا انہوں ان کو اقبال جرم کا لفظ دے دی۔ انہوں نے ان کا سکہ مہ ادا کیا اور کہا کہ اگر رات نہ ہوتی تو وہ ان کو ماموں جان کے یہاں چلتے پلاتے۔ اس پر ان صاحب نے کہا مجھے پکڑ لینے کی کوشش نہ کرو میں تمہارے کام آ جاؤں ہوں سپکٹر مسز دیں ہی کے سلسلے سے اندازہ کر لیتا ہوں کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ تم لوگ کل اپنے خاندان سے متعلق کچھ بھی نہ بتانا یوں پھر وہ لوگ گھومتے پھرتے ماموں جان کے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے حتے اسکواڈ ماموں جان کے گھر پر تھا۔ اختر کو قتل کرنے کی سازش کر کے لاکھوں کی جائیداد کا مالک بننے کے خواب دیکھنے والے ماموں کو پتہ نہیں تھا کہ چار خطرناک بہادر اُن کے آنے والے ہیں۔ (اب آگے پڑھیئے)



باہر وہ پانچوں کھڑے تھے

شہریار، سرفراز، شہزاد، منیا اور اختر۔

اور اندر اختر کے ماموں اور ممانی سونے کی تیاری کر رہے تھے۔

" باہر کے دروازے کی کنڈی لگا دی۔" موٹی ممانی نے اپنی سیٹی جیسی آواز میں پوچھا۔

" لگا دی۔" ماموں نے چادر جھاڑتے ہوئے کہا۔

" اندر کے دروازے بند کر دیئے۔؟"

" کر دیئے بابا۔" ماموں نے جھلا کر کہا۔ "کتنی دفعہ پوچھو گی۔؟"

" بات یہ ہے ....." ممانی نے کہا۔ "..... کہ مجھے ذرا ..... ڈر لگ رہا ہے ....."

ماموں نے حیرت سے اپنی ورزنی بیوی کی طرف دیکھا اور اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا؟ کس چیز سے ڈر لگ رہا ہے۔"؟

ممانی نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "اختر سے .....!"

" بیگم۔" ماموں نے دانت پیس کر کہا۔ " اگر تمہارا وزن اتنا زیادہ نہ ہوتا تو میں تمہیں اٹھا کر باہر پھینک دیتا۔ بیوقوف عورت۔ اختر اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ دریا کی تہہ میں اس کی لاش ایک بوری میں بند پڑی ہوئی ہوگی۔ اب اس سے ڈرنے کی بات ہے۔؟"

" بس۔ ایسے ہی۔" ممانی نے کہا۔ " مجھے خیال آگیا تھا ..... کہیں اس کی روح ..... الٰہی خیر ..... کیسے کیسے خیال میرے دماغ میں آرہے ہیں۔"

ماموں نے کہا۔ " یہ دماغ نہیں۔ فضول خیالات کا کچرا خانہ ہے۔ پہلے تم اختر سے پیچھا چھڑانے کو کہتی تھیں۔ اب اس سے پیچھا چھوٹ گیا تو تمہیں اس کی روح کا خیال آگیا ہے۔ لائٹ بند کرو اور سو جاؤ۔"

ممانی نے لائٹ بند کی اور بستر پر جا کر لیٹ گئیں۔

تھوڑی دیر میں ماموں کے خراٹے سنائی دینے لگے۔

ممانی کچھ دیر جاگتی رہیں۔ کچھ پڑھ کر پھونکتی رہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی آنکھیں بھی بند ہونے لگیں۔

اچانک باہر ایک دھماکہ ہوا۔

ممانی نے چیخ ماری۔ ماموں اچھل کر بیٹھ گئے۔

" کیا ہوا۔ کیا ہوا۔" ماموں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

"باہر ....." ممانی نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ "..... وہ باہر ہے ..... اختر..... اس نے مٹکا توڑ دیا ہے ....."

"خدا کے واسطے بیگم۔" ماموں نے غصے سے کہا۔ "بلی نے مٹکا گرا کر توڑ دیا ہوگا۔ اختر کہاں سے آگیا۔؟"

"نہیں وہ اختر ہی ہے۔" ممانی کانپ رہی تھیں۔ "وہ رات کو پانی پینے جاتا تھا اور ہنستے میں ایک مٹکا ضرور توڑ دیتا تھا..... آج پھر اس نے ..... آج پھر....."

"تمہارا دماغ خراب ہوگیا ہے۔" ماموں نے لائٹ جلائی اور دروازہ کھول کر دیکھا۔

صحن میں مٹکا ٹوٹا پڑا تھا۔ لیکن دور دور تک کوئی نہ تھا۔ ہر جانب خاموشی تھی۔

ماموں نے اندر آکر کہا۔ "مٹکا بلی نے ہی توڑا ہے۔ اب آرام سے سو جاؤ۔"

وہ بستر پر لیٹ گئے لیکن ممانی اسی طرح بیٹھی رہیں۔ خوف سے ان کی نیند اڑ گئی تھی۔

وہاں سے کچھ دور ایک پارک کے کونے میں وہ پانچوں بیٹھے تھے۔

"اختر۔" شہریار کہہ رہا تھا۔ "فیصلہ اب تمہیں کرنا ہے۔ تم اپنے ماموں اور ممانی کو گرفتار کرنا چاہتے ہو یا صرف اپنی جائیداد واپس لینا چاہتے ہو۔؟"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" اختر نے کہا۔ "میرا مطلب ہے ..... یہ کس طرح ہوگا۔؟ یعنی اتنی آسانی سے یہ کیسے ہو سکتا ہے۔؟"

"یہ سوچنا تمہارا نہیں، ہمارا کام ہے۔" سرفراز نے کہا۔ "تم صرف سوال کا جواب دو۔"

اختر کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے کہا۔ "میں دونوں چیزیں چاہتا ہوں۔ ماموں ممانی کی گرفتاری بھی اور جائیداد بھی۔ انہوں نے اب تک میرے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ وہ آئندہ بھی یہی کریں گے۔ وہ جائیداد کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ حتیٰ کہ انہوں نے مجھے قتل کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس کی سزا انہیں ضرور ملنی چاہیے۔"

"تمہارا خیال بالکل صحیح ہے۔" شہریار نے کہا۔ "اگر وہ صرف تم پر ظلم کرتے رہتے، تمہیں نوکروں کی طرح رکھتے سارے گھر کا کام تم سے کراتے تو یہ سب برداشت کیا جا سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے ایک جرم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایک جان لینے کا ارادہ کیا ہے۔ جائیداد کے لالچ میں اتنا بڑا قدم اٹھانے والے کو اس کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔" اس نے شہزاد کی طرف مڑ کر کہا۔ "تمہارا کام ہوگیا پورا۔؟"

شہزاد نے جو ٹارچ کی روشنی میں ٹیپ ریکارڈ کے ساتھ ایک اسپیکر جوڑنے اور مختلف تار ملانے میں مصروف

تھا، سر اٹھا کر کہا۔ "بس دس منٹ لگیں گے۔"

اختر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا کر رہے ہو تم۔؟"

شہزاد نے کہا۔ "ماموں کو گانے سنانے کا بندوبست کر رہا ہوں۔ یہ ٹیپ ریکارڈر میں انہیں تحفے میں دوں گا اور وہ اس پر پورے دن گانے سنتے رہا کریں گے۔"

اختر سمجھ گیا کہ شہزاد ابھی یہ بتانا نہیں چاہتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے۔

یہ لڑکے اختر کو ابھی تک عجیب و غریب لگ رہے تھے۔ عجیب و غریب باتیں کرتے تھے۔ عجیب و غریب کام کرتے تھے۔ کوئی جوڈو کراٹے کی بات کرتا تھا، کوئی بجلی کا کام کرتا تھا، کوئی تیز دوڑتا تھا، کوئی باڈی بلڈنگ کرتا تھا۔ جتنے عجیب و غریب ان کے کام تھے، اس سے زیادہ حیرت انگیز ان کا اعتماد تھا۔ وہ بلا کے پھرتیلے تھے۔ انتہائی مستعد اور چاق و چوبند تھے۔

"بھائی ضیا۔" شہریار نے کہا۔

"جی بھائی شہریار۔" ضیا نے جواب دیا۔

"کیا کر رہے ہو۔؟"

"کچھ نہیں۔"

"تو فارغ کیوں بیٹھے ہو۔ ذرا اس انسپکٹر کے گھر ہو آؤ جس نے ہمیں اپنی کار میں لفٹ دی تھی۔"

"انسپکٹر مراد۔" ضیا نے پوچھا۔

"ہاں۔ اسی کے گھر۔" شہریار نے کہا۔ "گھر کا پتہ تمہیں اختر بتا دے گا۔ کیوں اختر۔؟"

اختر نے چونک کر کہا۔ "ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔ لیکن اس کا گھر کافی دور ہے۔"

"کتنی دور۔؟"

"دو میل کے قریب۔" اختر نے کہا۔

ضیا مسکرایا۔ "صرف دو میل۔؟ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔"

اختر نے حیرت سے ضیا کو دیکھا اور بولا۔ "بس بڑی سڑک پر ہم کار سے اُترے تھے۔ اسی پر کوئی دو میل آگے جا کر بائیں ہاتھ پر انسپکٹر مراد کا گھر ہے۔ دو منزلہ مکان ہے۔ گیٹ کے قریب تختی لگی ہوئی ہے انسپکٹر مراد کے نام کی۔"

"سمجھ گئے۔؟" شہریار نے ضیا کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ضیا نے سر ہلایا۔

"تمہیں پتہ ہے کہ تمہیں اس سے کیا کہنا ہے۔؟"

"ہاں۔" ضیا۔ ہنسا۔

"بس تو روانہ ہوجاؤ۔" شہریار نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ "ہم ایک گھنٹے میں تمہیں واپس یہاں دیکھنا چاہتے ہیں۔"

اختر نے حیرت سے ضیا کو بجلی کی طرح روانہ ہوتے دیکھا۔ پلک جھپکتے میں وہ اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ اتنی رفتار سے اس نے کبھی کسی کو دوڑتے نہ دیکھا تھا۔

اسی وقت شہزاد کی آواز آئی۔ "ٹیپ ریکارڈر اور یہ اسپیکر بالکل تیار ہیں۔"

سرفراز ہنسا۔ "دیری گڈ۔ ہر کام وقت پر ہو رہا ہے۔ لگتا ہے آج قسمت ہم پر مہربان ہے۔!"

ماموں کے خراٹے پھر کمرے میں گونج رہے تھے۔

ممانی کی آنکھیں بھی دھیرے دھیرے بند ہوتی جارہی تھیں۔

عین اس وقت جب وہ نیند کی آغوش میں جانے والی تھیں، ان کے بڑے بڑے کانوں میں ایک ہلکی سی آواز آئی۔ انہوں نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔ آواز بند ہوگئی تھی۔ لیکن کچھ دیر بعد وہ آواز پھر آئی۔ یہ کسی کے قدموں کی آواز تھی۔ اور شاید چھت سے آرہی تھی۔ کوئی چھت پر چل رہا تھا۔!"

ممانی نے پھر تیز چیخ ماری۔ اور اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

ماموں پھر ہڑبڑا کر اٹھے۔ لائٹ جلا کر انہوں نے غصے سے پوچھا۔ "اب کس کی روح نظر آگئی ہے۔؟"

"آوازیں ....." ممانی نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ "..... قدموں کی آوازیں..... کوئی چھت پر چل رہا ہے۔!"

ماموں کان لگا کر سنتے رہے۔ ہر طرف مکمل خاموشی تھی۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی۔

"تمہارا دماغ واقعی خراب ہوگیا ہے۔" ماموں نے کہا۔ "اب اگر تم نے چیخ ماری تو میں تمہیں بھی بوری میں بند کر کے دریا میں پھینک آؤں گا۔"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔" ممانی کی آواز کانپ رہی تھی۔ "کوئی چھت پر چل رہا تھا۔"

ماموں نے لائٹ پھر بند کی اور بستر پر لیٹ کر دیوار کی طرف منہ کر کے سو گئے۔

ضیا نے تیسری دفعہ گھنٹی بجائی اور دروازے سے پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوگیا۔

اس مرتبہ گھنٹے قدموں کی آواز آئی اور دروازہ کھل گیا۔

اس کے سامنے انسپکٹر مراد کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے۔؟" اس نے آنکھیں مل کر اسے غور سے دیکھا۔ "تم۔؟ تم یہاں کیا کر رہے ہو رات کے تین بجے۔؟"

"میں آپ کو لینے آیا ہوں۔" ضیاء نے کہا۔

انسپکٹر مراد اب پوری طرح جاگ چکا تھا۔

"کیا مطلب۔؟" اُس نے حیرت سے پوچھا۔

"مطلب میں آپ کو اندر بیٹھ کر ہی سمجھا سکتا ہوں۔"

انسپکٹر مراد نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا اور دروازہ بند کر دیا۔ ایک راہداری سے گزر کر وہ ایک چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ انسپکٹر مراد نے بجلی جلائی اور پنکھا چلا دیا۔

"اب بتاؤ۔" اس نے بیٹھ کر کہا۔ "کیا بات ہے۔؟"

"انسپکٹر صاحب۔" ضیاء نے کہا۔ "آپ کے علاقے میں آج قتل کی ایک واردات ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ قاتلانہ حملہ تو کیا گیا لیکن قتل کرنے کی کوشش کرنے والا اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

انسپکٹر مراد کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"تم جانتے ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔؟" اس نے سنبھل کر کہا۔

"جی ہاں انسپکٹر صاحب۔" ضیاء نے پورے اعتماد سے کہا۔ "اسی لئے تو میں آپ کو لینے آیا ہوں۔"

پھر وہ انسپکٹر مراد کو تفصیلات بتانے لگا۔

رات تیزی سے گزرتی جا رہی تھی۔

ماموں سو چکے تھے۔

اور اب ممانی بھی سو چکی تھیں۔

کہتے ہیں کہ جرم کرنے والا اپنے جرم کی وجہ سے کبھی سکون کی زندگی نہیں گزار سکتا۔ جرم کا خیال اسے ہمیشہ بے سکون رکھتا ہے۔ لیکن یہ مجرم عجیب تھے۔ ماموں اور ممانی نے جائیداد پر قبضہ کرنے کی خاطر چند گھنٹے

پہلے اپنے بھانجے اختر کو دریا میں پھینکا تھا۔ اور اب اطمینان سے سو رہے تھے۔

ماموں کی گہری نیند کا ثبوت ان کے خراٹے تھے۔ ممانی کے سانس لینے سے پوری مسہری ہل رہی تھی۔

سوتے سوتے ممانی کو اچانک یوں لگا۔ جیسے کسی نے ان کی مسہری اٹھالی ہو۔!

انہوں نے خوفزدہ ہوکر آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں اندھیرا تھا لیکن مسہری واقعی ہل رہی تھی۔ بلکہ فضا میں پرواز کر رہی تھی انہوں نے مسہری کو زمین سے چند انچ اوپر اٹھتے اور پھر نیچے آتے محسوس کیا۔

ابھی وہ چیخ مارنے کا ارادہ کر رہی تھیں کہ انہیں ایک آواز سنائی دی۔

ممانی کانپنے لگیں۔

اس آواز کو وہ ہزاروں آوازوں میں پہچان سکتی تھیں۔

یہ وہی آواز تھی۔..... اختر کے ہنسنے کی آواز.....!!

وہ آہستہ سے ہنسا اور پھر خاموش ہوگیا۔

نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ ممانی نے اپنے آپ سے کہا۔ اختر تو مر چکا ہے۔ یہ کوئی اور ہوگا۔ بلکہ میرا وہم ہوگا۔

مگر اختر کے ہنسنے کی آواز پھر آئی۔ صاف اور واضح آواز۔ شک کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔

ممانی نے ریلوے انجن کی طرح پھر چیخ ماری اور ماموں کو گہری نیند سے بیدار کردیا۔

"کیا مصیبت ہے۔" ماموں نے اچھل کر لائٹ جلائی اور ممانی کو گھور کر کہا۔ "اب کس کے چلنے کی آواز آگئی تمہیں۔؟"

ممانی نے کچھ کہنا چاہا۔ مگر خوف سے وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ چند لمحے بعد انہوں نے کہا۔ "میری مسہری..... میری مسہری اڑ رہی ہے۔..... اوپر اٹھ رہی تھی... خدا کی قسم..... میں نے خود دیکھا تھا.... اور وہ اختر.... وہ ہنس رہا تھا..... میں نے خود سنا ہے....." ان کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

ماموں نے انہیں غصے سے دیکھا۔ ابھی وہ کچھ کہنے ہی والے تھے کہ اختر کی ہنسی کی آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ آواز بہت صاف تھی۔

ماموں کی آنکھیں بھی حیرت اور خوف سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

"کیا حال ہیں ماموں جان اور ممانی جان۔" اختر کی آواز کمرے میں گونجی اور وہ دونوں اچھل پڑے۔

اختر کہیں نہ تھا لیکن اس کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔

"جل تو جلال تو۔ آئی بلا کو ٹال تو۔" ماموں نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ اب تک وہ یہی سمجھ رہے تھے کہ ممانی خوامخواہ

خوفزدہ ہیں۔ لیکن اب تو خود انہوں نے بھی اختر کی ہنسی سن لی تھی۔ اس کی گونجتی آواز سن لی تھی۔

"یا میرے مولا۔ کرم کر۔" ممانی نے مسہری پر پڑے ہوئے تکیے کو اپنی گرفت میں لے کر کہا۔ "یا میرے مولا۔ رحم کر۔"

اختر کی آواز پھر کمرے میں گونجی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "میں آپ لوگوں کو اس کامیاب قتل پر مبارکباد دیتا ہوں۔ ایک اور مبارکباد اس بات کی بھی کہ اب آپ اس جائیداد کے مالک بن گئے ہیں۔"

"کون.... کون ہو تم۔؟" ماموں نے لرزتی آواز میں پوچھا۔ آواز نہ جانے کہاں سے آرہی تھی۔

"مجھے بھول گئے ماموں جان۔؟" اختر کی گونجتی آواز نے کہا۔ "میں آپ کا اکلوتا بھانجا اختر ہوں۔ لیکن اب میں زندہ ہی کہاں ہوں۔ میں تو اب صرف ایک روح ہوں۔ میری لاش تو دریا کی تہہ میں پڑی ہوئی ہے۔"

ممانی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ ماموں کے گنجے سر پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔

"میں صرف ایک سوال پوچھنے آیا ہوں ماموں جان۔" اختر کی آواز نے کہا۔ "آپ نے مجھے بیہوش کس طرح کیا تھا۔؟ مجھے تو اس وقت ہوش آیا تھا جب میں دریا میں ڈوب رہا تھا۔ بس، اس سوال کا جواب دے دیجئے۔ ماموں جان۔ میں اسی طرح خاموشی سے چلا جاؤں گا جیسے آپ کی زندگی سے نکل گیا ہوں۔ لیکن اگر آپ نے میرے سوال کا جواب نہ دیا تو پھر میں وہی کروں گا جو ایک روح کر سکتی ہے۔"

"خدا کے..... خدا کے واسطے....." ماموں نے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ "جو پوچھنا ہے.... پوچھو.... لیکن مجھے اور میری بیوی پر رحم کرو..... ماموں اور ممانی یوں کانپ رہے تھے جیسے جاڑا بخار آگیا ہو۔ روح کے انتقام کے تصور سے ہی ان پر لرزہ طاری ہو گیا تھا۔

"صرف ایک سوال ہے ماموں جان۔" اختر کی گونجتی آواز نے کہا۔ "آپ نے مجھے بیہوش کس طرح کیا تھا۔

"دوا..... کے ذریعے....." ماموں کی آواز کانپ رہی تھی۔

"کون سی دوا کے ذریعے....؟"

"بے ہوشی کی دوا..... ہم نے تمہارے دودھ کے گلاس میں بیہوشی کی دوا ملا دی تھی۔"

"پھر۔؟"

"پھر دس منٹ بعد جب.... جب تم بیہوش ہو گئے تو میں نے..... اور تمہاری ممانی نے تمہیں.... بوری میں ڈالا....."

"پھر۔؟" پھر میں اس بوری کو موٹر سائیکل پر لے کر دریا کے کنارے پہنچا....." ماموں کے ہاتھ

کپکپا رہے تھے۔ "پھر۔۔۔؟" "بوری کا منہ بندھا ہوا تھا..... میں اسے دریا میں پھینک کر آ گیا۔"

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔

کچھ دیر بعد اختر کی گونجتی آواز نے پوچھا "آپ نے صرف جائیداد کے لئے مجھے قتل کیا تھا۔؟"

ماموں کوئی بہانہ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر انہیں خیال آیا کہ جھوٹ بولنے کی صورت میں روح انہیں نقصان پہنچا سکتی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "ہاں۔ صرف جائیداد کے لئے۔"

اختر کی روح شاید یہی اعتراف سننا چاہتی تھی۔

جیسے ہی ماموں نے یہ جملہ کہا، دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور انسپکٹر مراد اپنے چار سپاہیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور چہرے پر سختی تھی۔ اس نے کہا۔ "میں تم دونوں کو اقدام قتل کے الزام میں گرفتار کر رہا ہوں۔"

ممانی نے آخری چیخ ماری اور بے ہوش ہو گئیں۔ ماموں کو انسپکٹر مراد نے ہتھکڑی پہنا دی۔

انسپکٹر مراد کے گھر میں وہ پانچوں بیٹھے ناشتہ کر رہے تھے۔

انسپکٹر مراد نے بڑے پر تکلف ناشتے کا اہتمام کیا تھا۔ انڈے، پراٹھے، حلوہ، اچار، مکھن۔ سب ہی کچھ تو تھا۔ گرم گرم چائے بھی تھی۔ خود انسپکٹر مراد کو ضروری کام سے تھانے جانا پڑا تھا اس لئے اب وہاں وہ پانچوں ہی تھے۔

"مت پوچھو بھائیو۔" سرفراز نے کہا۔ "کئی سال سے میں بھاری بھاری وزن اٹھا رہا ہوں۔ لیکن اتنی وزنی عورت کو میں نے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ پہلے تو کمرے میں داخل ہونا بڑا مشکل کام تھا۔ پھر مسہری کے نیچے بیٹھ کر اسے یوں اٹھانا تو بہت ہی مشکل تھا۔ سچ پوچھو تو اس کارنامے میں زیادہ حصہ میرا ہے۔" اس نے اپنی پیٹھ خود تھپتھپائی اور کہا۔ "شاباش۔"

شہریار نے کہا۔ "اصل کارنامہ تو میرا ہے۔ میں ہی چھت پر چڑھا تھا۔ میں نے ہی وہ اسپیکر اور مائیکرو فون اس طرح فٹ کئے تھے کہ اختر کی آواز بھی کمرے تک پہنچ جائے اور ماموں جو کچھ کہیں وہ بھی ریکارڈ ہو جائے۔"

"شہزاد بولا۔" اور یہ مائیکرو فون، یہ اسپیکر جوڑنے کا سارا کام کس کا تھا۔؟"

فیاض نے کہا۔ "اصل کارنامہ اس کا ہے جو انسپکٹر مراد کو لے کر آیا ہے رات کے تین بجے۔"

اختر حیرت سے ان چاروں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے ایک اور حیرت انگیز چیز دیکھی۔

شہریار نے چلا کر نعرہ لگایا۔ "حق اسکواڈ۔" "زندہ باد۔" ان سب کی آواز دور دور تک گونجتی چلی گئی۔

Reshma 222®





دھلائی کیلئے جدید ترین صابن

® 222 ریشماں

میل کاٹنے کیلئے لیموں کے رس
اور آپکے ہاتھوں کی نازک جلد کی
حفاظت کیلئے ناریل کے تیل کی
اضافی خصوصیت کے ساتھ

امین سوپ اینڈ آئیل انڈسٹریز (پرائیویٹ) لمیٹڈ پوسٹ بکس: 4602 کراچی۔ فون: 231343-237856

MASS

ذہنی ورزش

نعیم بلوچ

ملاقات ایک بھوت سے ...



جنوں و بھوتوں کا وجود ہر زمانے میں خوف و دہشت کی علامت رہا ہے۔ اس سلسلے میں ان گنت قصے کہانیاں مشہور ہیں۔ لیکن ان میں اکثر محض جھوٹ اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کچھ لوگ جنوں بھوتوں کو خیالی چیزیں ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس زمین میں انسان کے علاوہ جن بھی ایسی مخلوق ہیں جو عقل اور ذہانت کی مالک ہے۔ جس طرح انسان کو اچھے اور بُرے دونوں کام کرنے کا اختیار ہے، اسی طرح جن بھی نیکی بدی میں آزاد ہیں قرآن نے اس بات کو بڑے صاف لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اس لئے ہمیں یقین ہے کم از کم آپ ان لوگوں سے نہیں ہیں جو جنوں کو نہیں مانتے۔ اب رہا ان سے ڈرنے کا معاملہ، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نظر نہیں آتے اور ہم سے زیادہ جسمانی طاقت کے مالک ہوتے ہیں اس لئے جب ہم کسی چیز کو بغیر کسی سہارے کے حرکت کرتا ہوا دیکھتے ہیں یا کوئی بہت بڑا کام منٹوں میں ہوتا دیکھتے ہیں یا جن جب عجیب و غریب شکلیں بدلتے ہیں تو ہم ڈر جاتے ہیں۔ ویسے ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ جن ہمیں ڈرانے دھمکانے اور ہمارے دلوں میں وہم اور وسوسے پیدا کرنے کے علاوہ ہمیں کوئی اور نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ لہٰذا آپ گھبرایئے مت اور کسی جن یا بھوت سے ملاقات کرنے کے تیار ہو جایئے۔ لیکن بھئی یہ کیا؟

ابھی تو کچھ بھی نہیں ہوا اور آپ کے دل کی اچھل کود کی آواز تو مجھ تک پہنچ رہی ہے! ہمت کیجئے بھئی اور دل کو ذرا مضبوط رکھیئے!

اپنی گھبراہٹ دور کرنے کے لئے ایک گلاس ٹھنڈا پانی پی لیجئے۔ اگر آپ نے اپنے حواس پر قابو پا لیا ہے تو بتایئے!

۱:۔ آج آپ گھر میں اکیلے ہیں، تمام گھر والے کہیں گئے ہوئے ہیں۔ وہ رات گئے واپس آئیں گے۔ آپ اپنے امتحانوں کی وجہ سے ان کے ساتھ نہیں گئے۔ اب رات کے بارہ بج چکے ہیں، لیکن وہ ابھی تک نہیں آئے۔ آپ کو نیند بھی نہیں آ رہی ایسی انتظار میں آپ کو گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے، آپ خوشی خوشی دروازہ کھولنے جاتے ہیں کہ سب لوگ آ گئے ہیں لیکن پھر دروازے پر کوئی نہیں ہوتا۔ تیسری مرتبہ پھر ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ سخت پریشان اور حیران ہوتے ہیں کیا آپ!

(ا) یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کسی چور کی حرکت ہے، جو یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ گھر میں کون ہے اور جاگ رہا ہے یا سو رہا ہے لہٰذا پولیس کو فون کر دیتے ہیں۔

(ب) کسی جن بھوت کی کارستانی سمجھتے ہیں اور آپ کو جتنی بھی قرآنی سورتیں یاد ہیں پڑھنے لگتے ہیں۔

(ج) کسی دوست کی شرارت سمجھتے ہیں اور کسی جگہ چھپ کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ شرارت کون کر رہا ہے۔

(۲) گھنٹی بجنے کے تھوڑی دیر بعد آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے کوئی سایہ سا آپ کے کمرے میں داخل ہوا ہے اس وقت آپ چارپائی پر لیٹے ہوتے ہیں اور کمرے میں بہت مدھم روشنی والا بلب روشن ہے، اس وقت آپ:

(ا) فوراً اٹھتے ہیں اور اپنے ابو کے کمرے میں ان کا پستول لینے چلے جاتے ہیں، کیونکہ آپ کے خیال میں چور ہو یا بھوت اس طرح دونوں سے نبٹا جا سکتا ہے۔

(ب) قرآن کی آخری دو سورتوں (سورہ الفلق، سورہ الناس) پڑھنے لگتے ہیں، اور لائٹ آن کر کے دیکھتے ہیں کہ کمرے میں واقعی کوئی ہے یا نہیں۔

(ج) اپنے کانپتے اٹھتے ہیں اور بہنوں کے گھر چلے جاتے ہیں۔

(د) اسے اپنا وہم خیال کرتے ہیں اور چپکے سے لیٹے رہتے ہیں۔

(۳) اچانک کمرے میں روشنی ہو جاتی ہے آپ دیکھتے ہیں کہ کمرے میں ایک عجیب سی مخلوق کھڑی ہے، اس کے دو بڑے بڑے کان، دو آنکھوں کے بجائے، ماتھے پر ایک ہی آنکھ، سر پر دو سینگ، لمبے لمبے نوکیلے سے دانت، جو آپ کی طرف دیکھ کر ــــ نکال رہا ہے، اور ایک لمبی سی دم ہے۔ یہ منظر دیکھ کر آپ: (دل پر ہاتھ رکھ کر سچ سچ بتایئے!)

(ا) زوردار چیخ مار کر بیہوش ہو جاتے ہیں۔

بڑے خوش ہوتے ہیں کہ زندگی میں پہلی مرتبہ کسی جن بھوت سے ملاقات ہوئی ہے۔ لہٰذا جن صاحب

سے بڑے اخلاق سے تشریف رکھنے کو کہتے ہیں، اور پھر باقاعدہ گپ شپ لگانا شروع کر دیتے ہیں۔

(ج) کسی کی شرارت سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ کسی نے آپ کو ڈرانے کے لئے یہ حلیہ بنایا ہے۔ لہٰذا اسے مزا چکھانے کے لئے، میز پر پڑا پیپر ویٹ اس کو کھینچ مارتے ہیں۔

(د) اس مخلوق کو کسی دوسرے سیارے کی مخلوق سمجھتے ہیں اور اس کو پکڑوانے کے لئے فوراً پولیس کو فون کرنے کے لئے لپکتے ہیں۔

(ر) آپ اسے کسی دوست کی شرارت ہی سمجھتے ہیں، لیکن اس کا سر پھاڑنے کے بجائے کسی ترکیب سے اس کا اصل چہرہ پہچاننے کی کوشش کرتے ہیں۔

(ہ) آپ خود ہی بات چیت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں یا جن صاحب آپ کا ڈر دور کر کے آپ کو گفتگو کرنے پر آمادہ کرتے ہیں، کوئی بھی صورت پیش آئی، آپ جن صاحب سے خوب گپ شپ لڑاتے ہیں۔ آخر میں جن صاحب آپ سے کہتے ہیں کہ آپ کوئی سی ایک خواہش کریں، وہ اسے ضرور پورا کریں گے، تو آپ:

(و) یہ خواہش کرتے ہیں کہ الہ دین کے چراغ کی طرح آپ کو کوئی چیز دے دی جائے، تاکہ جب بھی آپ کو بہت ساری دولت ضرورت ہو جن صاحب آپ کی مدد کو حاضر ہو جائیں۔

(ب) کہتے ہیں کہ آپ کو بہت ساری دولت لا کر دی جائے۔ تاکہ آپ ساری زندگی آرام سے بسر کر سکیں اور والدین اور دوسرے لوگوں کی بھی مدد کر سکیں۔

(ج) جن صاحب کا بہت شکریہ ادا کرتے ہیں اور ان سے گزارش کرتے ہیں کہ وہ آئندہ کسی کو اس طرح شرفِ ملاقات نہ بخشیں گے کیونکہ ہو سکتا ہے کسی کا ڈر کے مارے دل ہی بند ہو جائے۔ جن صاحب کے مزید اصرار پر آپ اُن کی خدمت میں عرض کرتے ہیں کہ میں انسان ہوں، اپنے کام خود کرنا بہتر خیال کرتا ہوں، لہٰذا میں آپ سے کوئی فرمائش نہیں کروں گا۔

(د) جن سے کہتے ہیں کہ وہ آپ کو ساری کتابیں زبانی یاد کرا دے تاکہ پڑھنے کی مصیبت سے آپ کی جان چھوٹے اور آپ امتحان میں بھی اعلیٰ پوزیشن حاصل کر سکیں۔

(ر) یہ فرمائش کرتے ہیں کہ آپ کے اندر اتنی طاقت پیدا کر دے کہ آپ جس کسی کی بھی مرمت کرنا چاہیں، آرام سے اس کو چھٹی کا دودھ یاد دلا سکیں۔ آپ کا خیال ہے آپ یہ طاقت بدمعاشوں کے خلاف استعمال کر کے ان کو خوب مزا چکھا سکیں گے۔

(س) جن صاحب سے بڑے پُرزور انداز سے کہتے ہیں کہ وہ پاکستان اور اسلام کے دشمنوں کو ختم کر دے۔

اب جناب آپ اپنے منتخب کردہ کاموں کے نمبر اسکور بورڈ کے خانے میں دیکھیں اور ان کو جمع کر کے دیکھیں کہ آپ

کا شمار کن لوگوں میں ہوتا ہے۔

نتائج

۱۵ تا ۲۰ : بہت خوب! آپ نے جن یا بھوت صاحب سے کامیاب ملاقات کی۔ اب اگر ان سے آپ کی ملاقات ہو تو ہمارا سلام ضرور عرض کیجئے گا۔

۸ تا ۱۴ : اگر آپ کسی دوست کے ساتھ مل کر ہیں تو زیادہ بہتر ہوگا۔

۸ سے کم : آپ سے ملاقات کے بعد امید ہے کہ جن صاحب اس کے بعد کسی انسان سے ملنے کی جسارت نہیں نہیں کریں گے کیونکہ وہ اپنے سر آپ جیسے انسانوں کے خون کا گناہ کیوں لیں۔

اسکور بورڈ

① و : ۲ ب ہفرج : ۵ ② و : ۴، ب : ۵، ج ہفرد : ۳۔ ③ و : ۲ (سچ بولنے پر)، ب : ۲ ج ہفرد : ۵۔ ④ و ہفر، ب ہفرج : ۵، د ہفرو ہفرس : ۵

چاند میں داغ

آپ نے راتوں کو دیکھا ہوگا، چاند پر دھبے (دھبے سے نظر آتے ہیں، غور سے دیکھنے پر ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے یہ کسی انسان کا منہ، ناک اور آنکھیں ہوں، پرانے زمانے کے سائنسدانوں کا خیال تھا کہ یہ دھبے سمندر ہیں، لیکن اب سائنسدان کہتے ہیں کہ چاند پر پانی نہیں ہے، یہ کالے دھبے اصل میں لمبے چوڑے میدان ہیں۔ سب سے وسیع میدان چھ سو میل کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔

فلسفی بیل

ایک فلسفی بازار سے گزر رہا تھا اس نے کولہو چلتے دیکھا۔ وہاں بیل کے گلے کی گھنٹی بج رہی تھی، اُسے اس گھنٹی کا مقصد سمجھ میں نہیں آیا، تو کھڑے ہو کر سوچنے لگا، کولہو کے مالک نے فلسفی کو سوچ میں ڈوبا دیکھا تو بولا "کیا سوچ رہے ہو" فلسفی نے کہا "بیل کا چلنا تو ٹھیک ہے مگر آخر اس گھنٹی کا کیا مطلب ہے" کولہو کے مالک نے کہا "یہ اس لئے کہ اگر بیل رک جائے گا، تو گھنٹی بھی بجنا بند ہو جائے گی اور ہم جان لیں گے سو پھر ہنکا دیں گے، فلسفی نے یہ سن کر کہا "تمہاری بات تو ٹھیک ہے لیکن فرض کرو تم اندر ہو اگر بیل ایک ہی جگہ کھڑے ہو کر سر ہلاتا رہے تو پھر؟" کولہو کے مالک نے جواب دیا "جناب یہ بیل ہے، فلسفی نہیں؟"

a great new taste

mayfair **Fruta Chew**

Chew it,
you'll love it.





mayfair – the sweet favourites

سچ مچ کا شہزادہ

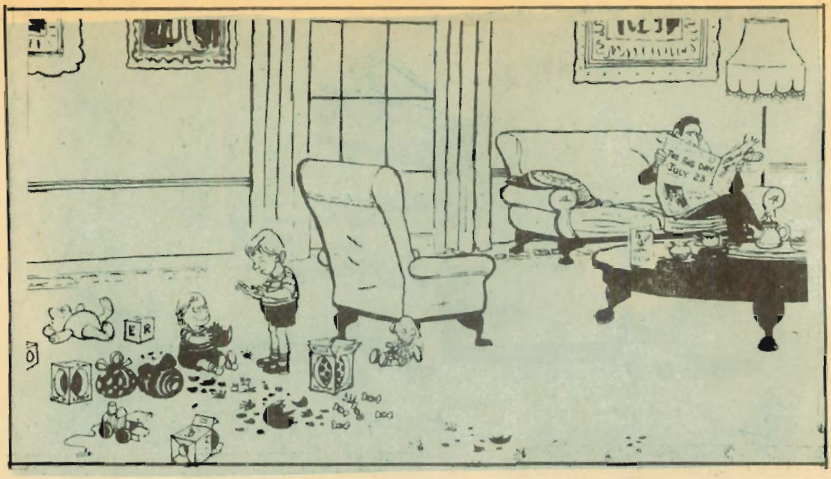
آپ نے قصے کہانیوں میں شہزادوں کی زندگی سے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سنا ہوگا۔ شہزادوں کی پیدائش پر کتنی خوشیاں منائی جاتیں ان کی تربیت کے لئے اتالیق اور اساتذہ مقرر کئے جاتے۔ قدم قدم پر ان کے ناز نخرے اٹھائے جاتے اور ان کی پوری زندگی عیش اور آرام کے ساتھ گذرتی..... یہ سب باتیں تو تھیں ان شہزادوں کی جن کا ذکر کہانیوں میں آتا ہے۔ آپ شائد یہ سمجھتے ہوں کہ اب اس طرح کے شہزادے باقی نہیں رہے..... ایسا نہیں ہے..... شہزادے گو بہت کم ہو گئے ہیں لیکن آج بھی دنیا میں موجود ہیں اور اسی طرح کی ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ زندگی گذار رہے ہیں یہاں ہم آپ کی ملاقات جس شہزادے سے کروا رہے ہیں یہ برطانیہ کے ننھے شہزادے ولیئم ہیں۔ ان کے ابو کا نام شہزادہ چارلس اور ان کی امی کا نام شہزادی ڈیانا ہے۔ پانچ سالہ شہزادہ ولیئم ذہین بھی ہیں اور شرارتی بھی..... شرارتی تو یہ اس قدر ہیں کہ جب تک دن میں دو چار شرارتیں نہ کرلیں انہیں چین نہیں آتا۔ گذشتہ سال جب ان کے چچا اینڈریو کی شادی ہو رہی تھی تو اس تقریب میں شرارتوں کے ذریعے سب سے زیادہ شہرت حاصل کرنے والی ننھی منّی شخصیت بھی انہی کی تھی عین اس وقت جب پادری ان کے چچا اینڈریو کا نکاح پڑھا رہا تھا۔ شہزادہ ولیئم محل کی بالکونی سے چھلانگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کی امی ڈیانا اور ان کی پھپھی شہزادی این ان کو بار بار پکڑ رہی تھیں ولیم کے ابو شہزادہ چارلس تو ان کی شرارتوں سے بہت تنگ آئے ہوئے ہیں ان کا کہنا ہے کہ محل میں موجود قدیم نایاب اور قیمتی کتابوں کو ولیئم چبا ڈالتا ہے۔ اپنے جوتے اور موزے عموماً غسل خانے میں چھوڑ آتا ہے اور ہر وقت گھڑی کا الارم بجاتے رہتا اس کا محبوب مشغلہ ہے..... اپنے اسکول میں بھی اب تو شہزادہ لڑاکا کے نام سے مشہور ہونے لگا ہے بلکہ بعض بچے تو اس کی شرارتوں سے تنگ آکر اسے "جنگلی ولیئم" بھی کہنے لگے ہیں











شہزادے ولیم کی شرارتیں کارٹونسٹ کی نظر میں



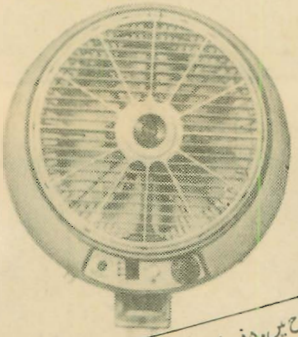
شہزادہ
ولیم اپنی
دادی اماں سے
شرارتیں کرتے ہوئے

انڈس
واٹر کولرز

پاکستان میں پہلی مرتبہ
آسٹرو پاک

کلیپر فین

برقی پنکھوں کی ٹیکنالوجی میں آسٹریلین
سائنس کی اختراعی پیشکش
آپ کے حکم کے تابع۔ بغیر ہاتھ لگائے
حکم کریں پنکھا چلے
حکم کریں پنکھا رُکے
وال/ٹیبل/پیڈسٹل فین کے بطور
استعمال کیا جاسکتا ہے۔



* بجلی کے خرچ میں ۵۰ فیصد بچت * بغیر معمولی ہلکا پنکھا
* شاک پروف * انتہائی خوشنما * اسٹریملائینڈ باڈی
* بے حد پائیدار * زنگ سے محفوظ۔ آواز سے مبرا
* متحدد پائیدار رنگوں میں دستیاب
* تحفے تحائف میں دینے کے لئے بے نظیر



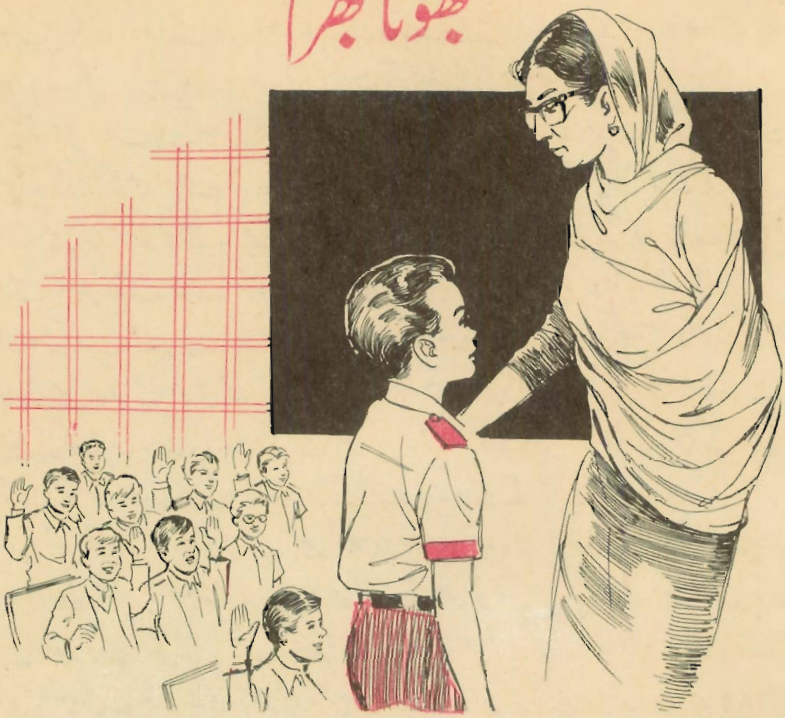
ایک سال کی گارنٹی
کوئی شکایت ہو تو فون 233667
کر کے فوری ہوم سروس
حاصل کیجئے۔

البرخت پاکستان (پرائیویٹ) لمیٹڈ
پہلی منزل، نسروانجی بلڈنگ، مچھی میانی روڈ، کراچی۔ فون: ۲۳۳۶۶۷

MASS

ذیشان بن صفدر

جھوٹا بھرم



کاشف نہایت حیرت و تعجب سے اپنے ان ساتھیوں کو دیکھ رہا تھا جن کے ہاتھ بڑی بیقراری سے فضا میں لہرا رہے تھے۔ خود اُسے اپنے آپ پر شرمندگی محسوس ہو رہی تھی کہ وہ کلاس کے اُن دس نالائق لڑکوں میں سے ایک تھا جن کے ہاتھ ہوم ورک نہ کرنے کی وجہ سے بلند نہیں ہوئے تھے۔

پھر اُس کی نظر اشرف کی طرف اُٹھ گئی .. وہ بھی لبوں پر مسکراہٹ سجائے بڑی بے چینی سے اپنا ہاتھ ہلا ہلا کر کہہ رہا تھا "مس میں دکھاؤں، مس میں دکھاؤں .... پھر اشرف کا وہی ہاتھ اس کی نظروں میں دُھند لانے لگا، اور اُسے کل شام کا واقعہ یاد آگیا۔

"ہیلو کاشف، کیا ہو رہا ہے"۔۔۔ اشرف نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا

"چلو کرکٹ نہیں کھیلو گے آج ...." اس نے نہایت شگفتگی سے پُوچھا۔ "نہیں بھائی .... آج

کھیل کا وقت قطعی نہیں مل سکے گا... ۱۵ سوالوں کے جوابات یاد کرنے ہیں۔ حساب اور انگلش کا بھی خاصا ہوم ورک ہے"۔ اُس نے نیم دِلی سے جواب دیا... "ارے چھوڑو یار..... یہ سوالوں کے جواب یاد کرنا، ہوم ورک نمٹانا آج ایک دن کی بات تو ہے نہیں... روز کا ہی دردِ سر ہے.... چھوڑو.... کچھ دیر کھیل لو... پھر ہوم ورک کر لینا"... کاشف نے چہکتے ہوئے کہا... "نہیں بھائی.... مجھے تو آج معاف ہی رکھو... بقول تمہارے اگر ہوم ورک روز، روز کا دردِ سر ہے تو کھیل بھی تو روز آنا ہی ہوتا ہے.... اگر آج نہیں کھیلا تو کیا ہو جائے گا، اُس نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا، "دیکھ کاشف، کھیلنے سے دماغ فریش ہو جاتا ہے اور فریش دماغ سے ہوم ورک بالکل ٹھیک ٹھاک ہوتا ہے۔ چل چھوڑ، کتابوں کا پیچھا، باہر دانش، انور، محمود، مجید اور راشد کھڑے انتظار کر رہے ہیں"۔ اشرف نے پھر زور دے کر کہا اور اِسے کھینچتا ہوا باہر لے جانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ جب کھیل جَما تو کسی کا دل بھی نہ چاہا کہ وہ درمیان ہی میں چھوڑ کر گھر چلا جائے۔ سات بج گئے۔ مگر کھیل اختتام کو نہ پہنچا.... کاشف ان کے ساتھ شریک تو تھا مگر بے دلی کے ساتھ، اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں تھے۔

کھیل ختم ہوا تو پورا گروپ قہقہے لگاتا، کھیل پر تبصرہ کرتا کالونی کے کولڈ ڈرنک اسٹاپ میں جا بیٹھا، کسی نے آئسکریم منگالی اور کسی نے کولڈ ڈرنک لینا پسند کی۔ یوں خوش گپیوں میں خاصا وقت نکل گیا۔ اشرف قہقہے لگاتے ہوئے اُس سے کہہ رہا تھا "کیوں بھئی کاشف مزہ آیا کھیل کے بعد ٹھنڈی، ٹھنڈی بوتل پینے کا، ہوم ورک کرنے سے بھلا کہاں یہ مزہ؟..."

وہ اپنے تصوّرات میں گم تھا کہ اچانک مس کے سوال نے اُسے چونکا دیا۔ وہ اُس سے ہوم ورک نہ کرنے کا سبب دریافت کر رہی تھیں۔ وہ سٹ پٹا کر رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا جواب دے۔ آخر اس کی زبان سے سچ ہی نکل گیا "جی... مس.... وہ کل میں کھیلنے چلا گیا تھا۔ پھر دوستوں کے ساتھ کچھ اور وقت یوں ہی گزار دیا۔ رات کو کرنے بیٹھا تو لائٹ چلی گئی۔ جو شاید میرے سو جانے کے بعد واپس آئی.."

وہ غصّے میں ڈانٹ کر بولیں، "شرم نہیں آتی یہ کہتے ہوئے..... کھیل اور دوست کام آئیں گے تمہارے مستقبل میں۔ اپنا بھلا بُرا بھی نہیں سمجھ سکتے....."

کاشف کے کان احساس ندامت سے سُرخ ہو گئے۔ کاٹو تو جیسے بدن میں لہو نہیں رہا،

اُسے محسوس ہو رہا تھا گویا ساری کلاس اِس کو طنز آمیز نظروں سے دیکھ رہی ہے....."

کچھ دیر بعد پیریڈ ختم ہوگیا۔ اس کے ساتھ ہی انٹرول ... سارے لڑکے ہنسی خوشی کلاس سے باہر نکلنے لگے۔ وہ اُٹھ کر اشرف کے پاس پہنچا "یار اشرف، کل تم ہی تو مجھے اپنے ساتھ کھیلنے لے گئے تھے اور ساتھ ہی ایک دوسرے سے رُخصت ہوئے تھے۔ لائٹ بھی سارے محلّے کی ایک ہی وقت میں گئی تھی... پھر تم نے ہوم ورک کب کیا تھا...." اشرف اِس کے سوال پر مُسکرادیا۔

" کیا اپنے بھائی جان سے کرایا تھا۔"؟ اُس نے پھر پوچھا.... اشرف نے انکار میں سر ہلادیا " کلاس میں کسی ساتھی کی کاپی سے نقل کی تھی؟" اُس نے دوسرا سوال کیا "نہیں" مختصر جواب ملا.... اب اُس کی حیرانی بڑھتی جارہی تھی "یار چکّر کیا ہے.... تم نے خود ہوم ورک کیا نہیں..... بھائی جان سے کرایا نہیں، نہ ہی اسکول آکر کسی ساتھی کی کاپی سے مدد لی، پھر آخر تم نے ہوم ورک کب اور کیسے کرلیا...."؟ "یار کاشف ....تم تو بس نام کے ہی کاشف ہو۔ میں نے کب کہا کہ میں نے ہوم ورک کرلیا تھا" اشرف بے تکلفی سے ہنستے ہوئے بولا..." پھر... پھر تم نے مِس کے سوال کرنے پر کہ جن جن لڑکوں نے ہوم ورک پورا کرلیا ہے وہ اپنا ہاتھ اُوپر اٹھالیں کے جواب میں ہاتھ کیوں اٹھالیا تھا..."؟ کاشف نے کسی وکیل کی طرح جرح کی...

" سب لڑکوں نے ہاتھ بلند کئے تو میں نے بھی اپنا ہاتھ کھڑا کردیا" وہ مسکرا کر بولا..." میرا ہاتھ کلاس کے پینتیس لڑکوں کی اکثریت کے ساتھ شامل تھا.... دیکھو بھئی کاشف، اچھا طالب علم ہونا اور بات ہے اچھا طالب علم ظاہر کرنا اور... اگر میں دوسرے ہونہار طلباء کے ساتھ اپنا ہاتھ بلند کرکے مس کی نظروں میں اچھا طالب علم بن گیا تو اُس میں حیرت کی کیا بات ہے.. کون سا پہاڑ ٹوٹ پڑا آخر"... اُس نے یہ سب اتنی بے پروائی سے کہا جیسے یہ کوئی معمولی بات ہو... کاشف کی پیشانی توہین کرہی عرق آلود ہوگئی اُس نے پسینہ رومال میں جذب کرتے ہوئے افسردگی سے پوچھا" پہاڑ تو خیر کوئی نہیں ٹوٹ پڑا، مگر تمہیں خود اس سے کیا حاصل ہوا۔"

اشرف کا قہقہہ پھر بلند ہوا" حاصل.... ارے یہ کیا کم بات ہے کہ کلاس میں شرمندگی سے سر جھکانے سے بچ گیا، ذلّت کا کڑوا گھونٹ نہیں پینا پڑا اور مس کی نظروں میں ایک محنتی اور اچھا طالب علم قرار پایا..." وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا..

کاشف پھر سوچ میں ڈوب گیا.. حد ہوگئی شرافت کی۔ یہ تو سراسر بہروپیہ پن ہے...

انسان جو کچھ ہے نہیں اس کے ہونے کا سوانگ کیوں بھرے، اس کا اظہار کیوں کرے... اس کی اداکاری کیوں کرے... پھر وہ دھیرے سے بولا "اچھا اشرف، جو ہونا تھا سو ہوگیا۔ ہوم ورک تو کرنا ہی ہے۔ آج کاپیاں چیک نہیں ہوئیں کل ہوں گی۔ اب کیا پروگرام ہے.. کل بھی کاٹھ کی ہانڈی چڑھاؤ گے.. مگر یاد رکھو، کاٹھ کی ہانڈی چڑھے نہ دوجی بار...."

اب اشرف سنجیدگی سے بولا "ہاں یہ خوب یاد دلایا۔ مگر سوال تمہیں ہی سمجھانے ہوں مجھے..." "ٹھیک ہے، شام کو گھر آجانا، ابّو سے سمجھ لیں گے۔ وہ تو کل سمجھا رہے تھے۔ مگر تمہاری باتوں میں آکر میں رہ گیا۔"

سوال کسر اور تجارتی نوعیت کے تھے۔ کاشف کے ابّو نے کہا "بیٹے ایسے سوالوں کو کم از کم وقت میں حل کرنے کے لئے پہاڑے یعنی ٹیبل یاد رکھنا بہت ضروری ہیں۔ تمہیں کہاں تک یاد ہیں یہ سوال انہوں نے کاشف سے کیا تھا، مگر اشرف جھٹ بول پڑا، انکل مجھے بیس تک پہاڑے یاد ہیں.... بہت خوب.... شاباش بیٹے شاباش انہوں نے اشرف کو شاباشی دیتے ہوئے کاشف کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ دھیرے سے بولا، ابو... مجھے بارہ تک ٹیبل یاد ہیں۔ اسی دوران اُن کے پاس کئی ملاقاتی آگئے اور وہ کاشف کو قہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے ان کی طرف متوجہ ہوگئے، جیسے وہ نظروں ہی نظروں میں اُس سے کہہ رہے ہوں کہ ڈوب مرو، تمہارے ساتھی کو بیس تک پہاڑے یاد ہیں اور تمہیں صرف بارہ تک....

کاشف ایک بار پھر خون کے سے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ حد ہوگئی جھوٹ کی... یہ اپنا امیج بنانے، دوسروں کی نظروں میں خود کو اچھا بنوانے کے چکر میں جھوٹ کیوں بولتا ہے... اگر کہیں کسی دن ساری پول کھل گئی تو بنا بنایا بھرم پل بھر میں کھل جائے گا، اس میں شک نہیں کہ اشرف ایک اچھا دوست ہے۔ پڑوسی ہے، اس کا خیال بھی رکھتا ہے مگر اس کا یہ جھوٹا امیج.... کب تک قائم رہے گا۔ وہ سوچتا رہا اور خاموشی سے اپنا کام نمٹاتا رہا...

اگلے دن کلاس میں میتھیمیٹک کے ٹیچر نے نئی مشق کا ایک سوال تفصیل سے سمجھانے کے بعد دریافت کیا، آپ سب اچھی طرح سمجھ گئے..... اگر کوئی لڑکا نہ سمجھ سکا ہو تو بلا تکلف دوبارہ سمجھ لے... کاشف فوراً اپنی جگہ کھڑے ہوکر بولا، سر دوبارہ سمجھا دیں میں پوری طرح نہیں سمجھ سکا ہوں۔ انہوں نے پھر اپنی بات دُہرائی کہ دیکھئے اور جس کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہو وہ بھی کھڑا ہوجائے

اس میں شرمانے یا جھجکنے کی ضرورت نہیں .... اب کچھ اور لڑکے کھڑے ہو گئے .... بس یا اور کچھ لڑکے شرم سے نہیں بتا رہے ہیں، پھر سمجھاتے ہوئے بولے ، دیکھئے میرا فرض ہے کہ جو بات آپ کی سمجھ میں نہ آئے اُسے بار ، بار دُھراؤں ، سمجھاؤں، میں ایک بار پھر اپنا سوال دُھراتا ہوں ، واقعی اتنے لڑکے ہیں جن کو یہ سوال سمجھ میں نہیں آ سکا ہے .... ؟ یا اور بھی ہیں .. اس بار کلاس کے اسّی فیصد لڑکے کھڑے ہو گئے۔

اب انہوں نے ان لڑکوں کی طرف ایک معنی خیز مسکراہٹ سے دیکھا جو بیٹھے رہ گئے تھے اس کا مطلب یہ ہوا کہ انہوں نے سوال اچھی طرح سمجھ لیا ہے ... ایک ایک لڑکے پر سے ہوتی ہوئی اُن کی نظر اشرف پر آن کر مڑ گئی .. اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، کان کی لو جلنے لگی، اور آنکھوں کے سامنے ترمرے سے رقص کرنے لگے۔ پھر انہوں نے کہا، اشرف آپ بلیک بورڈ پر اسی سوال کو دوبارہ حل کر کے اپنے ساتھیوں کو سمجھائیں .... یہ سن کر اُسے کلاس روم گھومتا ہوا سا محسوس ہونے لگا۔ اُسے ذرہ برابر بھی گمان نہیں تھا کہ بات بڑھ کر یہاں تک پہنچ جائے گی۔ آیئے بیٹے، اشرف میاں... آپ تو کلاس کے سب سے اچھے طالب علم ہیں۔ اپنے ان ساتھیوں کی مدد کریں جو سوال نہیں سمجھ سکے ہیں ماسٹر صاحب نے بڑی شفقت اور نرمی سے کہا..... مگر اس کے قدم من، من بھر کے ہو گئے کلاس کے اسّی فیصد لڑکوں کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

ماسٹر صاحب دھیرے، دھیرے چلتے ہوئے اس کی سیٹ تک آئے اور پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے بولے۔ شاباش بیٹے شاباش... آیئے کوئی بات نہیں جھجکنے کی.. آپ تو ذہین طالب علم ہیں آئیں ... مگر اشرف کی آنکھوں میں نمی دیکھ کر حقیقت سمجھنے میں اُنہیں دیر نہ لگی.... پھر وہ اُسے سمجھاتے ہوئے بولے، کوئی بات نہیں، ایسا ہو جاتا ہے .. مگر یاد رکھو، بیٹے کہ جھوٹا بھرم زیادہ دیر قائم نہیں رہتا.... تم سب یہاں پڑھنے آئے ہو، سیکھنے آئے ہو، تمہاری ذمہ داری ہے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے دوبارہ، سہ بارہ پوچھو، اور میرا فرض ہے کہ میں تمہیں بار بار سمجھاؤں۔ مجھے امید ہے کہ جو بات سمجھ نہ آئے وہ آئندہ نہیں چھپاؤ گے اور اشرف کو محسوس ہوا جیسے کسی نے اُسے چوری کرتے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہو، اُس نے دل ہی دل میں عہد کر لیا کہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔





حبیب بینک ایک ترقی پسند، متحرک، جدید بینک ملک کے اندر ۱۸۰۰ سے زیادہ اور بیرونِ ملک ۶۹ شاخوں، ۱۸۰۰ سے زیادہ غیر ملکی نمائندوں، کمپیوٹر تنصیبات، نت نئی اسکیموں اور سہولتوں کے ذریعے ملک کے مستقبل کے لئے حتی المقدور کوشاں ہے۔
ہماری بچت کی اسکیمیں اور طالب علموں کا خصوصی شعبہ بچوں اور طالب علموں میں بچت کی عادت ڈالنے کے لئے ہر وقت سرگرم عمل ہے۔
حبیب بینک ملک کی ترقی و خوشحالی کے لئے نئی نسل کی سرپرستی کرتا ہے۔

حبیب بینک لمیٹڈ

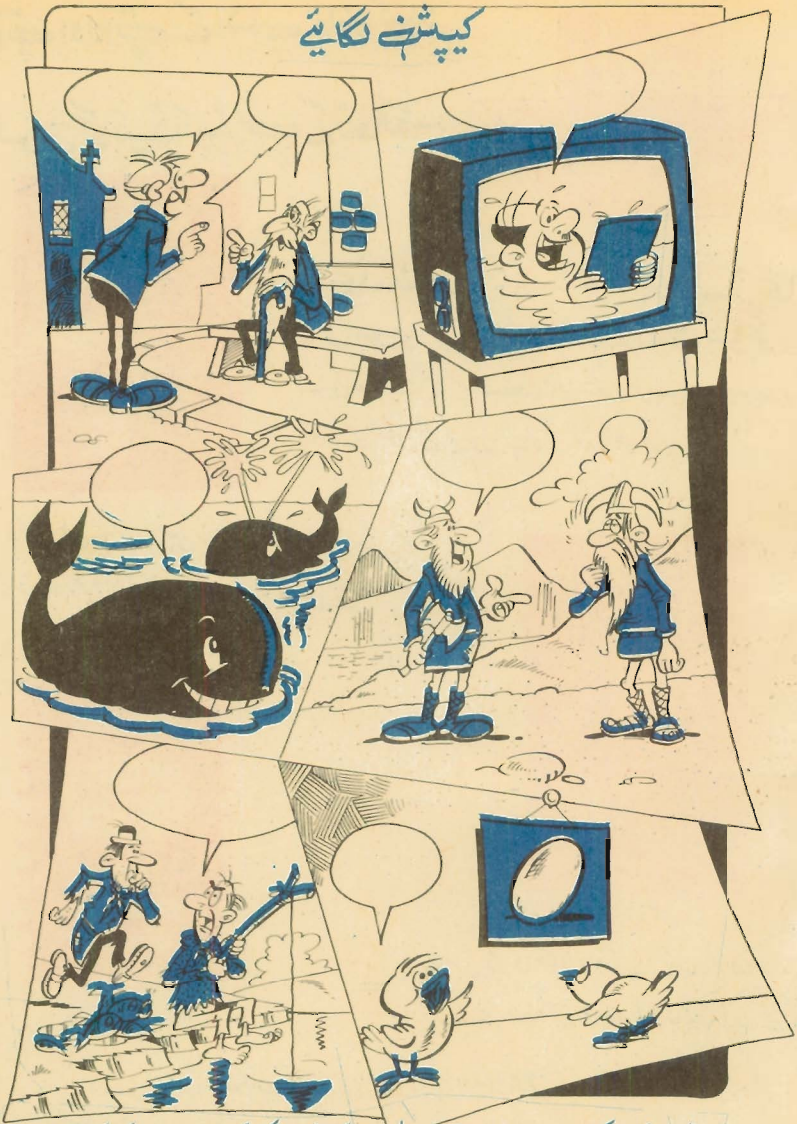
ہم ان کے درخشاں مستقبل کے خواہاں ہیں!

حبیب بینک لمیٹڈ
قائم شدہ ۱۹۴۱

PLD (I)/HBL/80/1 U

manhattan international

کیپشن لگائیے



کارٹون آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر دلچسپ کیپشن لگائیے اور ۲۰ جولائی تک ہمیں بھجوا دیجئے۔ بہترین کیپشن پر ہم ۶ ماہ کے لئے آنکھ مچولی مفت جاری کر دیں گے! دستمبر ۱۹۸۷ء کے شمارے میں نام اور کیپشن بھی شائع کریں گے (ادارہ)

آپ اور آپ کے اہلِ خانہ کیلئے

راھنما کتابیں

گرین گائیڈ اکیڈمی کے تحائف



اِن کا مطالعہ —— علم بڑھائے گا
اِن کی موجودگی —— مفید ثابت ہو گی

قرآنی حکایات کا ۱۰۴ صفحات پر مشتمل خوبصورت مجموعہ ۔
اس کے حصول کے لئے ۱۰ روپے کا منی آرڈر بھجوائیں



خاکِ وطن سے سرزمین حرم تک، معلومات بھی راھنمائی بھی
حجاج اور زائرین کے لئے نادر تحفہ ۔ ۲۰۳ صفحات



اسلام کی بنیادی معلومات جو آپ پر سیکھنا لازم اور سکھانا
کارِ ثواب ہے ۔ مولانا مفتی کفایت اللہ کی تالیف (چار حصے)

سفرِ مبارک اور تعلیم الاسلام مفت حاصل کرنے کے لئے کتاب ۲ روپے کے ڈاک ٹکٹ بھجوائیں ۔ رقم یا کم ڈاک ٹکٹ قابل قبول نہ ہوں گے

کتاب منگوانے کے لئے اپنے پتے پر خط لکھیں ۔

گرین گائیڈ بک سیریز گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۱۲ ڈی ۔ سائٹ کراچی ۱۶

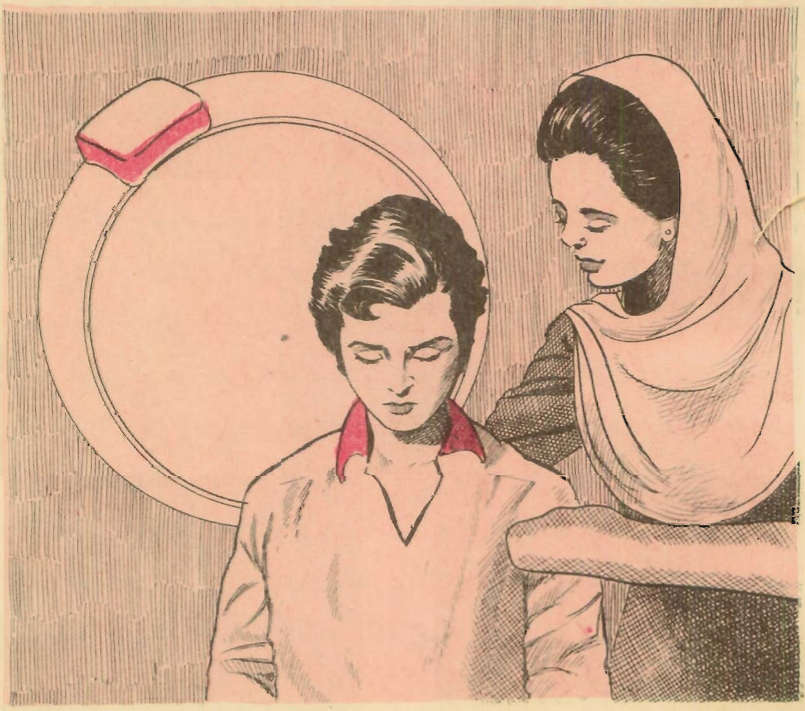
پروفیسر عنایت علی خان

انعام یافتہ کہانی

مامتا

عبدالرحمٰن ایک نیک اور محنتی طالب علم تھا۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس کے والد کی معمولی تنخواہ تھی مگر خاندان کے تینوں افراد فضول خرچی سے بچنے کے لیے سیدھے سادھے طریقے سے گزر اوقات کرتے تھے چنانچہ دن اچھی طرح گزر رہے تھے۔ عبدالرحمٰن کی انجنیئرنگ کی تعلیم ختم ہونے میں بس ایک سال باقی رہ گیا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ سال بھر بعد وہ انجنیئر بن کر اپنے والد کو سہارا دینے کے قابل ہو جائے گا۔

کرنا خدا کا کیا ہوا کہ عبدالرحمٰن کے والد بیمار ہوئے۔ شروع میں معمولی بخار تھا مگر بیماری طول پکڑتی گئی۔ افاقے کے بجائے مرض میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا اور ایک دن وہ اُسے اور اسکی والدہ کو روتا چھوڑ کر



اللہ میاں کے گھر سدھار گئے۔

عبدالرحمٰن کو ایک تو والد کی موت کا بے حد صدمہ تھا۔ دوسرے اُسے یہ فکر کھائے جاتی تھی کہ اب پڑھائی کے لئے پیسہ کہاں سے آئے گا۔ اُس نے اپنی والدہ سے کہا کہ میں پڑھائی چھوڑ کر کہیں نوکری تلاش کروں، لیکن اس کی والدہ نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ وہ سینے پرونے میں مہارت رکھتی تھیں۔ چنانچہ انہوں نے کپڑے سینے شروع کر دیئے اور کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر گزارہ ہونے لگا۔

عبدالرحمٰن جب اپنی ماں کو رات گئے مشین پر کپڑے سیتے دیکھتا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ پڑھائی سے طبیعت اُچاٹ ہو جاتی۔ اس کی والدہ اُسے اس حالت میں دیکھتیں تو کام روک کر اس کے پاس آبیٹھتیں اور تسلی دیتیں اور کہتیں خدا کا شکر ہے وہ ہمیں حلال کی روزی دے رہا ہے یوں بھی ہاتھ سے محنت کرنے والا خدا کا دوست ہوتا ہے۔ کچھ دن کی بات ہے تم انجنیئر بن جاؤ گے تو پھر مجھے محنت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

ہوتے ہوتے سالانہ امتحان کا زمانہ قریب آگیا۔ عبدالرحمٰن کو امتحان کی فیس جمع کرانی تھی لیکن اُسے معلوم تھا کہ اس کی ماں کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں۔ آخر جب فیس داخل کرانے کا وقت آیا اور آخری تاریخ میں صرف ایک دن رہ گیا تو اس نے رات کو اپنی والدہ سے ذکر کیا۔ اس کی والدہ بھی دو سو روپے کا نام سن کر ایک لمحے کے لئے تو سناٹے میں آگئیں۔ مگر پھر کچھ سوچ کر اطمینان سے بولیں "بیٹے فکر مت کرو، میں سونے کی یہ انگوٹھی فروخت کر کے تمہاری فیس کا انتظام کر دوں گی۔"

انگوٹھی فروخت کرنے کے خیال سے ہی عبدالرحمٰن کی آنکھوں میں آنسو آگئے کیونکہ یہ وہ انگوٹھی تھی جو اس کے والد نے والدہ کو شادی کے موقع پر تحفے میں دی تھی۔ اور اس پر اس کے والد کا نام لکھا ہوا تھا۔ اور عبدالرحمٰن کو معلوم تھا کہ اس کی والدہ اپنے مرحوم شوہر کی اس نشانی کو کتنا عزیز رکھتی ہیں۔

خود اس کا یہ حال تھا کہ جب تک سوتے وقت ماں کے پاس جا کر اس انگوٹھی کو بوسہ نہ دے آتا نیند نہ آتی، انگوٹھی فروخت کرنا اسے کسی قیمت پر منظور نہ تھا اس نے والدہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ اُسے اس سال امتحان سے رہ جانا منظور ہے۔ مگر یہ منظور نہیں کہ انگوٹھی ایک منٹ کے لئے بھی اس کی والدہ کی انگلی سے جدا ہو۔ والدہ نے بہت سمجھایا کہ زیور تو ہوتا ہی اس لئے ہے کہ آڑے وقت میں کام آئے مگر عبدالرحمٰن کسی طرح راضی نہ ہوا اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لیں آخر اس کی والدہ نے اسے تسلی دے کر کہا کہ اللہ بڑا کارساز ہے اس نے چاہا تو کوئی اور انتظام ہو جائیگا۔ میں انگوٹھی نہیں بیچوں گی۔

صبح جب وہ مسجد سے گھر پہنچا تو اپنی والدہ کو غیر معمولی طور پر خوش پایا۔ اس سے پہلے کہ وہ خوشی کا سبب

پوچھے والدہ نے بتایا کہ وہ پڑوسن سے ایک سو پچاس روپے قرض لے آئی ہیں۔ پچاس ان کے اپنے پاس تھے۔
عبدالرحمٰن کی خوشی کی کوئی حد نہیں رہی اس کی والدہ کے ہاتھ میں فیس کے دو سو روپے بھی تھے اور انگوٹھی بھی اس نے بے اختیار انگوٹھی کو چوم لیا اور خوشی خوشی کالج روانہ ہوگیا۔ چلتے چلتے کہہ گیا کہ امی آپ میری طرف سے پڑوسن کا شکریہ ادا کر آئیے گا۔

آج وہ کالج میں بھی سب سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا، آخری دن ہونے کی وجہ سے بہت سے طالب علم آج ہی فیس جمع کرا رہے تھے اس لئے اسے لائن میں کھڑے کھڑے دو بج گئے۔

عبدالرحمٰن فیس جمع کرا کے کالج سے نکل ہی رہا تھا کہ اُسے پڑوسن کا لڑکا نظر آیا۔ لڑکے نے کہا عبدالرحمٰن بھائی آپ کی امی ہمارے گھر آئی تھیں کہ ان کی ایک اسکوٹر سے ٹکر ہوگئی اور ان کا ایک ہاتھ ٹوٹ گیا۔ ہمارے ابو ابھی اسپتال سے پلاسٹر چڑھوا کر لائے ہیں۔

ماں کے زخمی ہونے کی خبر اس پر بجلی بن کر گری۔ اُسے اس بے درد اسکوٹر سوار پر بہت غصہ آیا جس نے اس کی اتنی اچھی امی کو زخمی کر دیا تھا۔ اس وقت وہ اسکوٹر سوار اس کے سامنے ہوتا تو وہ مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیتا۔ جب فیس جمع کرا کے وہ بھاگا بھاگا گھر آیا تو دیکھا اس کی والدہ اپنے پلاسٹر کئے ہوئے ہاتھ کو سینے کے اوپر رکھے بستر پر لیٹی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ پڑوسن کے گھر جاتے ہوئے ان کی ٹکر ایک اسکوٹر سے ہوگئی جس سے ہاتھ ٹوٹ گیا وہ انہیں اس حال میں دیکھ کر رونے لگا تو انہوں نے اسے سمجھایا اور کہا " بیٹا تمہیں تو شکر ادا کرنا چاہیئے کہ اللہ نے میری جان بچالی ورنہ اس نیک بخت نے تو مجھے مار ہی ڈالا ہوتا۔

ڈاکٹر نے کہا ہے کہ ایک دو مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا، تم اس کی ذرا فکر نہ کرو تمہارے امتحان قریب ہیں، پوری توجہ سے اپنے امتحان کی تیاری کرو۔"

عبدالرحمٰن اپنی والدہ کی ہدایت کے مطابق پوری طرح امتحان کی تیاری میں جُت گیا باہر نکلنا اور دوستوں سے ملنا جلنا بھی بالکل ترک کر دیا۔

البتہ جب وہ اپنی والدہ کو ایک ہاتھ سے گھر کا کام کرتے دیکھتا تو ان کے منع کرنے کے باوجود ان کا ہاتھ بٹانے لگتا۔ چونکہ انگوٹھی بھی پلاسٹر میں چھپی ہوئی تھی اس لئے سوتے وقت وہ پلاسٹر شدہ ہاتھ کو بوسہ دے کر سوتا۔ اس کے امتحان ہوئے کیونکہ اس نے خوب اچھی طرح تیاری کی تھی اس لئے نتیجہ آیا تو وہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوگیا اور نتیجہ آنے کے ایک ہفتے کے اندر ہی اندر اس کو ایک جگہ اٹھارہ سو روپے ماہوار

پر ملازمت بھی مل گئی۔ جب اس نے ملازمت ملنے کی خوشخبری اپنی والدہ کو سنائی تو خوشی سے ان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور جب انہوں نے دونوں ہاتھوں کے بجائے ایک ہاتھ اٹھا کر خدا کا شکر ادا کیا تو عبدالرحمٰن کے دل پر ایک چوٹ سی لگی اس نے کہا کہ امی مجھے تو اس وقت مکمل خوشی ہو گی جس دن آپ کے ہاتھ کا پلاسٹر اترے گا اور میں ایک بار پھر اپنے ابو کے نام کو بوسہ دونگا۔ اس کی والدہ نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب کہتے تھے کہ ایکسرے ٹھیک آیا ہے۔ انشاءاللہ ایک آدھ مہینے میں ہڈیوں کے جوڑ مضبوط ہو جائیں گے تو پلاسٹر اتر جائے گا۔

اور جس دن عبدالرحمٰن اپنی پہلی تنخواہ لے کر گھر میں داخل ہوا تو یہ دیکھ کر اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی کہ اس کی والدہ چولہے کے پاس بیٹھی روٹی پکا رہی ہیں۔ وہ دوڑا ہوا باورچی خانے میں گیا اور بے اختیار اپنی والدہ کے ہاتھ اور انگوٹھی کو چومنے لگا اس کی والدہ اس کی یہ حالت دیکھ کر خوشی سے مسکرائیں۔

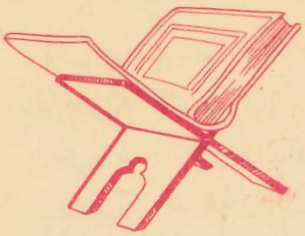
اچانک عبدالرحمٰن کو کچھ خیال آیا، اس نے اپنی والدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر پھیلا کر دیکھا اور حیرت سے کہا امی چوٹ کہاں آئی تھی ہاتھ پر تو کوئی نشان نہیں ہے۔

"چوٹ کہاں آئی تھی؟" والدہ نے شفقت سے عبدالرحمٰن کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔" اصل میں جب میں پڑوسن کے اہل نچی تو اس کے سامنے قرض کے لئے ہاتھ پسارتے ہوئے شرم آئی چنانچہ یہ انگوٹھی میں نے اس کے پاس گروی رکھ دی۔"

" مگر یہ انگوٹھی تو اس روز آپ کے ہاتھ میں تھی" عبدالرحمٰن نے بیچ میں بات کاٹی "وہ تو آج بھی ہے حالانکہ پڑوسن کو ابھی پیسے نہیں بھیجے ہیں۔ میں ان سے کہہ آئی ہوں کہ ابھی پیسے نہیں بھیجے ہیں۔ میں ان سے کہہ آئی تھی کہ ابھی بھیج دوں گی۔ میرے ہاتھ میں انگوٹھی نہ دیکھ کر تمہارے دل کو صدمہ ہوتا اس لئے میں نے یہ چوٹ کا ڈھونگ رچایا اور ڈاکٹر کی خوشامد کر کے پلاسٹر چڑھوایا"

عبدالرحمٰن کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس کی والدہ نے اسے خوش دیکھنے کے لئے تین ماہ تک اپنے ہاتھ کو مسلسل پلاسٹر میں جکڑے رکھا ہے تو وہ بے اختیار اپنی والدہ سے لپٹ گیا بولا" آپ کتنی اچھی ہیں آپ میرا کتنا خیال رکھتی ہیں، آپ سے زیادہ محبت کرنے والا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

والدہ نے کہا نہیں میرے لال ایسا نہ کہو سب سے زیادہ محبت کرنے والی تو وہ ذات ہے جس نے ماؤں کے دلوں میں مامتا کا جذبہ پیدا کیا ہے۔



قرآنی معلومات

مرتبہ

ملکہ افروز روھیلہ

قرآن میں ۵۴۰ رکوع اور چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات ہیں۔

قرآن کا نزول رمضان کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں کسی رات کو ہوا زیادہ تر روایتیں ۲۷ رمضان کی بابت ہیں۔

قرآن کریم کے تیس پارے اور سات منزلیں ہیں۔

قرآن کریم میں ۱۱۴ سورتیں ہیں۔ سورۂ بقرہ سب سے طویل اور سورۂ کوثر سب سے مختصر ہے۔

قرآن کریم میں سورۃ کا لفظ سات مرتبہ آیا ہے! لفظ سورہ کے معنی فصیل کے ہیں۔

قرآن کی ترتیب کے لحاظ سے پہلی سورۂ فاتحہ اور آخری سورۃ الناس ہے۔

قرآن کا بنیادی موضوع انسان ہے قرآن میں ۲۶ انبیاء کا ذکر آیا ہے۔

قرآن میں چھ انبیاء کے نام پر سورتیں آئی ہیں۔ ہودؑ، یونسؑ، یوسفؑ، ابراہیمؑ، محمدؐ، نوحؑ،

قرآن میں چار مقامات پر لفظ "محمدؐ" آیا ہے۔ سورۂ آل عمران، سورۂ احزاب، سورۂ محمد، سورۂ فتح

قرآن میں پہلی دفعہ لفظ محمد، سورۂ آل عمران میں آیا اور آخری مرتبہ سورۂ فتح میں! قرآن میں لفظ احمد، صرف ایک دفعہ سورۂ صف میں آیا ہے۔

خلیل احمد بصری نے سب سے پہلے اعراب تشدید، مد قرآن میں لگائے۔

سورۂ یٰسین کو قلب القرآن سورۂ رحمٰن کو عروس القرآن، عرش القرآن سورۂ ملک کو چراغ

القرآن کہتے ہیں۔

اُم القرآن، سورۂ حمد، سورۂ الصلوٰۃ، سبع ثانی سورۂ فاتحہ کے دیگر نام ہیں۔

سورہ الحمد، سورۃ التوحید، سورۃ الاخلاص کے دیگر نام ہیں۔

ثواب کے اعتبار سے سورۂ اخلاص تہائی قرآن سورۂ فاتحہ دو تہائی، سورۂ الکافرون، سورہ الزلزال چوتھائی قرآن کے برابر ہیں۔

حضرت عثمانؓ کو جامع القرآن اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو ترجمان القرآن کہا جاتا ہے۔

پہلے مفسر قرآن حضور اکرمؐ کی ذات گرامی تھی۔ پہلی وحی کے بعد حضور کے بعد حضرت خدیجہؓ نے نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو آنحضرت صلعم نے مدینہ میں قرآن اور دیگر تعلیم کے لئے بھیجا۔

فتح مکہ کے بعد معاذ بن جبل کو اہل مکہ کی تعلیم اور قرآن سکھانے کے لئے مقرر کیا۔

قرآن کے اب تک ایک سو تین زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں سب سے پہلا ترجمہ لاطینی زبان میں ہوا۔

قرآن کا فارسی زبان میں ترجمہ اہل ہند میں سب سے پہلے شاہ ولی اللہؒ نے کیا۔

قرآن کا اردو میں سب سے پہلا ترجمہ شاہ رفیع الدین نے کیا ان کے بعد شاہ عبدالقادر نے کیا۔ شاہ عبدالقادر کے ترجمہ کا نام موضح القرآن ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی کا ترجمہ بیان القرآن کے نام سے شائع ہوا۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے ترجمہ اور تفسیر کا نام تفہیم القرآن ہے یہ تفسیر تیس سال اور چار ماہ کے عرصہ میں مکمل ہوئی۔

تفہیم القرآن کی چھ جلدیں ہیں یہ قسط وار ماہنامہ ترجمان القرآن میں شائع ہوئی تھیں!

مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا محمد شفیع کا ترجمہ اور تفسیر معارف القرآن، کے نام سے شائع ہوئی اس کی سات جلدیں ہیں۔

یہ تفسیر روزانہ صبح ریڈیو سے مفتیٔ اعظم مولانا محمد شفیع بیان کرتے تھے۔

علامہ سیماب اکبر آبادی نے اردو میں قرآن کا پہلا منظوم ترجمہ کیا جس کے صرف دو سپارے شائع ہو سکے۔



کوئِس®

مصنوعات بنانے والے پیش کرتے ہیں

- **کوئِس مشروبات :**
  مشروبِ کوئِس کے اضافے کے ساتھ اب چھ مختلف مزیدار ذائقے ۔
  مشروبِ کوئِس ، آئسکریم ، اناس ، سنترہ ، ویمٹو اور لیمن ۔
- **کوئِس اچار :**
  مینگو اور مکس ۔ لذیذ ، چٹ پٹے ، مزیدار ۔
- **کوئِس فیرنی مِکس :**
  زعفرانی اور سادہ ۔
  ایک لیٹر ابلتے ہوئے دودھ میں ایک پیکٹ فیرنی مِکس ملا کر پانچ منٹ سے دس منٹ تک پکائیں ۔ فیرنی تیار ۔
- **کوئِس کسٹرڈ پاؤڈر :**
  تین مزیدار ذائقے ۔ آپکے ذوق کے عین مطابق



انڈس فروٹ جوس کمپنی

پوسٹ بکس 3026 ، کراچی ۔ 29 ، پاکستان ۔ فون : 440361-438869

آنکھ مچولی البم



ہاں پڑھو
ب سے
بلی
پروفیسر
م۔ ٹ۔ رہو

جی ہاں! میں مگرمچھ کا بچہ ہوں ابھی ابھی دنیا میں آیا ہوں

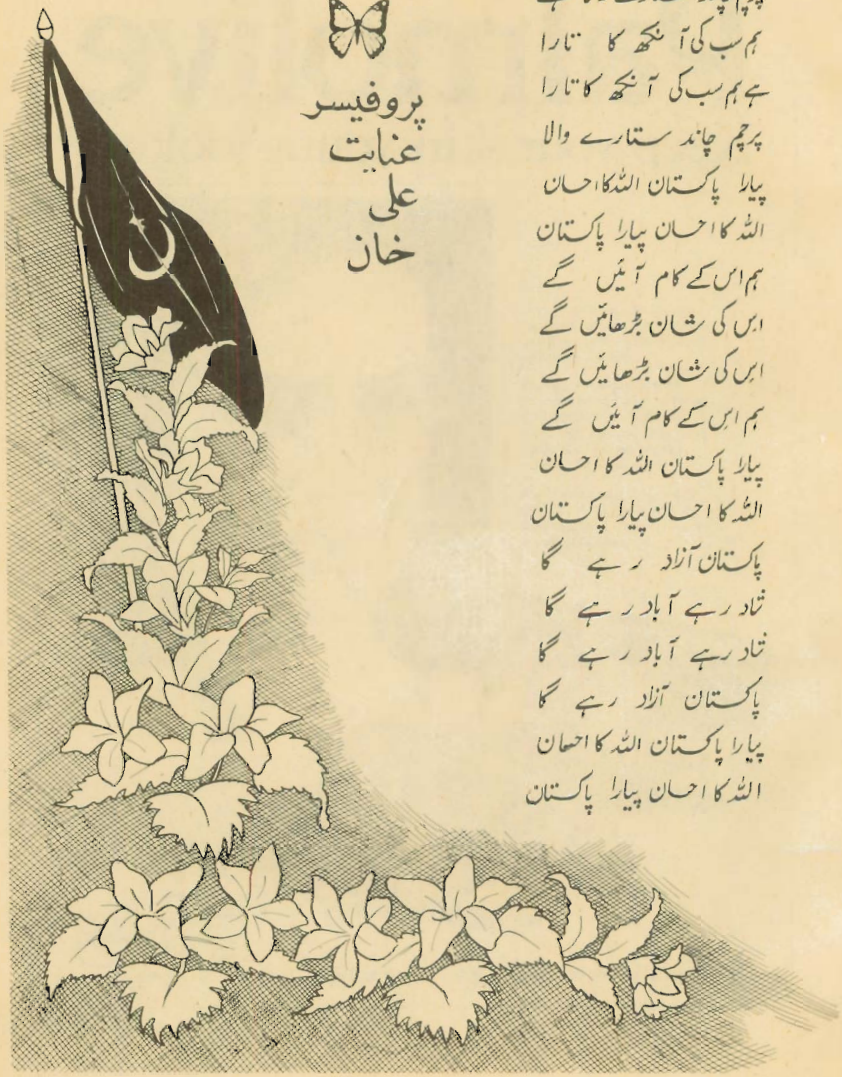
مجھے دیکھ کر آپ ہنستے کیوں ہیں
میں آسٹریلیا کا رہنے والا بچہ ہوں
یہ میک اپ تو ہماری روایت ہے





پاکستان

پروفیسر
عنایت
علی
خان



پیارا پاکستان اللہ کا احسان
اللہ کا احسان۔ پیارا پاکستان
پرچم چاند ستارے والا ہے
ہم سب کی آنکھ کا تارا
ہے ہم سب کی آنکھ کا تارا
پرچم چاند ستارے والا
پیارا پاکستان اللہ کا احسان
اللہ کا احسان پیارا پاکستان
ہم اس کے کام آئیں گے
اس کی شان بڑھائیں گے
اس کی شان بڑھائیں گے
ہم اس کے کام آئیں گے
پیارا پاکستان اللہ کا احسان
اللہ کا احسان پیارا پاکستان
پاکستان آزاد رہے گا
شاد رہے آباد رہے گا
شاد رہے آباد رہے گا
پاکستان آزاد رہے گا
پیارا پاکستان اللہ کا احسان
اللہ کا احسان پیارا پاکستان

Palmolive

Keep your skin young looking

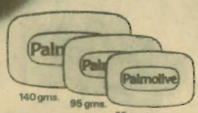
Women who care about their complexion know the secret of keeping skin soft, smooth and supple – naturally.

Palmolive soap – a unique blend of Palm oil and Olive oil – natural moisturisers that penetrate your skin deep down to replenish the natural oils lost in day-to-day living.

Palmolive is the natural way to nourish your skin to help keep it young looking and soft to touch.







Available in fresh green and pure white.

SPECTRUM

اسماء بارون
انعام یافتہ کہانی

پتوار

عبداللہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بڑا فرماں بردار اور مستعد۔ گھر کے مستقبل کا سہارا۔ پڑوسیوں کی خبر گیری کرنے والا اس کا باپ ماہی گیر تھا۔ جو ابھی پچھلے ماہ سمندر کی طوفانی لہروں کا شکار ہوگیا تھا۔ گھر کی ذمے داریاں یک بیک عبداللہ کے سر پر آن پڑی تھیں۔ وہ بہت سویرے تاروں کی چھاؤں میں بیدار ہوتا۔ نماز فجر کے بعد اپنی بیوہ



والدہ کی دعاؤں کے سائے تلے سلیقے سے بندھا ہوا جال اپنے کاندھوں پر ڈالے جانے پہچانے سمندر کی بے کراں گود میں سما جاتا! اپنے مرحوم باپ کی ماہرانہ تربیت کی بدولت وہ اپنی چھوٹی سی کشتی بہت عمدگی سے کھینا جانتا تھا!

روزانہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ کر وہ پھرتی سے جال کھولتا اور اللہ کا نام لے کر کمال چابک دستی سے اسے سمندر میں پھینک دیتا۔ چند گھنٹوں کی جدوجہد کے بعد وہ رنگ برنگی، چھوٹی بڑی بہت سی مچھلیاں پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اور پھر وہ کشتی کھیتا، حمد یا گیت اونچے سروں میں گاتا ہوا واپس پلٹتا۔ پھر سے سمندر کی سرکش موجیں، جنہوں نے اس کے نڈر اور شفیق باپ کو مہینہ بھر پہلے نگل لیا تھا اس کی مترنم آواز سے ساکن سی ہو جاتیں۔ ایسے لگتا جیسے اللہ کی بڑائی کے ذکر سے اُن کا طوفانی دل پگھل گیا ہو!

اور یوں ..... کئی ماہ و سال بیت گئے۔ عبداللہ اب اٹھارہ سالہ ایک گبھرو مانجھی اور مشاق مچھیرا بن چکا تھا!

ہاں ..... وہ صبح بھی بہت نور بھری تھی۔ عبداللہ نے حسب عادت اللہ کا نام لے کر سمندر میں جال پھینکا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے اُس کے مرحوم باپ کی پیاری صورت آ گئی۔

جانے کیوں، اس کے نوخیز دھڑکتے دل میں ایک خیال کونپلے کی طرح لہرایا۔ آج پانی کی موجیں شوریدہ سری دکھا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی غیر معمولی واقعہ رونما ہو کر رہے گا۔

عبداللہ نے عادتاً بسم اللہ کہہ کر جال کھینچنا شروع کیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ آج وہ اپنے پہلے ہی ہلے میں کامیاب رہا۔ جال میں اچھی نسل کی ایک بڑی مچھلی اور چھ عدد قدرے چھوٹی مچھلیاں نظر آئیں۔ مچھلیوں کو جلدی سے ٹوکری میں محفوظ کرنے کے بعد اس نے کشتی کو ساحل کی طرف تیزی سے کھینا شروع کیا اسے رہ رہ کر اپنے باپ کی یاد آئے چلی جا رہی تھی!

پچھلے چند دن سے اس کی بوڑھی ماں بستر علالت پر پڑی تھی ..... کم بخت بیماری تھی کہ جانے کا نام نہیں لیتی تھی اچانک، طوفانی موجوں کا ایک زبردست ریلا آیا اور کشتی الٹنے سے بال بال بچی۔ عبداللہ، سرکش موجوں سے پنجہ آزمائی کے ساتھ ساتھ حمد یہ گیت بھی گنگنائے جا رہا تھا۔ آخرکار، کشتی کنارے آن لگی، سمندری طوفان شاید اندر ہی اندر سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

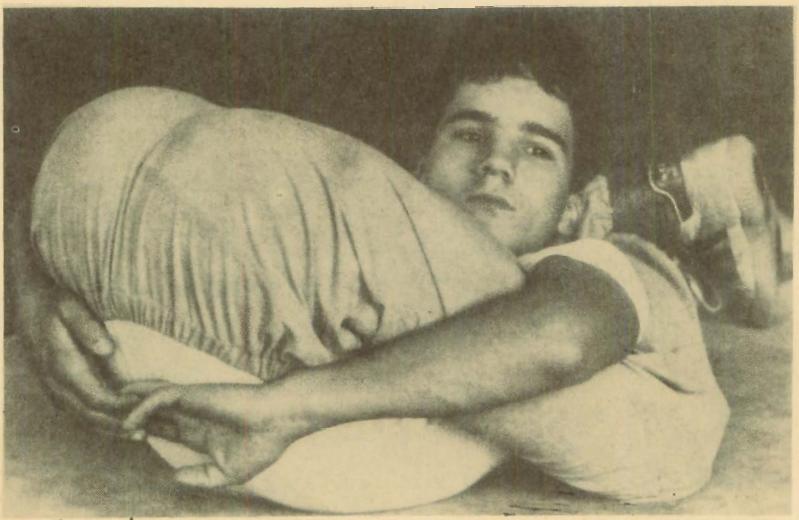
عبداللہ نے کشتی کو اس کی معمول کی جگہ رسّے سے مضبوطی کے ساتھ باندھا اور کنارے پر کھڑا ہو کر بے تاب موجوں

کی شوخیوں کا نظارہ کرنے لگا۔ اَب تو موجوں کی دس دس، پندرہ پندرہ فٹ اونچی مہیب دیواریں سی اٹھنے لگی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی کشتی، جو اُس کی روزی کا واحد سہارا تھی، پُرشور پانی میں ڈبکیاں کھاتی نظر آئی طوفانی موجوں کے ایک زبردست ریلے نے اُسے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے سمندر کی گود میں دھکیل دیا.... عبداللہ کی کشتی آناً فاناً نظر سے اُوجھل ہوگئی۔

عُبداللہ بوجھل قدموں سے چلتا گھر لوٹا۔ گاؤں میں سب سے پہلے ایک بزرگ، اچھو ملاح نے اُس کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے ہوئے اس کی پیاری ماں کے عالمِ جاودانی کو سدھار جانے کی خبر سنائی آہِ سرد کے ہاتھ اِنا للہ پڑھ کر عبداللہ گھٹی گھٹی آواز میں خود کلامی کرتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ پایا۔

"اوہ! میری ماں! میری پتوار!"





"ربری راجر سیوسے" دنیا کے سب سے زیادہ لچکدار آدمی ہیں یہ اپنے جسم کو مختلف طریقوں سے موڑ سکتے ہیں سوئٹزرلینڈ کے شہر زیورخ میں ہونے والے ایک مقابلے میں راجر صاحب اس حالت میں ۲۰ منٹ ۲۲ سیکنڈ تک رہے۔

ابوظفر زین

اے خدا میرے گھر آجا . . .

راشد ایک ننھا سا معصوم بچہ تھا۔ وہ ایک دیہات میں رہتا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ وہ بیوقوفی کی حد تک سادہ تھا۔ لیکن تھا بہت نیک، پانچوں وقت کی نماز پڑھتا تھا اور بہت ساری دعائیں مانگتا تھا۔ لیکن ایک دعا خاص طور سے مانگتا۔ "اے میرے پیارے اللہ میاں آپ ایک دن کے لئے گھر پر بھی آجائیں، مجھے معلوم ہے کہ آپ کے پاس بہت سارے کام ہیں۔ روزانہ سورج کو حکم دینا پڑتا ہے کہ چلو، مشرق سے نکلو مغرب میں ڈوبو اسی دن بارش بھی برسانی پڑتی ہے۔ سردی اور گرمی کے لئے ایئر کنڈیشنر اور ہیٹر چلانے پڑتے ہیں۔ پھر آپ کو سبزیاں اور پھل بھی اُگانے ہوتے ہیں انسانوں کو مارنے اور پیدا کرنے کے کام بھی بہت ہیں۔ ساری دنیا کا کام اکیلے آپ ہی کو کرنا ہوتا ہے۔ پھر بھی کسی دن تو آپ چھٹی کرتے ہوں گے اور جمعہ کو تو آپ کے تمام دفتر بند رہتے ہوں گے اس لئے اے میرے پیارے اللہ میاں کسی جمعہ کو ہی ہمارے مہمان بن کر آیئے۔"

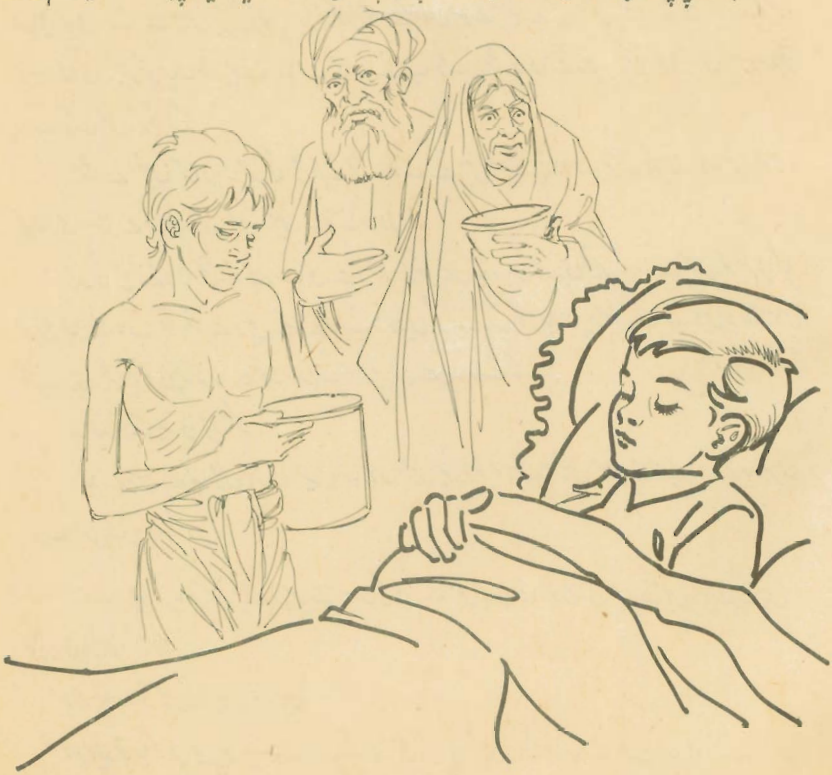
ننھا راشد لبک لبک کر دعا مانگتا کہ میں آپ سے ملنے کے لئے کتنا تڑپتا ہوں یہ میری بہن بھی آپ سے ملنا چاہتی ہے کہتی ہے کہ میں آپ کو آئسکریم کھلاؤں گی اور مزے مزے کے شربت اور مٹھائیاں کھلاؤں گی۔ راشد کہتا کہ اللہ میاں مجھے معلوم ہے کہ آسمان پر آپ کا عالیشان بنگلہ ہے اس میں ڈرائنگ روم بھی ہے اور بیڈ روم بھی جہاں نرم نرم بستر ہیں لیکن اگر آپ ہمارے یہاں آجائیں تو ہمیں بہت خوشی ہوگی ہم آپ سے میٹھی میٹھی باتیں کریں گے اور ہمارے سارے پڑوسی ہمیں حیرت سے دیکھیں گے اور کہیں گے دیکھو ان کے گھر اللہ میاں آتے ہیں۔

بیچارے راشد کو خدا کے حضور دعا مانگتے اور گڑگڑاتے کئی مہینے گزر گئے۔ مگر اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ خوب آنسو بہا بہا کر دعائیں مانگتا رہا اور اللہ میاں کو اپنے گھر بلاتا رہا۔ حالانکہ ابو اور امی نے کئی بار اُس کو سمجھایا کہ بیٹا اللہ میاں ہم لوگوں کو نظر نہیں آسکتے۔ وہ ہماری طرح ہاتھوں پیروں کے محتاج نہیں ہیں لیکن راشد پر تو اللہ میاں کو گھر بلانے کی دھن سوار تھی۔ ایک رات جب وہ گہری نیند سویا ہوا تھا۔ تو اُسے خواب میں نظر آیا کہ اللہ میاں نے اس کے گھر آنے کا وعدہ کرلیا ہے اور وہ اسی جمعہ کو اُس کے ہاں آرہے ہیں۔

راشد ہڑبڑا کر اٹھا۔ مارے خوشی کے پھولے نہ سمایا اور اپنے بھائی اور بہن کو سوتے سے اٹھایا اٹھو اٹھو اٹھ جاؤ۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ اس جمعہ کو اللہ میاں ہمارے گھر آ رہے ہیں ابھی ابھی خبر آگئی ہے۔ میں نے خواب میں سن لیا ہے راشد نے امی اور ابو کو بتایا۔ لیکن وہ لوگ مسکرانے لگے۔ وہ بہت حیران ہوا۔ مگر اُس نے کسی کی پرواہ نہیں کی اور گلی میں گھس گیا۔ ہر گھر میں بتایا کہ اس جمعہ کو اللہ میاں اس کے یہاں مہمان ہو کر آ رہے ہیں سب لوگ مسکرا رہے تھے کچھ ہنس بھی رہے تھے۔ لیکن راشد کو اللہ میاں کے آنے کی بہت خوشی تھی۔

بہن کو اس نے سوتے سے اٹھا دیا تھا اس نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔ آدھی رات کو تم نے اٹھا دیا۔ ابھی جمعہ میں تین دن باقی ہیں۔ تین دن کیا چیز ہے۔ راشد نے مارے جوش کے کہا" اتنا بڑا مہمان آ رہا ہے ابھی سے انتظامات شروع ہوں گے بتاؤ کیا پکے گا۔ میں ساری چیزیں مارکیٹ سے لے آؤں۔

بہن نے پوچھا وہ جمعہ کو کس وقت آئیں گے مطلب یہ ہے کہ صبح کا ناشتہ کریں گے یا دوپہر کا کھانا یا شام کی



چائے یا رات کا ڈنر ؟

راشد نے کہا افسوس وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں۔ چلو چاروں وقت کا انتظام کرلو۔ نہ جانے کس وقت آجائے ہمارا معزز مہمان۔

بہن نے پوچھا "کیا اللہ میاں اکیلے آرہے ہیں یا ان کے ساتھ اور لوگ بھی ہیں۔

وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں چلو دس لوگوں کا انتظام کرلو۔ راشد نے خوش ہوئے ہوئے کہا۔

بہن نے پوچھا" وہ کھانے میں کیا پسند کرتے ہیں۔ چاول یا روٹی۔ گوشت میں کیا پسند کرتے ہیں۔ ؟ کباب یا تورمہ۔ کون سی سبزیاں اُن کو بھاتی ہیں ؟

وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں چلو ہر طرح کا انتظام کرلو۔ راشد کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

بدھ اور جمعرات کے تمام دن انتظامات میں گزرے گھر کا کب کا کونا جھاڑا اور پونچھا گیا۔ دھلائی ہوئی صفائی ہوئی۔ سب سے نفیس فرش بچھایا گیا ڈیکوریشن سے بہترین صوفے منگوائے گئے۔ برتن منگوائے گئے۔ سارے پڑوسیوں کو خبر دی گئی کہ جمعہ کو میاں خدا مہمان آرہا ہے۔ گاؤں کے سب لوگ راشد کو سمجھا چکے تھے لیکن اُس کی اس معصوم دعوت پر سب لوگ اُس کے گھر آگئے۔

راشد نے انہیں سمجھا دیا کہ جمعہ کی صبح آپ لوگ ادب سے اس سڑک پر دونوں طرف کھڑے ہوجائیں۔ جو بستی کو گاڑی اسٹینڈ سے ملاتی ہے۔ میں انہیں ساتھ لے کر آؤں گا۔

جمعہ کی صبح آنے والی تھی۔ آدھی رات ہی سے راشد کے گھر میں تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سارے بچوں کو حکم دیا گیا کہ صبح نہایت ادب اور تمیز سے رہیں۔ کپڑے خراب نہ کردیں اگر اللہ میاں کوئی بات پوچھیں تو جواب دیں ورنہ خاموش کھڑے رہیں۔ خبردار کوئی بچہ نہ روئے گا نہ ضد کرے گا نہ مہمان سے پیسہ مانگے گا۔

خدا خدا کر کے جمعہ کی صبح آگئی۔

راشد نے بہن سے کہا میں گاڑی اسٹینڈ جارہا ہوں انہیں میرے گھر کا راستہ نہیں معلوم ہوگا۔ پھر اس نے اپنا بہترین سوٹ اور ہیٹ پہنا۔

بہن نے پوچھا "کیا تم اللہ میاں کو پہچانتے ہو ان کی صورت شکل کیا ہے ؟ وہ کون سا لباس پہنتے ہیں۔ سوٹ پہنتے ہیں یا شیروانی یا قمیض شلوار"

"اوہو ہو وہ تو میں نے پوچھا ہی نہیں"

" ذرا پوچھ تو لیا کرو۔ خیر جاؤ وہ ضعیف ہوں گے۔ داڑھی لمبی اور اُجلی ہوگی مگر وہ بہت صحت مند ہوں گے۔

راشد گاڑی اسٹینڈ پہنچا۔ شاید اللہ میاں صبح ہی صبح آجائیں اُس نے بہن کے بتائے ہوئے حلیے پر تمام آنے والے مسافروں کا جائزہ لیا۔ اگر اس حلیے کا کوئی آدمی نظر آیا تو نہایت تپاک سے جاکر پوچھا کیا آپ خدا ہیں؟

اتنے میں دو اندھے لڑکے قریب آئے اور اس سے خیرات مانگنے لگے۔ اس نے ڈانٹ کر بھگا دیا "جاؤ بھاگ جاؤ تم لوگوں کا کیا کام ہے مانگنے کے سوا۔ جہاں کسی شریف آدمی کو دیکھا فوراً پہنچ گئے جاؤ — !

اس نے ایک دھکا دیدیا کیوں کہ سامنے ایک کار پر دو ضعیف سفید داڑھی والے حضرات نظر آگئے تھے وہ دوڑ کر پہنچا "آپ میں سے اللہ میاں کون ہے"؟ انہوں نے اسے پاگل سمجھا۔

دھوپ ہو گئی مگر خدا کا کہیں پتہ نہیں تھا۔ راشد تھک ہار کر گھر واپس پہنچا دوپہر کو۔ خدا کی تلاش میں راشد پھر گاڑی اسٹینڈ پہنچا۔ تمام لوگ اور مسافروں کا جائزہ لیتا رہا۔ اتنی دیر میں ایک بوڑھی عورت لاٹھی ٹیکتی اور دو بچے سنبھالتی اُس کے پاس آئی اور بولی مولا ہی دے گا۔"

راشد بہت بگڑا تم لوگوں کو بس خیرات ہی کی پڑی ہوتی ہے میں صبح سے خدا کی تلاش میں ہلکان ہو رہا ہوں اور وہ آنہیں رہے اب تک دعوت پر ساڑھے چار سو روپے اُٹھ چکے ہیں، اب میرے پاس ایک روپیہ بھی نہیں ہے تم جیسی بھکارنوں کو دینے کے لئے۔ ہٹو ہٹو۔ وہ سامنے سائیکل پر خدا آتا ہوا نظر آرہا تھا۔"

مگر وہ خدا نہیں تھا۔ کوئی انسان تھا۔

بالآخر دھوپ ڈھلنے لگی راشد ناامید گھر آیا۔ اور بولا معلوم ہوتا ہے شاید وہ ٹھنڈے وقت آئیں گے۔ دفتر کا کام ختم کر کے۔ آج شاید اوور ٹائم ہو۔

شام کی چائے کا وقت آیا اور بیچارا راشد پھر گاڑی اسٹینڈ گیا۔ ایک لنگڑا بے سہارا فقیر ٹکرا گیا اُس کا پیالہ گر گیا جس میں مانگے ہوئے پیسے تھے۔

ہٹ جاؤ۔ سامنے سے ہٹ جاؤ راشد نے گرج کر کہا تم لوگوں نے جینا حرام کر دیا ہے بس ہر وقت پیسے بٹورنے کے چکر میں رہتے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔ میں یہاں خدا کا انتظار کر رہا ہوں"

اگرچہ دو تین بڈھے سفید داڑھی والے نظر آئے لیکن انہوں نے خدا ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ بیچارا راشد پھر واپس اکیلا گھر پہنچا۔

بہن بولی "خدا کا وعدہ جھوٹا نہیں ہوتا وہ دن بھر نہیں آسکا اب دیکھ لینا رات کو آئے گا۔ ساری تیاری مکمل ہے میں نے بستر بچھا دیا ہے تاکہ وہ آرام کر سکے۔ ڈنر کے وقت بیچارا راشد پھر گاڑی اسٹینڈ پہنچا ایک اندھی لڑکی بھیک مانگتی ہوئی اُس کے پاس آئی اور بولی، بابا خیرات کرو، خدا خوش ہوگا۔

خدا کے نہیں آنے پر راشد پہلے بھی اداس تھا اور غصّہ بھی تھا۔ اگر وہ نہیں آئے گا تو رعب کیسے جمے گا۔ الٹا سب لوگ مذاق اڑائیں گے۔ اُس نے سارا غصّہ اندھی لڑکی پر اُتار دیا۔ "چلو ہٹو بھیک آج کل فیشن ہوگیا ہے۔ میں صبح سے خدا کا انتظار کر رہا ہوں۔ اب تک ساڑھے سات سو روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ جاؤ جاؤ۔

وہ بہت دیر تک خدا کا انتظار کرتا رہا۔ مگر بیکار۔

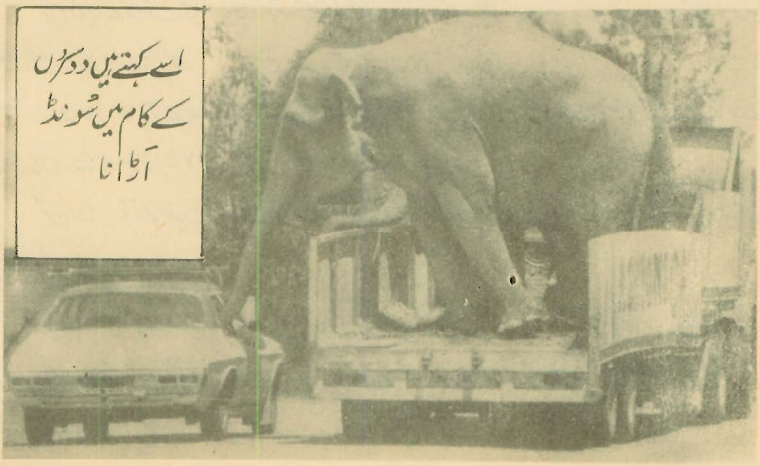
تھک ہار کر وہ گھر آگیا۔ گھر میں ابھی تک لوگ ہنس رہے تھے۔ اسے بہت ہی غصّہ آگیا۔

رات اُس نے خواب میں پھر وہ خدا کی آواز سنی۔

راشد نے بہت شکایت کی۔ کیا آپ کا وعدہ بھی جھوٹا ہوتا ہے؟ میں نے آج اتنا انتظام اور اتنا انتظار کیا مگر آپ نہیں آئے ہر شخص مذاق اُڑا رہا ہے۔

اللہ میاں نے کہا میں تو تمام دن آیا مگر تم نے ہی دھتکار دیا نکال دیا میں ہی تو تھا ان دو اندھے لڑکوں کی صورت میں جو تم سے خیرات مانگ رہے تھے میں ہی تو تھا اُس بوڑھی کمزور بچوں والی بڑھیا کے روپ میں جسے تم نے سختی سے ڈانٹ دیا۔ شام کو وہ جو لنگڑا بے سہارا فقیر تھا وہ کون تھا؟ میں ہی تو تھا اور رات کو جو اندھی بھکارن لڑکی آئی تھی جسے تم نے مارتے مارتے چھوڑا کیا وہ میں نہیں تھا؟ میں جو آتا ہوں تو ان ہی کی شکلوں میں آتا ہوں۔

پیارے بچّو! اس کہانی کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان غریب لولے، لنگڑے اندھے لوگوں یتیموں اور بیواؤں سے نیک سلوک کریں۔ تب اللہ کی رحمتیں آئیں گی۔





ذہانت

اختر عباس

"ایسا کرتے ہیں کہ خریداری کل صبح صبح کریں گے ابھی گھر چلو ورنہ تمہیں علم ہے میرے امی ابو کتنے پریشان ہو جاتے ہیں" انور نے پارک سے نکلتے ہوئے یہ بات دوسری بار کہی تھی۔

"مگر بھائی صبح صبح دکانیں کہاں کھلتی ہیں۔ کاپیاں ابھی نہ ملیں تو ہوم ورک کیسے کروں گا۔ تم مجھے کل اسکول میں سزا دلوا کے ہی رہو گے۔" عثمان نے دلیل دی۔

بالآخر انور نے ہار مان لی اور دونوں باتیں کرتے کرتے بازار جا نکلے۔ خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ دکانیں بند ہو رہی تھیں کہیں کہیں چند لوگ کھڑے خریداری کرتے نظر آ رہے تھے۔ انہیں بھی مطلوبہ دکان کھلی مل گئی۔ کاپیاں خریدنے کے بعد دونوں جونہی دکان سے باہر نکلے۔ گھپ اندھیرا ہو گیا۔

"یہ بجلی والوں کو اللہ پوچھے کبھی ڈھنگ کا کام نہیں کرتے" انور نے عثمان کا ہاتھ ٹٹولتے ہوئے کہا۔

دونوں دوست ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سڑک کے کنارے کنارے چلے جا رہے تھے کہ اچانک انہیں ایک گلی میں شور سنائی دیا۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھہرے۔ پھر اشتیاق انہیں وہاں لے گیا۔

"وہ چار لوگ تھے۔ بس سیدھے بھاگے ہیں" ایک آدمی بلند آواز سے بول رہا تھا۔ "؟" ہائے میں لٹ گیا۔ میری

سارے ہفتے کی کمائی لے گئے۔ آج پورے ہفتے کی وصولیاں ہوئیں تھیں۔"

"پولیس کو اطلاع کردی" ایک دوسرے آدمی نے پوچھا۔

"پولیس نے کیا کرنا ہے؟ خود ہی تلاش کرنا پڑے گا۔" "ویسے اطلاع کرنے میں کیا ہرج ہے۔"

"کیا ان کے پاس اسلحہ تھا۔" "تو اور کیا وہ کھلونے لئے پھر رہے ہیں"

اسی طرح کی رنگ رنگ کی باتیں سن کر دونوں دوستوں کو اندازہ ہوگیا کہ معاملہ کیا ہے۔ "یار اب چل بھی چکو آج تم مجھے ضرور پٹواؤ گے"

انور نے عثمان کا ہاتھ کھینچتے ہوئے کہا۔

"ہماری اس سیر پر پہلے ہی تبصرے ہو رہے ہیں کہ آخر صبح کیوں نہیں جاتے نماز مغرب پڑھ کر ہی کیوں سیر کرتے ہیں۔"

"بجلی ابھی تک نہیں آئی کام کیسے کروں گا" عثمان نے انور کی سنی ان سنی کر کے کہا۔ عین اسی لمحے وہ ٹھٹھک کر کھڑے ہو گئے۔

"دادو کے بچے تو آج ضرور مروائے گا۔ کم بخت کبھی تو ڈھنگ کا فیصلہ کر لیا کرو۔ کسی دوسرے سے عقل مت ہی لے۔ نرا گاؤدی ہے گاؤدی" رستم نے غصے سے پھنکارتی آواز میں کہا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ دادو کو کچا چبا جاتا۔

"استاد یوں بُری طرح تو نہ گھورو" داؤد نے التجا کی "گھورنے کے بچے! اچھی طرح کیسے گھورتے ہیں ذرا مجھے بھی سمجھاؤ۔ ابے پھنس گئے تو خود ہی سمجھ آ جائے گی۔ شکر کرو بجلی چلی گئی ورنہ تو اب تک حوالات کی ہوا کھا رہے ہوتے۔" دادو کو اِدھر اُدھر جھانکتے دیکھ کر رستم نے بات ختم کر دی۔

"استاد یہ پارک ہے نا" "ابے پارک کے بچے بولو بولو کیا تکلیف ہے پارک کو" رستم نے غصے کو دبایا۔

"بس یہیں گھس چلتے ہیں۔ کچھ دیر بعد حالات ٹھیک ہونے پہ ایک ایک دو دو کر کے نکل چلیں گے۔"

"مگر استاد گیٹ تو بند ہے اندر کیسے جائیں گے" یہ کالو تھا۔ بڑی دیر سے چپ چاپ ساتھ بھاگا آ رہا تھا اُس کے ہاتھ میں پھولا ہوا بیگ تھا۔ آج کے معرکے کی کمائی سے بھرا ہوا۔

ہم دیوار پھاند کر اندر جاتے ہیں تم اس بیگ کو باڑ کی بیلوں کی دیوار کے نیچے رکھ کر سامنے سڑک پر ٹہلنا شروع کر دو۔ یہ کہہ کر ویسم، دادو سمیت بیلوں کی گنجان باڑ پھاند گیا۔

"ابے کالو کے بچے! خیال رکھنا" رستم جاتے جاتے بڑبڑایا۔

"استاد! میں کالو کا بچہ نہیں خود کالو ہوں۔ تو کیوں غلط بولتا ہے۔" مگر کالو کی بات ختم ہونے سے پہلے

رستم دادو سمیت درج جا چکا تھا۔

"عثمان وہ دیکھو" "کیا ہے؟ مجھے تو کچھ نظر نہیں آرہا۔ عثمان نے دائیں بائیں دیکھا۔

"وہ سامنے پارک کے گیٹ سے کچھ آگے" انور نے اشارہ کیا۔

دونوں دم سادھے وہیں کھڑے رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو سائے اندر کود گئے۔ اور ایک نے وہیں کوئی چیز چھپائی۔

"اب کیا کریں۔ لگتا ہے وہی ہیں" انور نے پوچھا۔

"لگتا کیا یقیناً وہی ہیں۔ مگر چوتھا کہاں ہے۔ ممکن ہے پیچھے رہ گیا ہو" عثمان نے خود ہی جواب دیا۔

اب وہ لمحہ بہ لمحہ گیٹ سے کچھ دور باڑ کی بیلوں میں چھپی کسی ان دیکھی چیز کی طرف بڑھ رہے تھے۔

تم چاروں طرف سے گھیرے جا چکے ہو۔ تمہارا ساتھی ہماری حراست میں ہے بھاگنے کی کوشش کی تو گولی ماردی جائے گی۔" پارک کے تاریک گوشے میں سے ایک آواز ابھری۔

"سر حکم دیں تو گولی چلادی جائے" کسی سپاہی نے دوڑتے ہوئے پوچھا۔ دور دور تک دیوار پر سے پھلانگنے کی آواز آرہی تھی۔

"نہیں ٹھہرو! یہ مجرم ایسے بے موت مارے جائیں گے"

پہلی آواز نے جوابی حکم دیا۔

"دس گننے تک نکل کر سامنے آجاؤ ورنہ زندہ نہیں بچ سکو گے۔ آواز پھر گونج رہی تھی۔

"استاد کیا کریں، یہ تو گولی ماردیں گے وہ کالو بھی تو پکڑا گیا ہے۔ اس نے گھر کا ٹھکانہ بھی بتادیا ہوگا۔ خود پیش ہوگئے تو شاید بچت ہوجائے ورنہ تو کام اور بھی خراب ہوگا" دادو ہوئے ہوئے رستم سے کہہ رہا تھا۔

"خراب کے بچے! یہ پولیس والے حلیہ خراب کردیں گے مار مار کر تم سمجھتے کیا ہو۔ دو وارداتیں کرکے بڑے پھنے خان بن گئے ہو۔ تمہیں تو ایک بار بھی جیل جانے کا تجربہ نہیں ہے۔ آجاتے ہیں چور اُچکے ڈاکے مارنے۔ نہ تجربہ نہ عقل" رستم جب معمول استادی جتا رہا تھا۔

"استاد بس بھی کرو۔ یہ تقریر سنو وہ پانچ تک گن چکا ہے ابھی پانچ کی گنتی باقی ہے۔ بچ گئے تو کسر پھر پوری

کرلیں گے۔"

آواز گونج رہی تھی "سر جھکا کر سامنے آجاؤ ورنہ گولیوں سے چھلنی کر دیئے جاؤ گے"

سپاہی ان کے ہاتھ باندھ دو۔ اور ہاتھ باندھنے کے لئے انہی کے صافے استعمال کرو۔ آواز پھر گونجی۔ باڑ میں کئی آہٹیں ہوئیں اور ایک جوان بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے لمحوں میں دونوں مجرموں کے ہاتھ پیچھے باندھ دیئے۔ اور انہیں حکم دیا سر جھکا کر بیٹھ جاؤ۔ وہ ان کے سر پر کھڑا نئے حکم کا منتظر تھا کہ اچانک بہت سی آوازیں آنے لگیں۔

لوگ دھڑا دھڑ باڑ پھلانگ کر چلے آرہے تھے۔ عثمان ان کے آگے آگے تھا۔ ڈیپارٹمنٹل اسٹور کا مالک ان کے پیچھے پیچھے۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سر جھکائے دونوں مجرموں کو ایک ایک ٹھڈا مارا۔ اسی اثنا میں بجلی آگئی۔ چاروں طرف ہلکی ہلکی روشنی پھیل گئی۔

رستم اور دادو نے زوردار ٹھڈے سے سنبھلنے کے لئے ذرا حرکت کی تو کئی ایک گھونسے کھانے پڑے۔ انہوں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ وہاں رنگ رنگ کے لوگ کھڑے تھے۔

کوئی پولیس کا سپاہی موجود نہ تھا۔

"ہمیں اتنی بے دردی سے تو نہ مارو! انسپکٹر صاحب کہاں ہیں؟ ہمیں تھانے لے چلو۔" "کون انسپکٹر صاحب!" ایک آواز بلند ہوئی۔

"وہی جن کے حکم پر ہمیں گرفتار کیا گیا ہے۔"

انور اور عثمان دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

"دو بہادر بچوں نے خطرناک ڈاکوؤں کو گرفتار کروادیا" اگلی صبح گلیاں ہاکروں کی آوازوں سے گونج رہی تھیں۔ "دونوں نے جان پر کھیل کر مجرموں کو قابو کرلیا۔"

خالد نے بھاگ کر اخبار خریدا۔ "ارے عثمان اور انور اس کے منہ سے حیرت سے نکلا۔ ان کے فوٹو کہاں سے چھپ گئے۔ وہ عثمان کے کمرے کی طرف بھاگا۔ مگر وہ لمبی تانے سو رہا تھا۔

"عثمان، عثمان! اٹھو تمہاری تصویر چھپی ہے۔ عثمان نے ہاں ہوں کر کے کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔ وہ رات بہت دیر سے سویا تھا۔

اب خالد نے ابو کے کمرے کا رُخ کیا۔ وہ کچھ لکھ رہے تھے۔

"ابو جی! ابو جی عثمان کی تصویر چھپی ہے کیا معاملہ ہے؟"

"بھئی پڑھ لو نا" میاں محمود صاحب مسکرائے۔

"اوہ! پڑھنے کا تو مجھے خیال ہی نہیں آیا" خالد وہیں پڑھنے بیٹھ گیا۔

"جب ہم نے ایک آدمی کو کوئی چیز چھپا کر سڑک پہ ٹہلتے دیکھا تو ہم خراماں خراماں اس کے پاس گئے۔ وہ خوفزدہ ہو کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ انور نے جاتے ہی اس کے سر پہ زوردار ضرب لگائی اور وہ کوئی آواز نکالے بغیر ہی ڈھیر ہو گیا۔ پھر بھاگ کر ہم نے وہ بیگ نکالا اور ایک اور جگہ رکھ دیا۔ وہیں ہم نے طے کیا کہ کسی اور کے انتظار سے قبل کچھ نہ کچھ کر لیا جائے۔ ورنہ مجرم بھاگ جائیں گے۔

عثمان ایک تاریک گوشے میں چھپ گیا۔ اور انسپکٹر کی آواز نکالنی شروع کر دی۔ انور نے مختلف چیزیں اٹھائیں اور باڑ پر جگہ جگہ پھینکیں پھر کود کر اندر داخل ہوا۔ اور جاکر ان کو باندھ دیا۔ اسی عرصے میں عثمان بھاگ کر لوگوں کو اطلاع دینے چلا گیا۔ واپسی تک انور نے سپاہی بن کر پہرہ دیا"۔ عثمان اور انور کے تفصیلی انٹرویوز چھپے ہوئے تھے۔ اور خالد حیرت کے سمندر میں گم تھا۔

ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے مالک نے دونوں بچوں کو اس کارنامے پر دو، دو ہزار روپے انعام دیا۔ اخبارات نے کئی روز تک ان کی جرأت کا ذکر تصویروں کے ساتھ کرتے رہے۔

ہیڈ ماسٹر صاحب نے بھی مبارک کا پیغام بھیجا۔ وہ دونوں دوستوں کی جرأت و ہمت سے پہلے بھی واقف تھے۔ انہوں نے دونوں بچوں کو کھانے پر بلایا اور خوب شاباشی دی۔

تم دونوں نویں جماعت کے تو طالب علم ہو مگر اتنا دلیرانہ کام۔ تمہیں ڈر نہیں لگا۔ اگر وہ گولی چلا دیتے"

"اصل میں ہم نے ایک واقعہ پڑھا تھا۔ تب سے ہمارا خیال تھا کہ ہمیں بھی کوئی ایسا کام کرنا چاہیئے"

"کیا واقعہ تھا بھئی وہ! ہمیں بھی تو سناؤ" ہیڈ ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

عثمان نے جو واقعہ سنانا شروع کیا "مدینہ منورہ سے چار پانچ میل دور ایک چھوٹا سا گاؤں تھا "غابہ" یہاں حضرت محمدؐ کے اونٹوں کی چراگاہ تھی۔ ایک دفعہ چند لیٹرے آئے اور ان اونٹوں کو لے اڑے۔ جو صحابی ان کو چرا رہے تھے۔ ان کو شہید کر دیا۔

سلمہ بن الاکوع "غابہ" جا رہے تھے انہوں نے لیٹروں کو بھاگتے دیکھ لیا تھا۔ ادھر اُدھر کوئی مسلمان نظر نہیں

آرہا تھا۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ ڈاکو ہیں۔ انہوں نے وقت ضائع کئے بغیر ان کا پیچھا شروع کر دیا۔

وہ بہت بلا کے تیر انداز تھے۔ انہوں نے بہت تیزی اور مہارت کے ساتھ رخ بدل بدل کر ایک پہاڑی پر سے تیر برسانے شروع کر دیئے۔ لٹیروں نے سمجھا کوئی بہت بڑی جماعت ان کے پیچھے ہے۔ جب کوئی لٹیرا پیچھے مڑ کر دیکھتا۔ تو کسی درخت کی آڑ میں ہو جاتے اور اس کے گھوڑے کو نشانہ بناتے۔ گھوڑا زخموں سے بلبلا اٹھتا اور سوار بھاگ کھڑا ہوتا کہ اگر گھوڑا مارا گیا تو وہ بھی بچ نہیں سکے گا۔

لٹیرے بھاگتے رہے اور اونٹ پیچھے چھوڑتے گئے۔ یہاں تک کہ تمام اونٹ چھوڑ دیئے۔ اسی عرصے میں عینیہ بن حصن کی ایک جماعت لٹیروں کی مدد کو آگئی۔ اب انہیں تاخلا کا ان کے تعاقب میں کوئی جماعت نہیں بلکہ ایک بارہ سالہ نوجوان ہے۔

وہ سب حضرت سلمہ کو مارنے کو لپکے تو آپ ایک پہاڑی پہ چڑھ گئے اور پکار کر بولے "ذرا ٹھہرو! پہلے میری ایک بات سنو تم جانتے ہو میں کون ہوں" انہوں نے جواب دیا "ہمیں کیا علم تم کون ہو"

"سلمہ میں سلمہ ہوں الاکوع کا بیٹا مجھے قسم ہے اس ذات کی جس نے محمدؐ کو عزت دی ہے تم میں سے کوئی چاہے بھی تو مجھے نہیں پکڑ سکتا۔ اور جس کو میں پکڑنا چاہوں وہ بچ نہیں سکتا۔"

اس گفتگو سے اس ننھے مجاہد کا مطلب کیا تھا۔ ان کا اپنا کہنا یہ تھا کہ میں اس طرح ان کو دھیان میں لگا کر مدینہ یا غابہ سے مسلمانوں کی مدد کا انتظار کر رہا تھا۔ بس اسی اثنا میں نبیؐ کے شہر سے گھڑ سواروں کی ایک جماعت آتی دکھائی دی اور میرا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ خوب لڑائی ہوئی۔ کفار لٹیرے بھلا کہاں تک مقابلہ کرتے اپنے سردار عبدالرحمٰن فزاری کو کٹوا کر بھاگ کھڑے ہوئے اور پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

ننھے مجاہد سلمہ نبی صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا "حضور میں ان لٹیروں کو لوٹ مار کا مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔ کچھ مجاہد میرے ساتھ کیجئے۔ ہم ان کا تعاقب کریں گے۔"

آپؐ نے انہیں شاباشی دی اور فرمایا اب وہ اپنے گھروں کو بھاگ گئے ہیں۔ چلو جانے دو۔"

بس اس ننھے مجاہد تیر انداز کی بہادری کے واقعے نے ہی ہم سے یہ کام کروایا۔ عثمان نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

ہیڈ ماسٹر صاحب شفقت اور محبت سے بھری نظروں سے عثمان کی باتوں کو سن رہے تھے۔ "کاش تم جیسے پیارے پیارے بچے ایسے سارے ہی واقعات سے آگاہ ہوں اور جب بھی وقت اور موقع ملے۔ اپنی جرأت اور سمجھ کا اظہار بھی کیا کریں" ——— انہوں نے دونوں بچوں کو رخصت کرتے ہوئے کہا۔



چیری بلاسم

لکوئیڈ وائٹ

دیرپا صاف شفاف سفیدی

کامیاب کھلاڑیوں کا انتخاب





اسکول ہو یا کھیل کا میدان اُجلے سفید جوتے
آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتے ہیں۔
نہ اترنے والی چیری بلاسم لکوئیڈ وہائٹ پالش
سے اپنے جوتے، کرکٹ پیڈ وغیرہ
چمکدار اور اُجلے رکھیئے
یہ پالش اپنی سفیدی اور چمک کو
برقرار رکھتی ہے

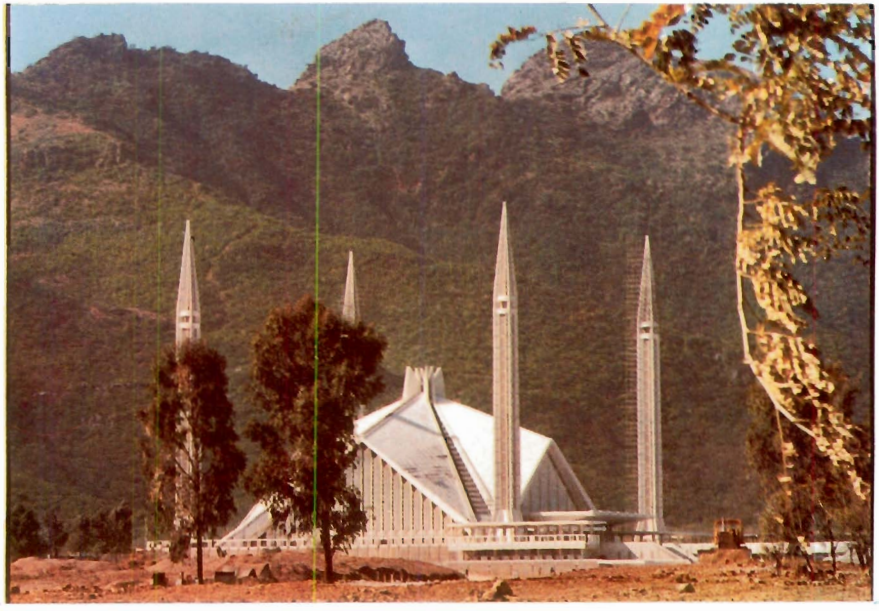
میدان میں آپ کی شخصیت کو اجاگر کرتی ہے۔

چیری بلاسم

لکوئیڈ وائٹ

فیصل مسجد

فنِ تعمیر کا شاہکار نمونہ



فوٹو ایم۔ اے پریس اسلام آباد

۱۹۵۹ء میں جب اس بات کا اعلان کیا گیا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کا دارالحکومت کراچی سے مارگلہ کی پہاڑیوں کے دامن میں منتقل کر دیا جائے اور دارالحکومت کی تعمیر ایک خاص منصوبہ بندی کے تحت کی جائے تو ایک ماسٹر پلان مرتب کیا گیا۔ اس ماسٹر پلان میں شہر کے مرکزی نقطہ پر ایک عظیم الشان مسجد کی تعمیر کا منصوبہ بھی شامل تھا۔ ۱۹۶۶ء میں سعودی عرب کے فرماں روا اور اسلامی دنیا کے محسن شاہ فیصل بن عبدالعزیزؒ نے اسلام آباد کا دورہ کیا جس کے دوران انہوں نے شکر پڑیاں کی پہاڑی پر اپنے ہاتھ سے ایک پودا بھی لگایا۔ شہر کی منصوبہ بندی کے متعلق سی ڈی اے کی طرف سے جب شاہ فیصل کو تفصیلات فراہم کی جا رہی تھیں تو اسلام آباد کے نقشے پر ایک عظیم مسجد کی نشاندہی بھی کی گئی۔ شاہ فیصل نے اس مسجد کی تعمیر کے اخراجات برداشت کرنے کا بیڑہ اٹھایا اور اس روز سے اسلام آباد کی عظیم جامع مسجد فیصل مسجد کے نام سے پکاری جانے لگی۔ یہ مسجد شاہراہ اسلام آباد کے محور پر واقع ہے۔ لیکن اسی روز سے اس شاہراہ کا نام بھی فیصل ایونیو رکھ دیا گیا ہے۔

مسجد کا ڈیزائن منتخب کرنے کے لئے اسلامی دنیا کے فنِ تعمیر کے ماہرین کا ایک مقابلہ ہوا جس میں ۳۶ سے زیادہ مسلمان ماہرین تعمیرات نے حصہ لیا۔ ترکی کے وحید دلوکے ڈیزائن کو منصفین کی جیوری نے بہترین قرار دیا اس ڈیزائن کی باقاعدہ منظوری ۱۹۶۹ء میں دی گئی اس کے بعد دیگر کاغذی کاروائی، ساخت، تعمیر اور تخمینہ کے کام کو مرتب کیا گیا۔ اکتوبر ۱۹۷۶ء میں مرحوم شاہ خالد نے مسجد کا سنگِ بنیاد رکھا۔ اس مسجد کی تعمیر کا ٹھیکہ خالصتاً پاکستانی کمپنی کو دیا گیا جس میں تمام پاکستان ہی کے مزدوروں، کاریگروں اور انجینئروں نے حصہ لیا۔

مسجد کی تعمیر پر لاگت کا اندازہ پچاس کروڑ ہے جس کا ایک بڑا حصہ سعودی حکومت نے برداشت کیا فیصل مسجد ۴۶ ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہے جس میں تعمیر شدہ رقبہ ۵۷،۱۸ ایکڑ ہے مسجد کے اندر ایک لاکھ نمازیوں کی گنجائش ہے جب کہ ملحقہ سبزہ زار کو شامل کر کے کل تین لاکھ نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

فیصل مسجد کے اہم حصے درج ذیل ہیں۔

مرکزی نماز گاہ

یہ وسیع و عریض ہال جس کا کل رقبہ تقریباً باون ہزار مربع فٹ ہے ۱۴۵ فٹ اونچی چھت جو کہ چار دو ہزار ٹن بھاری شہتیروں پر مشتمل ہے۔ اس ہال کی دیواریں خاص طور پر قبلہ رُخ ہیں جن میں خطِ کوفی میں کلمۂ توحید خط کیا گیا ہے۔

خواتین گیلری

ہال کی مشرقی جانب تھوڑی بلندی پر خواتین کے لئے گیلری ہے جس کا فرش دھاری دار سیاہ سنگِ مرمر اور دیوار سفید یونانی سنگ مرمر کی جالی پر مشتمل ہے خواتین کی گیلری میں ۱۵۰۰ خواتین بیک وقت نماز ادا کر سکتی ہیں

داخلی برآمدہ مینار

مرکزی نماز گاہ کے مشرقی جانب داخلی برآمدہ ہے اور بغیر سہارے کے شہتیروں کو خوبصورت روشنیوں سے مزین کیا گیا ہے۔ داخلی برآمدہ میں دو ہزار افراد نماز ادا کر سکتے ہیں۔

مسجد کے چاروں کونوں پر چار بلند قامت مینار ہیں کی اونچائی ۲۸۵ فٹ ہے۔ ان میناروں کے اندر سیڑھیاں اور لفٹ لگی ہوئی ہے جن پر چڑھ کر اسلام آباد کا بلندی سے نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ ہر مینار پر ایک ہلال نصب ہے جس پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے۔ ہلال سمیت ہر مینار کی بلندی ۳۰۰ فٹ ہو جاتی ہے۔

دالان اور سائبان

مسجد کا دالان اٹلی سے درآمد شدہ گرے نائٹ کے پتھر کی ٹائلوں سے آراستہ ہے۔ گرے نائٹ دنیا کے سخت ترین پتھروں میں شمار ہوتا ہے جو کہ پالش ہونے کے بعد شیشے کی طرح صاف ہو جاتا ہے۔ اور دُور سے دیکھنے پر ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے اس کی سطح پر پانی پڑا ہو چالیس ہزار افراد دالان میں نماز ادا کر سکتے ہیں۔ دالان کے کناروں پر ستون جیومیٹری انداز میں مسجد کے

ساتھ سجتے ہوئے سائبان کی شکل اختیار کرتے ہیں جس میں ۲۰ ہزار افراد کے ساتھ نماز پڑھنے کی گنجائش ہے۔

فوارہ ۔ (مرکزی نماز گاہ)

مسجد کے داخلی دروازے کے قریب نماز گاہ کی مشرقی جانب ایک فوارہ تعمیر کیا گیا ہے اس فوارہ میں سفید سنگِ مرمر کا کام انتہائی خوبصورت انداز میں کیا گیا ہے۔

عکسی تالاب ۔

قبلہ رُخ دیوار کے نیچے فوارے اور تالاب بنائے گئے ہیں۔ تالاب کی سطح پر نیلی ٹائلوں کا خوبصورت کام کیا گیا ہے۔ یہ تالاب خوبصورتی کے علاوہ مسجد کے درجہ حرارت کو کنٹرول کرنے کے کام بھی آتے ہیں پانی کی سطح جب نیچی کر دی جاتی ہے تو ٹھنڈی ہوا مرکزی نماز گاہ میں داخل ہو جاتی ہے اور جب سطح کو اونچا کر دیا جائے تو یہ ہوا رک جاتی ہے۔

وضو ۔

جنوبی سمت سے داخل ہوتے ہوئے مسجد کے بڑے چبوترہ کے بالکل سامنے وضو کے لئے سفید سنگِ مرمر کے چوکٹھے بنائے گئے ہیں جب کہ دیواروں پر رنگ دار ٹائلوں کو خوبصورت انداز میں لگایا گیا ہے یہ ٹائلیں خاص طور پر ترکی سے درآمد کی گئی ہیں اس جگہ ایک بہت بڑا فوارہ تعمیر کیا گیا ہے جس کے اردگرد بہت سے چھوٹے فوارے بنائے گئے ہیں۔ درمیانی فوارے سے پانی ۳۵ فٹ کی بلندی تک جاتا ہے۔ اسی قسم کا ایک اور فوارہ مرکزی دروازہ کے بالکل سامنے لگایا گیا ہے۔

فانوس ۔

مرکزی نماز گاہ کے بالکل وسط میں ایک بہت بڑا سنہری رنگ کا فانوس لگایا گیا ہے اس فانوس میں گیارہ سو سے زیادہ بجلی کے بلب لگے ہوئے ہیں۔ یہ فانوس اپنی نوعیت کا واحد فانوس ہے جسے المونیم کے پائپوں سے تعمیر کیا گیا ہے اس کا وزن سات ٹن کے قریب ہے۔

منبر ۔ محراب

یونان سے درآمد شدہ سفید سنگ مرمر سے ایک بلند منبر تعمیر کیا گیا ہے جس پر ملک کے مشہور مصور گل جی نے قیمتی پتھروں میں سورۃ فاتحہ کی خطاطی کی ہے منبر کے عین اوپر ایک طلائی ہلال نصب ہے

محراب ایک کتاب کی شکل میں تعمیر کیا گیا ہے جس کے دونوں اوراق پر کوفی خط میں سورۃ رحمٰن کندہ کی گئی ہے اور دونوں کناروں پر اللہ تعالیٰ کے صفاتی نام سونے میں کندہ ہیں محراب کے درمیان لفظ اللہ قیمتی پتھر میں تحریر کیا گیا ہے مرکزی نماز گاہ کی شمالی جانب موذن کے لئے چبوترہ بنایا گیا ہے جس کی عقبی دیوار پر ملک کے نامور خطاط اور مصور صادقین کی خطاطی نصب ہے۔ یہ خطاطی مرحوم صادقین نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کی تھی۔

اسلامی یونیورسٹی ۔

مسجد کے مشرق میں دالان سے نچلی سطح پر اسلامی یونیورسٹی قائم ہے جب کہ شمالی سمت ایک بہت بڑا کانفرنس ہال بھی تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔

سبق

نعیمہ خاتون شمع

اسٹیج تیار ہوگیا، سامنے کے بانسوں پر پہلے رنگین کاغذ لپیٹا گیا پھر گھر سے لاکر امی اور باجی کے رنگین دوپٹے قرینے سے لٹکا کر مزید خوبصورتی پیدا کی گئی۔ اسٹیج کی پشت پر کئی فٹ کے طول و عرض کا بڑا سا بینر اپنی دلکشی اور دلآویزی کی داد آپ طلب کر رہا تھا۔



کسی ماہر پینٹر نے بڑی خوبصورتی اور جدید انداز میں سنہرے رنگ سے اس پر لکھا تھا۔ "جشنِ سالگرہ بابائے ملّت" اور نیچے دوسری لائن میں "زیرِ اہتمام انجمن طلبہ و اطفال بلوچ گوٹھ" درج تھا۔

الماس جس نے گزشتہ سال میٹرک کے امتحان میں بورڈ بھر میں نمایاں پوزیشن حاصل کی تھی۔ وہ بہت ذہین لڑکا تھا۔ اسے نصابی سرگرمیوں سے ہٹ کر بھی گوٹھ کے بچوں اور طلبہ کے لئے کچھ نہ کچھ کرتے رہنے کا شوق تھا۔ اور وہ بھی تقاریب کو بڑے اہتمام سے منایا کرتا تھا۔ تقاریب کا سارا انتظام علاقے کے لوگ امدادِ باہمی کی بنیاد پر کیا کرتے تھے۔ اس بار بھی ایسا ہی ہوا، مگر الماس خود کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

شاکر، انور، رفیق اور زاہد سارے پروگرام میں پیش پیش تھے، انہوں نے ہی پروگرام مرتب کیا۔ چندہ جمع کر کے سارے انتظامات کئے۔ آج ۲۴ دسمبر کی رات تھی... اور ۲۵ دسمبر کے دن بابائے ملت حضرت قائد اعظمؒ محمد علی جناح نے دنیا میں آ کر زندگی کا آغاز کیا تھا۔ اسٹیج کی تزئین کے بعد وہ چاروں ستانے کے لئے ذرا دیر بیٹھے ہی تھے کہ شامیانے کے باہر ایک رکشہ آ کر رکا۔ اور اس میں سے ندیم کود کو باہر اترا۔ اُسے دیکھ کر ان چاروں کے چہروں کے گلاب کھل گئے "لے آئے ایمپلی فائر اور لاؤڈ اسپیکر....." رفیق اور زاہد نے ایک ساتھ خوشی سے چہکتے ہوئے پوچھا..... "ڈسکو گیتوں کے ریکارڈ بھی لایا ہے نا...." شاکر نے بے صبری سے سوال کیا۔ ہاں، ہاں بالکل لیٹیسٹ گانے لایا ہوں" ندیم اتر کر بولا.... پھر ان سب نے مل کر سامان اتروایا اور اسٹیج کے قریب لے جا کر رکھ دیا۔

الیکٹریشن نے بتائی ہوئی جگہ پر چاروں لاؤڈ اسپیکر لگا دیئے پھر ایمپلی فائر سے کنکشن کیا اور ٹسٹ کر کے ان کے حوالے کر دیا۔ "چلو بھئی ریکارڈ لگاؤ"۔ انور نے پوچھا۔ "کون سے ریکارڈ سے آغاز کر رہے ہو، رفیق نے کہا۔ شیدی جامبو والا لگاؤ..... رنگ جم جائے گا"۔ شاکر نے رائے پیش کی.. "ارے پاگل تو نہیں ہو گئے ہو۔ بابائے ملّت کا جشنِ سالگرہ اور شیدی جامبو کے ریکارڈ سے"..... یہ سنتے ہی سب اس کا مُنہ حیرت سے تکنے لگے..... مگر کچھ بول نہ سکے۔ شاکر نے جلدی سے محمد علی شہکی کا، تیرا پاکستان ہے یہ میرا پاکستان ہے۔ ریکارڈ لگا دیا اور سارا گوٹھ اس کی آواز سے گونجنے لگا اور اس کے بعد "یہ دیس ہمارا ہے، اسے ہم نے سنوارا ہے" لگا کر خود کسی کام سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد جب ریکارڈ ختم ہوا تو انور نے جھٹ اپنی پسند کا ریکارڈ لگا دیا اور سب شیدی جامبو کی دھن پر تھرکنے لگے اسی ریکارڈ کو سن کر بہت سے دوسرے بچے بھی شامیانے کے گرد آن کر جمع ہو گئے۔ وہ ختم ہوا تو کسی نے محمد رفیع کی آواز میں ایک گانا لگا دیا۔ اور پھر تو ایسے ہی ڈسکو دھن والے نغموں کی جو لائن لگی تو ایک کے بعد ایک وہی بجتے چلے گئے... درمیان میں زاہد نے

سمجھانے کی کوشش بھی کی، کہ سارے یہی نغمے بجاؤ گے تو لوگ ناراضگی کا اظہار کرنے یہیں آجائیں گے بابائے ملت کے جشن سالگرہ کے نام پر تقریب منا رہے ہو تو قومی گیت بھی لگاؤ، اب رہنے دے۔ بڑا آیا قومی گیتوں کا شوقین اصل فنکشن تو کل صبح ہے۔ جتنا دل چاہے کل سُن لینا قومی نغمے،..... ریڈیو، اور ٹی وی بھی دن بھر وہی نشر کریں گے۔ انور نے منہ بنا کر کہا۔

دیکھو اس تقریب کا انعقاد سب کے چندے اور سب کے تعاون سے ہو رہا ہے یہ تمہارا ذاتی پروگرام نہیں ہے، جو تم اپنی مرضی دوسروں پر ٹھونسو.... زاہد نے نرمی سے سمجھاتے ہوئے کہا... ہمیں اگر دوستوں کی پسند کا احترام نہیں تو کم از کم اسی بات کا خیال کر لینا چاہئے کہ یہ فنکشن قائد اعظم کے نام پر ہو رہا ہے۔ سوچو تو ان کی روح ایسے بے ہودہ گانے سن کر کس قدر اذیت میں ہو گی۔

رفیق نے بھی سمجھانے کی کوشش کی۔ اسی پر شاکر کا موڈ بری طرح آف ہو گیا، وہ جھلا کر بولا۔ یار تم بھی عجیب ہو،..... زاہد کی ہاں میں ہاں ملانے لگے، ہاں میں ہاں ملانے کی بات نہیں ہے تم خود ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچو کہ ہم نے لوگوں سے کیا کہہ کر چندہ اکٹھا کیا ہے .... اگر ہم لوگوں سے یہ کہتے کہ ڈسکو گانوں کی محفل ہو گی تو کون ہمیں چندہ دیتا، مگر شاکر کی سمجھ میں پھر بھی نہ آیا۔ وہ بدستور اپنی پسند کے ڈسکو دھنوں والے نغمے ہی بجاتا رہا۔ زاہد اور انور دونوں وہاں سے ناراض ہو کر چلے گئے۔

گھنٹے بھر بعد جب زاہد اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے وہاں پہنچا تب بھی شاکر دھنوں کے ریکارڈ بجا رہا تھا۔ اور شاہد، انور وہاں نہیں تھے... اُس نے پہلے تو آواز کم کرنے کو کہا، پھر پوچھا یہ انور اور شاہد نظر نہیں آرہے کہاں چلے گئے.... جائیں گے کہاں، بڑا مروڑ اٹھ رہا تھا قومی و ملی نغموں کا ان کے پیٹ میں۔ ناراض ہو کر چلے گئے..... اب کہیں بیٹھے کتابوں میں دماغ کھا رہے ہوں گے، یا پھر میری پسند پر ماتم کر رہے ہوں گے وہ منہ بنا کر بولا۔ یہ تو بہت برا ہوا، تمہیں ان کو ناراض نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تمہیں علم نہیں کہ الماس کے بعد وہی دو تو ایسے ہیں جن پر گوٹھ کے لوگوں کو اعتماد ہے۔ اگر وہ ساتھ نہ ہوتے تو ہمیں اتنا چندہ بھی نہ ملتا شاکر نے نرمی سے کہا۔

تو کیا وہ دونوں تقریب کا بائیکاٹ کر رہے ہیں۔ عامر نے پوچھا تو وہ چونک گئے..... ارے تم کب آئے عامر.....؟ شاکر نے سوال کیا۔ میں تو بڑی دیر سے تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا۔ چلو وہ اگر روٹھ کر چلے گئے ہیں تو اچھا ہی ہوا، پتہ نہیں ان کی کھوپڑی میں بزرگوں کا دماغ کہاں سے آگیا..... لڑکپن اور شوخی کی تو کوئی بات ہی نظر نہیں آتی ان میں..... عامر مسکراتے ہوئے بولا... بھائی عامر کچھ بھی ہو یہ بات تو ماننا پڑے

گی کہ گوشت میں اشران کا ہی ہے۔ ہم میں سے کسی اور کا نہیں۔ وہ جو کہہ دیتے ہیں۔ لوگ مان لیتے ہیں۔ کوئی بھی چوں نہیں کرتا... چلو ہم دونوں انہیں تلاش کر کے منالائیں .. کہتے ہوئے وہ وہاں سے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چلدیئے...

ان کے جاتے ہی ریکارڈنگ کی آواز تیز ہوگئی اور تیز ڈسکو دھنیں فضا میں تیرتی رہیں... دیر تک وہ اپنے اس مشغلے میں مصروف رہے۔ آخر تھکن اور نیند غالب آنے لگی۔ اور نجانے کب اونگھتے اونگھتے گہری نیند کی وادیوں میں کھو گئے۔

انور اچانک کسی بات پر چونک کر اٹھ بیٹھا۔ آنکھیں مل کر گھڑی کی طرف دیکھا تو شب کے تین بج رہے تھے۔ رفیق کے خراٹے شامیانے میں گونج رہے۔ رات بھر جاگنے کا دعویٰ کرنے والا گھوڑے بیچ کر سو رہا تھا۔ پھر اس کا دھیان ریکارڈ پلیئر اور ریکارڈوں کی طرف گیا۔ دونوں چیزیں اپنی جگہ موجود نہیں تھیں۔ اس کی ساری نیند اڑ گئی۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ اور ادھر اُدھر نظر ڈالی۔ مگر وہ اُسے نظر نہ آئیں۔ البتہ ایمپلی فائر اپنی جگہ ویسے ہی رکھا ہوا تھا۔ اب وہ کھڑا ہو گیا اور گھبرائے ہوئے انداز میں اسٹیج کے تخت کے نیچے دیکھنے لگا۔ مگر وہاں خود اس کے اور شاکر کے جوتے پڑے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ سامنے کی رُو میں معززین کے لئے بچھے صوفوں کے نیچے جھانکا مگر ریکارڈ پلیئر اور ریکاڈوں کا بکس کہیں نظر نہ آیا۔ وہ چکرا سا گیا۔ اُس نے شاکر کو بھی بری طرح جھنجھوڑ کر جگا دیا جیسے ہی شاکر کو ان اشیاء کی گمشدگی کا پتہ چلا اس کی نیند بھی بھاگ گئی۔ دونوں بڑی فکرمندی سے سوچنے لگے۔ شاکر بولا۔ دونوں کی مالیت ڈیڑھ ہزار سے کم نہ ہوگی آخر ہم لوگ کہاں سے دیں گے۔ انور نے کہا یار یہ تو بعد کی بات ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ان دونوں چیزوں کو یہاں سے کون اور کہاں لے گیا ہے... ہم دونوں ہی یہاں تھے۔ اس لئے یہ طے ہے کہ ساری ذمہ داری ہم پر ہی آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پولیس میں رپورٹ درج کرادیں چوری کی.... شاکر نے سوچتے ہوئے اپنا خیال پیش کیا... یار ابھی تک نیند ہی میں ہو اور اگر نیند میں نہیں ہو تو پھر ثمائد گھاس کھا گئے ہو... پولیس میں رپورٹ درج کرانے کا نتیجہ سمجھتے ہو... تفتیش کا آغاز ہم سے ہی ہوگا۔ کھال اُدھیڑ کر رکھدیں گے وہ لوگ...

پھر تم ہی بتاؤ..... میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا... وہ بے چارگی سے بولا... پھر وہ دونوں مل کر دوبارہ صوفوں کے نیچے، کرسیوں کے پیچھے اور ادھر اُدھر نظریں دوڑا کر ریکارڈ پلیئر اور ریکارڈ بکس تلاش کرنے لگے اسی دوران قنات کے اوپر سے ایک لفافہ ان کے قدموں میں آن گرا۔ دونوں بری طرح چونک گئے۔ لفافہ اٹھایا اور اُلٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ شاکر نے اُسے کھول لیا۔ اندر صاف ستھری تہہ میں ایک پرچہ رکھا ہوا تھا... انور نے

نہایت بے صبری سے اُسے جھپٹ لیا نکال لیا اور پڑھنا شروع کیا، لکھا تھا۔

دوستو ــــــ۔

تم لوگوں نے تو کسی کی بھی تکلیف کا خیال نہیں کیا۔ تم لوگوں نے یہ سوچا کہ یہاں طالب رہتے ہیں جو ہوم ورک میں مصروف ہوں گے یا اسٹڈی میں۔ یہاں بڑے، بوڑھے اور مریض بھی ہوں گے جن کو آرام کی ضرورت ہوگی، یہاں کا رہنے والا سارا طبقہ مزدوروں کا ہے جو دن بھر کی تھکن کے بعد اپنی نیند لے کر تازہ دم ہوتا ہے تاکہ اگلے دن پھر کام کے لئے تیار ہو سکے..... تم لوگوں نے اس طرح ریکارڈنگ کی کر اپنے ہی ساتھیوں کو ناراض کر دیا اور ان کے نیک مشورے کو ٹھکرا دیا۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ دونوں چیزیں غائب کر دی جاتیں اور تم سے وصول کی جاتیں، مگر ہم تمہاری طرح نہیں سوچتے ــــ اس لئے ہم نے دونوں چیزیں ان کے اصل مالکوں کو پہنچا دی ہیں اور تم دونوں سے گزارش ہے کہ اب رات کے رویہ پر دل ہی دل میں شرمندہ ہو کر آئندہ کے لئے ایسا نہ کرنے کا عہد کر لو ــــ اور اچھے بچے بن جاؤ... فقط تمہارے خیر خواہ ....

خط پڑھ کر دونوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ان کی گھبراہٹ اور پریشانی دور ہو چکی تھی۔ وہ خط کو بار بار الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے کہ خیر خواہ کا نام معلوم ہو جائے مگر ناکام رہے۔ آخر انور بولا۔ چھوڑ یار ہمیں آم کھانے سے مطلب رکھنا چاہیئے۔ دونوں چیزیں اپنے مالک کے پاس پہنچ گئیں یہی ہمارے لئے خوشی اور شکر کی بات ہے اور ہم ڈنڈ بھگتانے سے بچ گئے، اگر وہ ایسا نہ کرتا تو سارے گوٹھ میں نکو بن جاتے... میں عہد کرتا ہوں آئندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کروں گا۔ شاکر نے بھی اس کے الفاظ دھرا دیئے۔ پھر دونوں اپنی نیند پوری کرنے کے لئے وہیں لیٹ گئے.....

یادداشت

ایک شادی شُدہ آدمی کو کاروں کی ریس کا بہت شوق تھا۔ ہر وقت اس کی زبان پر کاروں کا نام رہتا تھا اور ریس کی باتیں کرتا تھا۔ ایک دن اس کا دوست اسے سمجھانے لگا۔ کیا ہر وقت یہی باتیں کرتے رہتے ہو۔ نہ صرف لوگ تم سے بور ہوتے ہیں بلکہ تمہاری بیوی بھی تم سے سخت ناراض ہے تم کاروں اور ریس کے پیچھے اتنے دیوانے ہو گئے ہو کہ میرا خیال ہے یہ بھی بھول گئے ہو کہ تمہاری شادی کا دن کونسا ہے۔

واہ یہ کیا بات ہوئی۔ آدمی جھٹ بولا میری شادی اُس دن ہوئی تھی جس دن ریڈ وائٹ کار ریس جیتی تھی۔



* اسلامی جمہوریت کا استحکام
* مساوات پر مبنی معاشی نظام کا فروغ
* رشوت ، بے انصافی اور بدعنوانیوں کے خلاف جہاد
* جہالت کا خاتمہ اور قوم کو جدید سائنسی دور سے ہمکنار کرنا
* قومی اتحاد کو مضبوط بنانا

اسکی تکمیل میں تعاون ہمارا فرض ہے

نیشنل بینک آف پاکستان
قومی ترقی قومی بینک

United

PID-1-26/87

مشاغل کی کہانی

عقیل عباس جعفری

پھول پتیاں جمع کرنا

جو بچے قدرت اور مناظرِ قدرت میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے لئے پھول اور پتے جمع کرنے کے مشغلے سے بہتر کوئی مشغلہ نہیں۔ بچوں کے لئے یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہے اور بڑوں کے لئے ایک اہم علم۔ یوں بھی مشغلہ وہی اختیار کرنا چاہیے۔ جس سے ایک طرف وقت اچھا گزر جائے اور دوسری طرف اُس سے معلومات میں بھی اہم اضافہ ہو۔

اس مشغلے کو شروع کرنے کے لئے محض چند اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ جن میں دو تین چھوٹی قینچیاں، ایک چھوٹا چاقو ایک استعمال شدہ برش، بلاٹنگ پیپر کی چند شیٹیں، چند پرانے اخبارات اور کوئی بھاری چیز مثلاً کتاب وغیرہ شامل ہیں۔ اس مشغلہ کے شوقین کو مشغلہ شروع کرنے سے پہلے پودے کے تمام حصوں مثلاً جڑ، تنا، شاخ، پتے پھول اور پھل کی تعریف اور اس کی تفصیلات کا بنیادی علم بھی حاصل کرلینا چاہیے۔ تو آیئے سب سے پہلے ہم آپ کو پودے کے انہی اجزاء کے بارے میں مختصراً بتاتے ہیں۔



جڑ (ROOT) یہ پودے اور درخت کا وہ حصّہ ہوتا ہے جو زمین کے نیچے پھیلتا چلا جاتا ہے۔ جڑ پودے کو زمین میں مضبوطی سے گاڑے رکھتی ہے اور زمین سے غذا اور پانی جذب کر کے مختلف حصّوں میں پہنچاتی ہے۔

تنا (STEM) یہ پودے کا بالائی حصّہ ہوتا ہے۔ غذائی مادہ جڑ میں سے ہو کر تنے کے ذریعہ شاخوں اور پتوں تک پہنچتا ہے۔

شاخ (BRANCH) شاخ بھی ایک طرح سے تنے ہی کی ایک ذیلی قسم ہے۔ تنے سے غذائی مادہ پتوں اور پھولوں تک پہنچتا ہے۔

پتے اور پتیاں (LEAF AND LEAFLETS) یہ پودے کا وہ حصّہ ہے جو سانس لیتا اور خوراک بناتا ہے۔

پتوں کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ پہلی قسم سادہ پتہ (SIMPLE LEAF) کہلاتی ہے۔

دوسری قسم (COMPOUND LEAF) کہلاتی ہے۔ اس میں چھوٹی چھوٹی پتیاں ہوتی ہیں جو پتہ کی شاخ پر اُگی ہوتی ہیں۔

تیسری قسم کے پتوں میں پتیاں، شاخ پر آمنے سامنے اُگی ہوتی ہیں۔ اسے (OPPOSITE LEAF) کہا جاتا ہے۔

چوتھی قسم کے پتوں میں پتیاں آمنے سامنے تو ہوتی ہیں۔ مگر وہ ٹہنی پر یکے بعد دیگرے اُگی ہوتی ہے۔ اس قسم کے پتوں کو ALTERNATE LEAF. کہا جاتا ہے۔

پھول (FLOWER) پھول پودے کا سب سے اہم حصّہ ہے۔ اور اسے پودے کے افزائشی نظام میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

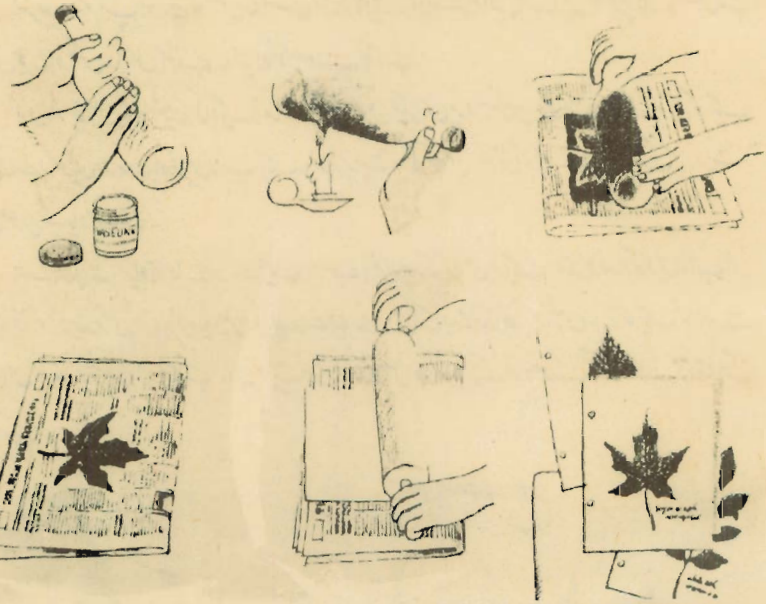
پھل (FRUIT) پھل، پھول کے تخم سے پیدا ہوتے ہیں۔ پھل کے اندر بیج بن جاتے ہیں جو اس پھل کے مزید درختوں اور پودوں کی افزائش کے لئے استعمال ہوتے ہیں۔

اب ہم آپ کو پھول اور پتے جمع کرنے کے مشغلے کے بارے میں بتاتے ہیں۔

پھول اور پتے جمع کرنے کے لئے سب سے مناسب وقت مارچ سے ستمبر تک کا ہے۔ آپ جو بھی پھول اور پتے جمع کرنا چاہیں۔ انہیں انتہائی نفاست سے قینچی کی مدد سے پودے سے _____ توڑ لیں ساتھ ہی ساتھ آپ کسی اچھی حوالہ جاتی کتاب کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیں کہ اس پھول کا نام، خاندان، نوع، کلاس اور سب کلاس کیا ہے۔ جب آپ عام طور پر پائے جانے والے تمام پھول اکٹھا کر لیں تو پھر نایاب پھول جمع کرنے کی طرف توجہ دیں۔

پودے سے جُدا ہونے کے صرف چند گھنٹے بعد ہی پھول اور پتے مُرجھانا شروع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں محفوظ کرنے کا عمل بھی فوراً شروع کر دینا چاہیے۔

اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے پھول اور پتوں کو بلاٹنگ پیپر یا اخبار کے درمیان رکھ کر کسی بھاری چیز مثلاً کسی کتاب وغیرہ سے دبا دیں۔ اور انہیں چار سے چھ ہفتے کے لئے کسی گرم اور خشک جگہ پر رکھ دیں۔ تاہم بلاٹنگ پیپر یا اخبار کو وقتاً فوقتاً تبدیل کرنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ پھول اور پتے اچھی طرح خشک ہو جائیں۔ ابتدائی مرحلے میں انہیں دن میں دو یا تین مرتبہ تبدیل کیا جانا چاہیے۔



جس وقت پھول اور پتے پودے سے توڑے جائیں۔ اسی وقت ایک علیحدہ کاغذ پر اُس پودے کا نام، پھول کا نام، پتے کی تفصیلات، پودے کی اونچائی، رنگ، مٹی کی قسم، مقام اور تاریخ وغیرہ نوٹ کر لیں۔

چار سے چھ ہفتے کے بعد جب پھول اور پتے مکمل طور پر خشک ہو جائیں تو انہیں یا تو خاص طور پر تیار کردہ کسی البم میں محفوظ کر لیں یا کسی کارڈ بورڈ پر سفید یا سیاہ کاغذ کے اوپر چپکا دیں۔ بعد میں اس کارڈ بورڈ کو کسی تصویری فریم میں لگا دیں۔ اس طرح یہ پھول ہمیشہ کے لئے محفوظ بھی ہو جائیں گے اور خوبصورت ڈیکوریشن پیس کا کام بھی انجام دیں گے پھول اور پتے جمع کرنے کے شائق کو چاہیے کہ وہ ہر طرح کے پھول اور پتے جمع کرنے کی بجائے محض ایک مخصوص

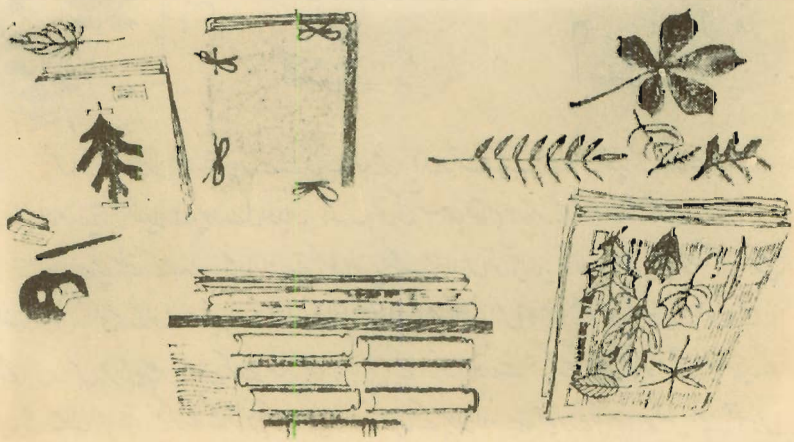
خاندان، ایک مخصوص نوع یا ایک مخصوص کلاس اور سب کلاس کے پھول اور پتے جمع کرے۔ اس کا مجموعہ زیادہ اہمیت کا حامل ہو جائے گا۔

پھول اور پتے جمع کرنے کے شائقین پتوں کے خوبصورت پرنٹ بھی بناتے ہیں جن کا ایک طریقہ تو وہی ہے جو کسی کاغذ پر کسی سکے کا عکس حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی پتے کو کسی سخت سطح پر رکھ کر اُس پر ایک سفید کاغذ رکھ دیا جائے پھر کاغذ کی بالائی سطح پر اچ بی یا کریون کی کسی پنسل کو گھسا جائے۔ اس طرح کاغذ پر پتے کا عکس کسی اسکریپ بک یا البم میں محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

مگر یہاں ہم آپ کو پتے کا عکس حاصل کرنے کا ایک دوسرا طریقہ بتا رہے ہیں جو اگرچہ ذرا سا مشکل ہے مگر اس طرح جو عکس حاصل ہوتا ہے وہ زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔

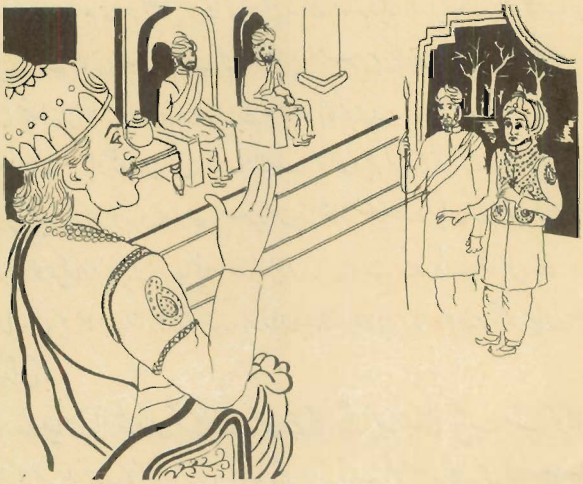
اس طریقہ میں پہلے شیشے کی ایک صاف ستھری بوتل لیکر اس پر ویسلین لگا دیں پھر اس بوتل کو ایک موم بتی کے دھوئیں سے سیاہ کر دیں۔ اب ایک اخبار پر پتہ رکھ کر اس پر بوتل کو پھیریں۔ یہاں تک کہ وہ پتہ مکمل طور پر سیاہ ہو جائے۔

جب وہ پتہ سیاہ ہو جائے تو اسے ایک دوسرے اخبار پر رکھ کر اُس پر ایک سفید کاغذ رکھ دیں۔ اب اس سفید کاغذ کو اوپر سے کسی گول بوتل یا بیلن کی مدد سے دبائیں۔ اس کے بعد کاغذ اٹھا کر دیکھیں پتے کا ایک خوبصورت عکس اس کاغذ پر منتقل ہو چکا ہے۔ اس طریقے سے پتوں کے عکس حاصل کر کے خوبصورت تہنیتی کارڈ بھی تیار کئے جا سکتے ہیں۔



رفعت ہمایوں

سُکھ چَین کا محل



آیئے آپ کو ایک واقعہ سنائیں... ایک انوکھی بات بتائیں..... ایک تھا بادشاہ ..... وہ بہت بیمار رہنے لگا۔ حکومت کے کام اب اُس سنبھالے نہیں سنبھلتے تھے۔ وزیروں، امیروں نے مشورہ دیا کہ حضور اب آپ آرام کریں اور تخت و تاج شہزادے کو سونپ دیں۔

مگر اُس کی عمر... ؟ بادشاہ بے چارہ پریشان ہوگیا۔

"کوئی فکر کی بات نہیں ہم جو موجود ہیں اور اللہ رکھے آپ کی نگرانی جو رہے گی۔"

تو بچو! یوں سب نے بادشاہ کو یقین دلایا کہ ہم سب ایمانداری سے کام کریں گے اور شاہ زادے کی راہ نمائی بھی کریں گے۔

اُس زمانے میں لوگوں کو زبان کا بڑا پاس ہوا کرتا تھا۔ وہ جو کہتے تھے کیا بھی کرتے تھے۔ بددیانتی دھوکہ بازی عام نہ تھی۔ دراصل فساد کی جڑ یعنی "خودغرضی" کا لوگوں کو ابھی اتنا پتہ نہیں تھا۔ آپ سمجھ رہے ہیں ناں ہماری بات؟

.... خیر کافی سوچ بچار کے بعد بادشاہ نے اپنے بیٹے کو بلایا اور کہا۔

" بیٹا! اب ہم بوڑھے ہو گئے ہیں اور ہمارے اللہ اللہ کرنے کے دن ہیں۔ بہت دنیاداری کی اب جی چاہتا ہے کہ اپنے اصل مالک سے ناطہ جوڑیں۔ سوچتے ہیں کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو۔ عقلمند بھی ہو۔ مگر بیٹے عقلمند ہونا ہی کافی نہیں اسکا استعمال اور اس کی مثال پیش کرتے رہنا چاہیئے تاکہ رعایا تم سے مرعوب رہے، تمہارا احترام کرے اور یوں بدی کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے۔ حاکم ذہین اور دیانتدار ہو تو لوگ زیادہ بدی کی طرف مائل نہیں ہوتے انہیں خدشہ رہتا ہے کہ وہ غلطی پر یا جرم پر پکڑے جائیں گے۔ تو شہزادے میاں اب آپ تخت و تاج سنبھالیں اور ہماری ذمہ داری کے بوجھ کو ہلکا کریں۔

یوں شہزادے بادشاہ بن گئے۔ ایک مناسب موقعہ دیکھ کر تاج اُن کے سر پر رکھ دیا گیا۔ تاج کیا کیا تھا بس یوں سمجھیں کہ ذمہ داری کا بوجھ سر پر آن پڑا تھا۔ شہزادے میاں نے خوب خاموشی سے دربار کا جائزہ لیا۔ وزیروں کو دیکھا۔ امیروں کو جانچا۔ درباریوں میں بہت سے لوگ شامل تھے۔ ہر طبقے کی نمائندگی کرنے والے۔ معماروں کا معمار، سناروں کا سُنار۔ بزازوں کا بزاز اور وزیروں کا وزیر اعظم میاں شہزادے کو یہ بات بڑی پسند آئی۔

شہزادے میاں بادشاہ بن کر پھولے نہ سمائے کہنے لگے اچھا بھائی! آپ سب کو بھی مبارک ہو۔ مگر اس سے پہلے کہ ہم حکومت کا آغاز کریں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ایک خوبصورت سی عمارت بنائی جائے۔ جس میں ریشمی پردے ہوں۔ جس کی دیواروں پر چاندی کے نقش و نگار ہوں۔ جس میں جھرنے اور چشمے بہتے ہوں جس میں باغ ہوں۔ ہر کمرے میں خوبصورت قالین ہوں۔

بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی عمدہ محل ہو۔ ایسا کہ اس جیسا کوئی دوسرا روئے زمین پر نہ ہو۔ اور وزیر اعظم صاحب یہ محل آپ اپنی نگرانی میں بنوائیں گے۔

محل کے لئے جگہ کا انتخاب ہوا اور وزیر اعظم صاحب خوش خوش یہ کام کرنے کو تیار ہو گئے۔ معمار عمارت بنانے کی چیزیں منگوانے لگا۔ درزی پردے سینے لگا۔ قالین، کھڈیوں پر بُنے جانے لگے۔ مزدور اور گدھے جمع کئے گئے اور کاریگر نقش و نگار بنانے کے لئے سونا چاندی اور ہیرے جمع کرنے لگے اور یمن سے بُرغ یاقوت خصوصی طور پر تخت کے لئے منگوائے گئے۔

ایک دن شہزادے کو اطلاع ملی کہ حضور محل تیار ہے۔ معصوم صورت والا کم سن شہزادہ بہت خوش ہوا۔ بگھی تیار ہوئی اور شہزادہ محل کی طرف چلا۔ تھوڑی دیر میں بگھی منتخب جگہ پر جاکر رکی۔ اور شہزادہ یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ جگہ ویسی کی ویسی ہی پڑی تھی۔ جیسی کہ کچھ عرصہ پہلے تھی۔ وہی جھاڑیاں وہی خودرو پودے اور ویسا ہی بہتا ہوا دریا اور بائیں جانب خوشنما پہاڑی اور پھول۔ شہزادہ بہت ہی حیران ہوا۔ وزیر اعظم بھاگا بھاگا آیا اور بولا۔..... حضور مبارک ہو! محل تیار ہے۔ ارے! آپ اندر تشریف لائیے ناں باہر کیوں کھڑے ہیں۔ آیئے بڑے پھاٹک میں پہلے آپ قدم رکھیں۔

شہزادہ حیران پریشان وزیر اعظم کے بتائے ہوئے ان دیکھے گیٹ کی طرف بڑھا۔ دربان نیزے لئے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ انہوں نے نیزے ہٹا لئے اور شہزادہ محل کے اندر آگیا۔ معمار نے آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہا۔ کچھ لوگ اس طرح بیٹھے تھے جیسے وہ باغ میں بیٹھے ہوں۔ ایک شخص خیالی فوارے کے گرد گھوم رہا تھا اور خوشی سے چہک رہا تھا کہ اس فوارے کا پانی کتنا رنگین ہے۔ ایک شخص تالاب سے مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔ وزیر اعظم کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ وہ ایک ایک چیز کی تعریف کر رہا تھا..... حضور! ایسا محل تیار ہوا ہے کہ بس اس کی تو مثال ہی نہیں مل سکتی.. کیوں حضور پسند آیا؟ شہزادے نے حیرانی سے پوچھا... مم... مگر محل کہاں ہے؟..

وزیر اعظم بے چارے کی تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں وہ بولا۔ ارے حضور کو کیا ہوا؟..... محل ہی میں تو آپ کھڑے ہیں، کہیں حضور کی طبیعت تو.....؟ نہیں شہزادے نے یہ بات کاٹ دی وہ شرمندہ ہو گیا۔ خیر آپ آگے بتائیں۔ وزیر اعظم نے سر جھٹکا اور دوبارہ شروع ہو گیا۔ یہ دروازہ جناب عالی دنیا کا سب سے بڑا دروازہ ہے۔ ملاحظہ فرمایا...؟ آیئے اندر تشریف لائیے۔ اور وہ دونوں خیالی محل کے اندر چلے گئے وزیر اعظم خوشی خوشی چہکتا رہا..... یہاں حضور کا دربار لگے گا۔ یہ شہ نشین ہے۔ اور یہ حضور کی خواب گاہ ہے۔ پردوں کو ہاتھ لگا کر دیکھیں۔ اصل ریشم کے تاروں سے بنا ہوا ہے۔ چھونے سے محسوس ہی نہیں ہوتا۔ شہزادہ حیران حیران سا بے در و دیوار محل کو دیکھتا ہوا۔ اپنی آنکھوں پر شبہ کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ پھر حیران ہو کر پوچھا۔ ہمارا تخت کہاں ہے؟ یہ رہا حضور ملاحظہ ہو۔ کیسا انوکھا تخت ہے؟ شہزادہ پریشانی سے سر کھجاتا ہوا ان کی بتائی ہوئی خیالی چیزوں کی تفصیل سنتا رہا اور کیا کرتا بے چارہ..... آخر جب محل دیکھتے دیکھتے تھک گیا تو پوچھا۔ باغ کہاں ہے؟ وزیر اعظم چہکا۔ باہر تشریف لائیے حضور اور وہ اس چٹیل میدان کی دوسری طرف آگئے۔ جہاں بقول وزیر اعظم محل کا باغ تھا۔ بولا یہ رہا حضور باغ۔ دیکھنے میں کیا جنت نظیر ہے

یہ سیب کا درخت ہے۔ شہد سے زیادہ میٹھے پھل دیتا ہے یہ تمر ہشت کے درخت ہیں۔ ایسے آم آپ کو کہیں اور نہیں ملیں گے۔ شہزادے کو یوں لگا جیسے واقعی پاگل ہوگیا ہے۔ آخر جب سب کو چیزیں نظر آرہی ہیں تو اُس کی آنکھوں کو کیا ہوا؟ وہ چیخ پڑا آخر یہ سب کیا ہے۔ میری آنکھوں کو کیا ہوگیا ہے؟ چھوٹا سا تو تھا ہی رُو پڑا گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گیا۔ ڈر گیا کہ جانے کیا ہوگیا ہے کہ اتنے میں اُس کے کندھوں پر کسی نے نرمی سے ہاتھ رکھا۔ اُس نے چونک کر سر اٹھایا۔ یہ بادشاہ سلامت تھے۔ شہزادہ روتا ہوا اُن سے لپٹ گیا اور بولا "ابّا جان ہمیں محل نظر نہیں آتا۔ سب کو نظر آتا ہے۔ آخر یہ ماجرا کیا ہے؟ بادشاہ مسکرایا تو سب ہنس پڑے۔ بادشاہ بولا" وہ تو ہمیں بھی نظر نہیں آتا کیوں تمہیں نظر آتا ہے۔؟ سب نے ہنس کر ایک ساتھ کہا "نہیں"۔ تو پھر یہ کیا تماشہ ہے" ؟ شہزادے نے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

بادشاہ بولا .....

... اصل بات یہ ہے بیٹا! کہ تمہارے پاس تجربے کی کمی ہے۔ تم بادشاہت کا آغاز ایک اچھی سی عمارت سے کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لئے تم نے ایک عرصے سے اپنا کام روکا ہوا تھا۔

بیٹے! بادشاہ کے لئے اچھی عمارت کا ہونا شرط نہیں بلکہ اچھا بادشاہ ہونا شرط ہے۔ تم محل بننے کا انتظار کرتے تھے۔ ارے بھئی اصل عمارت تو تمہاری سلطنت اور رعایا ہے۔ تم لوگوں کو خوشحال بناؤ۔ ان کے مسائل حل کرو تو خود بخود تمہاری سلطنت کی چہار دیواری مضبوط ہو جائے گی۔ یہ سب غیر دانشمندانہ باتیں ہیں کہ پہلے عمارت بناؤ پھر حکومت کرو۔ عقلمند لوگ ایسا نہیں کرتے۔ یہ مزدور۔ یہ معمار یہ سنار یہ کاریگر اور یہ سارے ہُنر مند تمہاری اصل عمارت ہیں۔ ان پر توجہ دو ان کی حفاظت کرو تو تمہارا محل بہت خوبصورت تیار ہوگا۔ اللہ میاں کے ہاں تمہیں اس کا پھل ملے گا۔ بادشاہ کا محل تو جنّت میں تیار ہوتا ہے۔ دنیا میں تو تمہاری ذمہ داری دوسروں کو سکھ چین کا محل بنا بنا کر دینا ہے۔

ایک روپیہ

ایک کنجوس نے اپنے بچّوں سے کہا... تم میں سے جو رات کا کھانا نہیں کھائے گا اُسے ایک روپیہ ملے گا۔ سب بچّوں نے کھانے پر رُوپے کو ترجیح دی اور ایک، ایک روپیہ لے کر اپنے اپنے بستر پر سونے چلے گئے اور بھوکے ہی سو گئے صبح کو جب سو کر اٹھے تو سب کی آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں سب نے باپ سے ناشتے کا مطالبہ کیا۔ کنجوس باپ نے کہا جو! ایک روپیہ ادا کرے گا ناشتہ صرف اُسی کو ملے گا۔

تواضع کے بہتر آداب
فرزیش دیل کا انتخاب

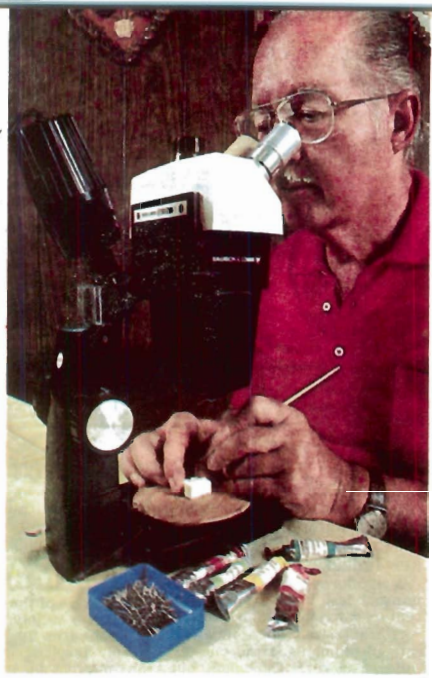


فرزیش دیل

سوئیٹس، حلوہ جات اور
خالص دیسی گھی بیرونِ ملک بلکہ
اندرونِ ملک بھی معزز مہمانوں
کی تواضع، عزیز و اقارب اور
دوست احباب کو سوغات
کے طور پر دینے کے لئے
خوش ذوق حضرات کا
بہترین انتخاب!



ہے ناحیرت کی بات



آرٹ کی دنیا میں لوگوں نے عجیب و غریب تجربے کئے بعض آرٹسٹوں نے بہت چھوٹی تصاویر بنانے کے جنون میں دال اور چاول پر تصاویر بنا کر دنیا کو حیرت میں ڈال دیا لیکن ایک امریکی آرٹسٹ ایڈون فنک ہائمز تو سب پر بازی لے گئے انہوں نے تو پیپر پن کے سر پر ایسے ایسے حسین مناظر بنا ڈالے کہ انسان یقین کرنا چاہے بھی تو یقین نہیں آتا ایک پیپر پن کا سر کتنا بڑا ہو سکتا ہے؟ اس کا اندازہ تو آپ کو ہو گا ہی فنک ہائمز صاحب چونکہ پہلے ایک خلائی ادارے سے منسلک رہ چکے ہیں اس لئے انہوں نے اس کام کا آغاز ہی پن کے سر پر ہوائی جہاز کی تصاویر بنا کر کیا۔ اپنے اس کام کے لئے وہ ایک حساس قسم کی خوردبین استعمال کرتے ہیں انہوں نے بتایا کہ دس سال پہلے انہیں بے خوابی کا مرض لاحق ہو گیا تھا اس لئے ان کے اس شوق کا آغاز ہوا۔ پنوں کے سر پر انہوں نے گلدستے اور کئی مناظر بنائے ہیں جو آپ دیکھ رہے ہیں اور پنسل کی نوک سے اس کا موازنہ بھی دیکھ رہے ہیں اس پینٹنگ کے لئے فنک صاحب خاص قسم کا برش استعمال کرتے ہیں ان تصویروں کا سائز ایک انچ کا ۳/۵۰ واں حصہ ہے۔ ہے ناحیرت کی بات۔





غازی مختار

اتنی سی بات

فیصل اور صاعقہ کے گھر کے پچھواڑے والے بنگلے میں تین دن سے نئے پڑوسی آگئے تھے۔ دونوں بہن بھائی کئی بار دونوں بنگلوں کے سبزہ زار کی مشترکہ درمیانی دیوار کے ایک سوراخ میں سے ساتھ کے گھر میں جھانک چکے تھے مگر انہیں وہاں کوئی اپنا ہم عمر ساتھی دکھائی نہیں دیا۔

جتنی خوشی انہیں نئے لوگوں کے آنے کی اطلاع پاکر ——— ہوئی تھی اب اتنا ہی دکھ بھی ہو رہا تھا۔ صاعقہ تو ایک بار منہ بسورتے ہوئے فیصل سے کہہ بھی چکی تھی "مہینہ بھر انتظار کے بعد پڑوسی آئے بھی تو ایسے کہ گھر میں کوئی بچہ ہی نہیں ہے" "آخر کھیلیں تو کس کے ساتھ کھیلیں"



"جب سے عرفان اور ثریا باجی لاہور چلے گئے ہیں بڑی بوریت ہونے لگی ہے۔" کوئی بچہ نہیں آ رہا تو ثریا باجی ہی آجاتیں۔ اچھی اچھی کہانیاں سننے کو اور ٹافیاں تو کھانے کو مل ہی جائیں گی۔" فیصل نے بہن سے کہا۔

ایک دن فیصل اور صاعقہ اپنے لان میں گیند سے کھیل رہے تھے۔ گیند دیوار کے سوراخ کے قریب جا پڑی۔ فیصل نے گھاس پر سے گیند اٹھاتے ہوئے سوراخ میں سے جھانک کر دوسرے گھر میں دیکھا تو خوشی سے چلّایا

"صاعقہ جلدی آؤ۔ صاعقہ آؤ"۔ صاعقہ دوڑی دوڑی دیوار کے پاس پہنچی تو فیصل نے بتایا کہ ہمارا ایک ہم عمر لڑکا ساتھ کے لان میں آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔"

صاعقہ نے جھانک کر دیکھا تو واقعی ایک لڑکا کرسی پر بیٹھا ہوا کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ دونوں بہن بھائی مشورہ کرنے لگے کہ اس لڑکے کو کس طرح متوجہ کیا جائے۔

آخر طے پایا کہ گیند ساتھ کے لان میں پھینک دیتے ہیں اور پھر اس سے گیند واپس پھینکنے کے لئے کہیں گے تو بات چیت چل نکلے گی۔"

فیصل نے دیوار پر سے گیند دوسری طرف پھینک دی۔ گیند لڑکے کے پاس ہی جا گری۔

لڑکے نے گیند کی طرف دیکھا پھر پلٹ کر دیوار کی طرف دیکھا اور پھر کتاب پڑھنے میں مصروف ہو گیا۔

فیصل کو بڑی جھنجھلاہٹ ہوئی۔ "عجیب لڑکا ہے۔ اسے تو کوئی پرواہ ہی نہیں"

صاعقہ نے جو دیوار کے سوراخ کے ساتھ آنکھ لگائے دیکھ رہی تھی۔ لڑکے کو آواز دی "کیا آپ ہماری گیند ہمیں لوٹانے کی تکلیف کریں گے؟"

لڑکے نے پلٹ کر دیکھا بھی نہیں بلکہ اپنے کوٹھی نما گھر کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھا اور دوبارہ کتاب میں منہمک ہو گیا۔

"توبہ۔ توبہ۔ یہ تو بڑا مغرور لڑکا ہے"۔ گیند بھی اٹھا کر نہیں دے سکتا"

"پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتا ہے۔" "ہونہہ"..... فیصل نے جل بھن کر کہا۔

اتنے میں ایک عورت ساتھ کے لان میں دکھائی دی۔ کرسی پر بیٹھے لڑکے نے اس عورت سے کچھ کہا اور گیند کی طرف اشارہ کیا۔ عورت نے گھاس پر سے گیند اٹھائی اور فیصل اور صاعقہ کے لان میں پھینک دی اور واپس اندر چلی گئی۔

لڑکے کے رویئے نے دونوں بہن بھائیوں کو بڑا رنجیدہ کیا۔ وہ کھیل چھوڑ کر گھاس پر بیٹھ گئے۔

دوسرے دن صاعقہ ایک بڑے غبارے سے اپنے لان میں کھیل رہی تھی اور فیصل اپنے کمرے میں اسکول کا ہوم ورک کر رہا تھا۔ غبارہ ہوا میں اڑ رہا تھا کہ اچانک غبارے کا دھاگہ صاعقہ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ غبارہ پکڑنے کے لئے بھاگی مگر غبارہ ہوا کے ساتھ اڑتا ہوا دیوار کے پار ساتھ کے گھر میں چلا گیا۔

صاعقہ نے سوراخ میں سے دیکھا تو لڑکا کل ہی کی طرح آرام کرسی پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اور غبارہ اڑتا ہوا گلاب کی جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اُس نے بڑی عاجزی سے لڑکے کو آواز دی۔

"بھیا! میرا غبارہ پکڑ دیں۔ کسی جھاڑی میں لگ گیا تو پھٹ جائے گا"

لڑکے نے غبارے کی طرف دیکھا جو لمحہ بہ لمحہ جھاڑیوں سے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ مگر غبارہ پکڑنا تو درکنار وہ کرسی سے ہلا تک نہیں۔ اور آخر غبارہ گلاب کی جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گیا۔

صاعقہ کو بڑا دکھ ہوا۔ اُس نے ساری بات جا کر فیصل کو بتائی تو اُسے بہت غصہ آیا۔ دونوں بہن بھائی دیوار کے سوراخ کے قریب آئے اور لڑکے کو جلی کٹی سنانے لگے۔ لڑکے نے کچھ کہا مگر آواز ان تک نہیں پہنچی اور وہ لڑکے کو بُرا بھلا کہہ کر خفگی سے لوٹ گئے۔

چند دن بعد کلاس کے مانیٹر کامران نے اسکول میں تمام ساتھیوں کو خوشخبری سنائی کہ "جلد ہی ہمارے اسکول میں ایک نیا ساتھی آ رہا ہے جس کا نام ریحان ہے"

تمام لڑکے لڑکیاں کامران سے نئے ساتھی کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ وہ ایک نئے ساتھی کے اضافے پر بہت خوش تھے۔

مگر جب فیصل اور صاعقہ کو معلوم ہوا کہ نیا آنے والا لڑکا ان کا پڑوسی ہے تو انہوں نے تمام ساتھیوں کو اُس کے بارے میں بتا دیا کہ وہ بڑا مغرور، خود غرض، کاہل اور کام چور ہے۔ فیصل نے گیند والا قصہ اور صاعقہ نے اپنے غبارے کی پوری کہانی بڑے دُکھ سے سب کو سنائی۔

"نہ بھئی نہ۔ ہم تو ایسے لڑکے کو منہ بھی نہیں لگائیں گے"۔ عارفہ نے ساری روداد سن کر کہا۔

"ایسے کاہل اور خود غرض کو تو واقعی دوست نہیں بنانا چاہیئے" فرخ نے سب کو مشورہ دیا۔

"مغرور کا سر ضرور نیچا کیا جائے گا" جمشید نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

"ہم تو ایسے لڑکے سے بات بھی نہیں کریں گے۔ بیچاری صاعقہ کا غبارہ ....." دُکھ سے انیلا کا جملہ ہی ادھورا رہ گیا۔

غرض جس جس نے نئے لڑکے کے بارے میں سُنا سب نے عہد کیا کہ ہم ایسے بُرے لڑکے سے بالکل بات نہیں

کریں گے۔ جو اتنا مغرور ہے کہ فیصل اور صاعقہ کو گیند اور غبارہ بھی اٹھا کر دے نہیں سکتا۔"

ہفتہ کے روز ریحان اسکول آیا۔ اس نے محسوس کیا کہ سب لڑکے لڑکیاں اُس سے کھنچے کھنچے رہتے ہیں۔ اس نے کسی سے بات کرنا بھی چاہی تو اُس نے منہ پھیر لیا۔

آدھی چھٹی میں بھی سب اُس سے دور دور رہے۔ نہ کسی نے کچھ کہا نہ سُنا۔ ریحان اس رویّہ سے بڑا پریشان اور رنجیدہ ہوا۔

جب چھٹی کے بعد ریحان گھر گیا تو اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ اور وہ بڑا کھویا کھویا اور تھکا نظر آ رہا تھا۔ اس کی امّی نے شاید اُس سے اس لئے کچھ نہیں پوچھا کہ آج پہلا دن تھا۔ نئے لوگ ہوں گے۔ اس لئے ممکن ہے کہ نئے پن کی پریشانی ہو۔ کوئی بات نہیں آہستہ آہستہ ماحول میں ڈھل جائے گا یہ سوچ کر امّی اپنے کام میں مصروف ہو گئیں۔

دوسرے دن جب ریحان اسکول گیا۔ تب بھی لڑکوں لڑکیوں کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں تھی۔

آدھی چھٹی میں وہ لان میں ایک بینچ پر بیٹھا تھا کہ ایک چھوٹی سی لڑکی اس کی طرف دیکھتی ہوئی پاس سے گزری۔ ریحان نے آگے بڑھ کر اُس کو روکتے ہوئے کہا۔ "اچھی بہن مجھے بتاؤ تم سب لوگ آپس میں تو گھلے ملے رہتے ہو مگر مجھ سے کیوں دُور دُور رہتے ہو؟"

"مجھ سے بات مت کرو۔ تم تو بڑے مغرور اور کاہل ہو۔ تمہیں دوسروں کا تو بالکل ہی خیال نہیں پھر ہم تمہارا کیوں خیال کریں" لڑکی نے حقارت سے جواب دیا۔

"میں تو نیا آیا ہوں۔ تم لوگ جب مجھے جانتے ہی نہیں ہو تو پھر میرے بارے میں ایسی رائے کیوں رکھتے ہو۔ یہ سب باتیں غلط ہیں میں ایسا نہیں ہوں" ریحان نے لڑکی سے اپنی صفائی پیش کی۔

"نہیں۔ نہیں۔ ہمیں سب معلوم ہے۔ فیصل اور صاعقہ تو کبھی جھوٹ نہیں بولتے"۔

"کون فیصل اور صاعقہ؟ ــــ بھلا وہ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"ارے واہ۔ واہ! بھولے میاں۔ آپ تو جیسے جانتے ہی نہیں۔ کون فیصل اور صاعقہ؟ وہ تمہارے پڑوسی ہیں۔ انہوں نے تمہارے بارے میں ہمیں سب کچھ بتا دیا ہے" اور پھر اُس نے فیصل اور صاعقہ کی تمام باتیں ریحان کو بتا دیں۔

ریحان یہ سب سُن کر بڑا پریشان اور شرمندہ ہوا۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ساتھ ہی اسے دونوں پر غصّہ بھی بہت آیا۔

چھٹی کے بعد سب اپنے گھروں کو جا رہے تھے۔ ریحان نے صاعقہ اور فیصل کے پاس جا کر اُن کو مخاطب کرتے

ہوئے کہا: "تم دونوں نے میرے خلاف بغیر تحقیق کے بہت کچھ کہا ہے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ میں خود تم لوگوں سے بات نہیں کرنا چاہتا مگر صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ تم دونوں نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے سخت بدگمانی کی ہے، نہ میں مغرور ہوں نہ سست اور نہ کام چور۔ جب ہم نئے مکان میں آئے تو میں پھسل کر گر گیا تھا۔ اور میرا گھٹنا اتر گیا تھا۔ ڈاکٹر نے مجھے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ جب تمہاری گیند ہمارے لان میں گری تھی میں نے اپنی امی سے کہہ کر تم لوگوں کو بلوا دی تھی۔" ریحان صاعقہ کی طرف دیکھتے ہوئے مزید بولا: "جب تمہارا غبارہ ہمارے لان میں گر کر پھٹ گیا تھا۔ تب بھی میں مجبور تھا تمہارا غبارہ نہ بچا سکا۔ میں نے امی سے وعدہ کیا تھا کہ جب تک ڈاکٹر اجازت نہیں دے گا۔ میں بالکل نہیں چلوں گا۔ اور امی نے مجھے اسی لئے لان میں بیٹھنے کی اجازت دی تھی۔" ــــ "پھر جب تم دونوں مجھے بُرا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے تم لوگوں سے معافی مانگتے ہوئے اپنی مجبوری بتائی تھی۔ مگر تم لوگوں نے شاید میری بات ہی نہیں سنی۔"

"میں کاہل۔ معذور۔ کام چور اور بُرا لڑکا نہیں۔ بلکہ تم دونوں نے جلد بازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے متعلق بدگمانی کی ہے۔ غصّہ سے ریحان کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اور آواز رُندھ گئی۔ "میں خود تم جیسے گندے بچّوں سے دوستی نہیں کرنا چاہتا۔ یہ کہہ کر ریحان تیز تیز قدموں سے اپنے گھر کی طرف بڑھ گیا۔ اور دونوں بہن بھائی شرمندہ شرمندہ کھڑے رہ گئے۔

"ہائے اللہ! بھیّا یہ تو بہت بُرا ہوا" ــــ "ہم نے بیچارے ریحان کے بارے میں جھوٹ بول دیا"۔ صاعقہ نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے فیصل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"واقعی صاعقہ ہم نے جلد بازی کی" ــــ "ہم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔" "ریحان تو بیچارہ خود مجبور اور تکلیف میں تھا" ــــ فیصل نے اپنی رائے دی۔ "اب تو وہ ہم سے بات بھی نہیں کرے گا۔"

گھر جا کر دونوں بہن بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ غلطی ہماری تھی۔ لہٰذا ریحان چاہے ہم سے بات کرے یا نہ کرے ہمیں اس سے معافی ضرور مانگنی چاہیے۔

شام کو دونوں بہن بھائی دیوار کے سوراخ کے پاس گئے تو انہوں نے دیکھا کہ ریحان لان میں ایک بڑی سی خوبصورت گیند سے کھیل رہا ہے۔

ایک دفعہ جب وہ کھیلتا ہوا دیوار کے قریب آیا تو فیصل نے زور سے ریحان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "ریحان ہمیں معلوم ہے اب تم ہم سے کبھی بات نہیں کرو گے۔ مگر ہم نے تمہارے بارے میں جو غلط باتیں کی ہیں ہم اُس پر شرمندہ ہیں اور تم سے معافی مانگتے ہیں۔ صبح ہم اسکول میں بھی سب ساتھیوں سے معافی مانگیں گے اور

ان کو بتادیں گے کہ ہم سے جلد بازی میں غلطی ہوگئی ہے اور یہ کہہ کر فیصل اور صاعقہ اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔

ریحان نے اُن کی بات سن لی تھی۔ اُس نے انہیں آواز دی۔ جب جواب نہیں ملا تو وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ اُس نے دیکھا دونوں بہن بھائی لان سے جا رہے تھے۔

" فیصل۔ صاعقہ۔ رک جاؤ۔ یہاں آؤ۔ میری بات سنو۔ میں نے تمہاری بات سن لی ہے"۔ ریحان نے انہیں تقریباً چلا کر اپنی طرف بلایا۔

فیصل اور صاعقہ جب دیوار کے قریب پہنچے تو شرمندگی سے دونوں کے چہرے سرخ ہو رہے تھے اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

" اچھا ہوا تمہاری اور میری غلط فہمی دور ہوگئی۔ میں نے تمہاری معذرت قبول کر لی ہے۔ تمہاری تھوڑی سی جلد بازی نے اتنی بدمزگی پیدا کر دی تھی۔ اچھے بھائی آؤ مجھ سے دوستی کر لو۔ صبح ہم تینوں جا کر اسکول کے ساتھیوں کو تمام بات بتادیں گے" ریحان نے اُن سے کہا۔ "میری امی نے میرا گھٹنا ٹھیک ہونے کی خوشی میں مجھے ایک بڑی سی خوبصورت گیند لا کر دی ہے۔ آؤ تم بھی میرے ساتھ کھیلو"۔

ریحان نے اپنے ہاتھ سے سہارا دے کر فیصل اور صاعقہ کو بھی دیوار پر چڑھا لیا اور پھر تینوں ساتھ کے لان میں کود گئے۔

ستاروں کی گنتی

آسمان پر موجود ستاروں کو گننا مشکل ہے لیکن اب گنتی کا کام دوربینوں سے لیا جا رہا ہے، ان میں کیمرے لگے ہوتے ہیں، یہ آسمان کی تصویر لے لیتے ہیں اور پھر ان ستاروں کی مدد سے ستاروں کو گنا جا سکتا ہے، سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ کُل کوئی ایک کھرب ستارے ہیں۔ اگر کسی کو شک ہے تو گن کر دیکھ لے۔

چاند بستی

وہ دن دور نہیں جب لوگ چاند پر شہر آباد کریں گے، چاند پر مکانات کی تعمیر کے لئے بہترین جگہ غار یا سرنگ ہوگی۔ کیونکہ زمین دوز مکانات شہاب ثاقب سے تباہ نہیں ہوں گے جو بیرونی خلاء سے چاند پر متواتر گرتے رہتے ہیں۔ چاند پر دن کے وقت اتنی گرمی ہوتی ہے کہ چٹانوں پر کھانا تیار کیا جا سکتا ہے، چاند پر جو گھر بنائے جائیں گے وہ ہوا سے بھرے ہوئے ہونگے۔ لوگ گھر سے باہر نکلتے وقت آکسیجن سے بھرا ہوا لباس پہن لیا کریں گے۔



کھاجا

خاور نظامی

صبح اپنی دکان پر آکر ! اِک مٹھائی فروش بیٹھا تھا۔
گھومتا پھرتا اُس دکان کے پاس کوئی لڑکا کہیں سے آنکلا
اُس نے ڈالی نظر مٹھائی پر اور مٹھائی فروش کو دیکھا
اُس سے کہنے لگا مٹھائی فروش کہو، کیا چاہیے تمہیں بیٹا
تازہ تازہ مٹھائیاں ہیں سب یہ جلیبی رکھی ہے ، یہ پیڑا[1]
ویسے ہر چیز ہے بہت اچھی کھاؤ برفی اگر تو پاؤ مزا
کہو، ان میں سے تول دوں کیا میں؟ وہ ہیں رس گُلے اور یہ کھاجا
اس پہ لڑکے نے ہاتھ پھیلا کر تھال سرکا کے پیٹ بھر کھایا
مانگی قیمت جو اُس نے لڑکے سے ہنس کے لڑکا یہ زور سے بولا
میں نے مانگا نہیں تھا کچھ لیکن
آپ ہی نے کہا تھا" یہ کھاجا"

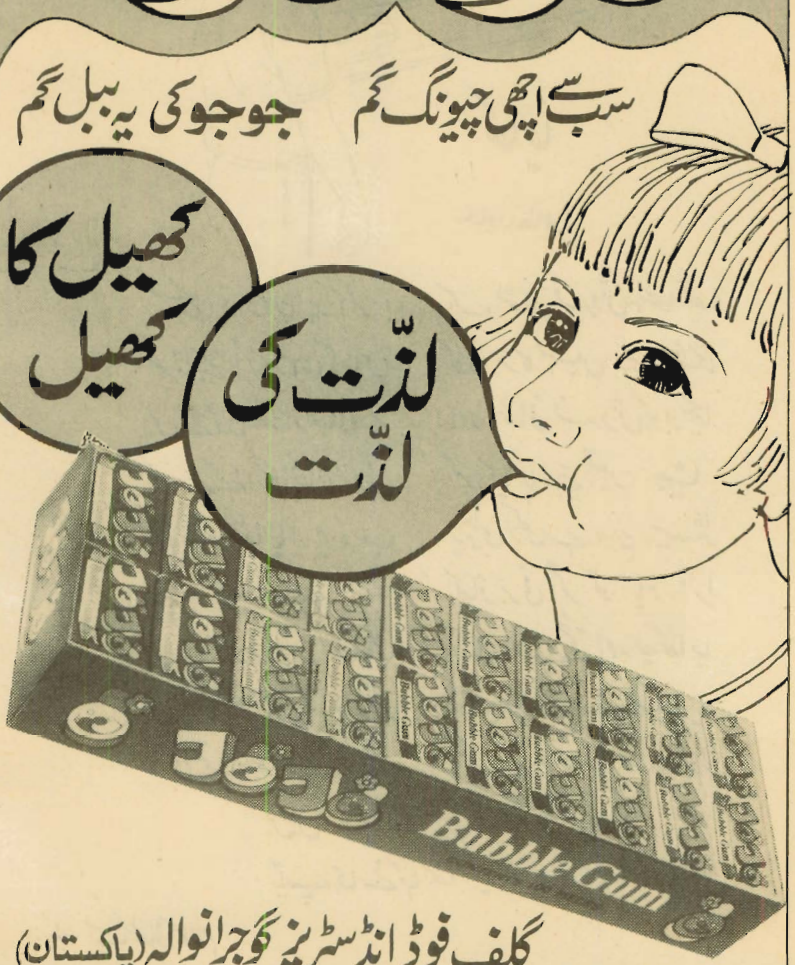
[1] ایک مٹھائی کا نام

فن فن

سب سے اچھی چیونگ گم جوجو کی یہ ببل گم

کھیل کا کھیل

لذّت کی لذّت



گلف فوڈ انڈسٹریز گوجرانوالہ (پاکستان)

چڑیا کا ایک مُنّا

احمد حاطب صدیقی

برگد کی ڈالیوں پر
اوپر۔ بہت ہی اُوپر
گل رنگ کونپلوں میں
خوش رنگ پتیوں میں
کچھ چھپ چھپا سا
چڑیا کا گھونسلا تھا

چڑیا نے خود مسلسل
اُڑ اُڑ کے ایک اِک پل
تنکے زمیں سے چُن کر
محنت سے اُن کو بُن کر
ہفتوں کی کاوشوں سے
اپنی لبِاط کے بل
اک دِن کیا مکمل

*

آخر وہ دِن بھی آیا
جب اُس میں اُف خدایا
بالکل ذرا سا چُنّا
چڑیا کا ایک مُنّا



چُوں چُوں۔ چُوں چُوں چُوں کرتا
اک صبح آگیا تھا

*

ہر روز مُنہ اندھیرے
اُٹھ کر صبح سویرے
اللہ کی حمد کر کے
پھر اک زقند بھر کے
چڑیا زمیں پہ جاتی!
نغمے خوشی کے گاتی
فکرِ معاش کرتی
دانے تلاش کرتی
پھر چونچ اپنی بھر کر
آتی یہ کہہ کے اوپر
مُنّا جو بھوکا ہوگا
میں دے دوں اسکو چوگا

*

چڑیا سے اُس کا مُنّا
کہتا تھا کیا؟ یہ سُننا

کہتا تھا۔ "پیاری امّی
یوں زندگی نکمّی
میں کب تلک گزاروں
کیوں کر اسے سنواروں؟
ہر صبح آپ جائیں
محنت کریں، کمائیں
اور ہار تھک کے آئیں
پھر جو بھی دانے پائیں
دیں کر کے نرم مجھ کو
آتی ہے شرم مجھ کو
کس طرح پَر ہلاؤں
میں کیسے نیچے جاؤں
اور آپ کا "چیاؤں"
میں ہاتھ بھی بٹاؤں
اُڑنا مجھے سکھائیں!
کرتا ہوں میں دُعائیں
امّی جہاں بھی جائیں
مجھ کو بھی ساتھ اُڑائیں

*

سن کر یہ بول سارے
چڑیا خوشی کے مارے
کہتی مرے دُلارے
نازک ہیں پَر تمہارے
اتنی بلندیوں سے
برگد کی ڈالیوں سے
ہرگز نہ اُڑ سکو گے
ننھے سے پَر تمہارے
مضبوط جب ہوں پیارے
گُر سیکھ کر کے سارے
اللہ کے سہارے
آغاز تم کرو گے
پرواز تم کرو گے

*

آیا وہ مرحلہ پھر
کچھ دِن کے بعد آخر
چڑیا اُسے دکھا کر
نیچے کی ڈالیوں پر
اک بار اُڑ کے جاتی
اک بار اُڑ کے آتی
مُنّے کو آتی جاتی
اُڑنے کے گُر سکھاتی
آخر وہ گھونسلے سے
ہمّت سے، حوصلے سے
باہر نکل کے آیا!
پر کو ذرا ہلایا
ماں کے سکھائے گُر سے
خود اُڑ گیا وہ پُھر سے

*



بات بتنگڑ

منتخب لطائف

ایک آدمی سڑک کے کنارے بیٹھا رو رہا تھا ایک راہ گیر نے پوچھا تم کیوں رو رہے ہو، اُس نے جواب دیا "مجھے ویگن نے ٹکر ماری ہے۔"

راہ گیر بولا "تو پھر رو کیوں رہے ہو، ہسپتال جاؤ۔"

وہ آدمی بولا "ہسپتال تو چلا جاؤں گا مگر رو اس لئے رہا ہوں کہ ویگن کے پیچھے لکھا تھا "پھر ملیں گے"

(رقیہ آرزو ——— کوئٹہ)

ایک سپاہی سے بندوق گم ہوگئی، افسر کے سامنے پیشی ہوئی تو اس سے کہا گیا "تمہیں اس کی قیمت ادا کرنی ہوگی"

سپاہی احتجاج کرتے ہوئے بولا "اگر میں ٹرک چلا رہا ہوتا اور ٹرک گم ہو جاتا تو اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی؟"

"بے شک" افسر نے جواب دیا۔

سپاہی بولا "اچھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ بحری جہاز کے کپتان جہاز غرق ہوتے وقت اس کے ساتھ جانا ہی کیوں پسند کرتے ہیں"

(سید محمد خان، ——— ماڈل کالونی، کراچی)

ایک شخص اپنا گدھا فروخت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے سنا کہ اُس کے ایک دوست کو گدھے کی ضرورت ہے، اُس نے اپنے دوست کو ان الفاظ میں خط لکھا "پیارے دوست، اگر تمہیں گدھے کی ضرورت ہو تو بلا تکلف مجھے یاد کر لینا۔"

(عامر قاسم ——— لطیف آباد، حیدر آباد)

ماں (بیٹے سے) بیٹا تم نے یہ بکری پر کیا لکھا ہے اور اسے کہاں لے جا رہے ہو"

بیٹا: امّی۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا بکری پر مضمون لکھ کر لانا، میں نے ایسا ہی کیا ہے"

(غلام محمد مغل ——— لطیف آباد حیدر آباد)



فقیر نے دروازے پر صدا دی تو اندر سے ایک بچہ نکلا، اُس نے فقیر سے کہا "شربت پیو گے" فقیر خوش ہو کر بولا۔ ہاں۔ کیوں نہیں"

فقیر نے تیسرا گلاس پینے کے بعد پوچھا، "کیا آج گھر میں زیادہ شربت بنا ہے"

بچہ معصومیت سے بولا۔ "نہیں۔ دراصل شربت میں مینڈک گر گیا تھا۔

(اسماعیل راحت، ——— نوکوٹ، سندھ)



جج (ملزم سے) کیا تم پہلی مرتبہ عدالت میں آئے ہو۔

ملزم: جی ہاں! اس سے پہلے مجھے پولیس پکڑ ہی نہ سکی۔

(مرسلہ محمد اکرم بیال ——— نکانہ صاحب)



ہر پانچ منٹ کے بعد کار کا انجن گرم ہو جاتا جسے ٹھنڈا کرنے کے لئے ریڈی ایٹر میں بار بار پانی ڈالنا پڑتا، پانچویں مرتبہ جب مالک نے کار پانی ڈالنے کے لئے روکی تو پچھلی سیٹ پر بیٹھا ہوا نوکر بولا" صاحب آپ نے لاکھ روپے کی گاڑی خریدی۔ اس میں ڈیڑھ سو روپے کا نلکا بھی لگوا لیتے۔"

(مرسلہ، عامر ایاز، ——— حیدر آباد)



ایک دوست (کمرۂ امتحان سے نکلتے ہوئے دوسرے سے) یار میں تو پیپر خالی دے آیا ہوں۔

دوسرا: میں بھی خالی ہی دے کر آیا ہوں۔ کاپی پر کچھ بھی نہیں لکھ سکا۔

پہلا دوست (حیران ہو کر) ارے غضب ہو گیا! ماسٹر صاحب سمجھیں گے ہم نے ایک دوسرے کی نقل کی ہے۔

مرسلہ، آصف رضا ——— لاہور)



ایک بس ڈرائیور اور پادری میدانِ حشر میں حاضر ہوئے، بس ڈرائیور کو جنت میں اور پادری کو دوزخ میں بھیج دیا گیا۔ اُس پر پادری نے احتجاج کیا کہ "اے گاڈ میں تو ہمیشہ وعظ و نصیحت کرتا رہا ہوں پھر مجھے دوزخ میں کیوں ڈالا جا رہا ہے"۔

اُسے جواب دیا گیا "جب تم وعظ کرتے تھے تو سامعین سو جاتے تھے، لیکن جب یہ ڈرائیور منی بس چلاتا تھا تو سب سواریاں ذکر و استغفار میں مصروف ہوتی تھیں"

(مرسلہ، طارق احسان، ——— لیاقت آباد کراچی)



ایک صاحب (دوسرے سے) یار۔ تمہارے سر کے بال سفید ہو گئے ہیں، لیکن داڑھی کے بال تو کالے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے!

دوسرے صاحب نے جواب دیا۔ کوئی خاص وجہ تو نہیں بس داڑھی سر کے بالوں سے بیس سال چھوٹی ہے۔

(مرسلہ: تجمل الیاس ——— لاہور)



ایک بچہ بیمار تھا۔ اس کا باپ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دل کی حالت دیکھنے کے لئے آلہ لڑکے کے سینے پر رکھا اور کہا "بیٹا دس تک گنتی گنو۔ یہ سُن کر لڑکا گھبرا گیا اور ابّو سے بولا آپ مجھے پھر اسکول لے آئے۔

(مرسلہ: سعدیہ ضیاء ——— بہیر پور)



دو شہری آپس میں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ ایک دیہاتی ان کے درمیان آ کر چلنے لگا۔ ان میں سے ایک شہری نے ازراہ مذاق دیہاتی سے پُوچھا "کیوں بھئی۔ تم احمق ہو یا بیوقوف"

دیہاتی بولا "جی دونوں کے بیچ میں ہوں۔"

(مرسلہ: امجد علی شاہ، ——— ظاہر پیر)



ایک بچہ حجام کے پاس گیا اور سر کے بال کٹوانے لگا۔ حجام نے اس سے پُوچھا بیٹا۔ تمہارے امتحان کا نتیجہ کب آ رہا ہے" اس نے جواب دیا "دو مہینے کے بعد"

اب حجام نے یہی سوال اُس سے بار بار پوچھنا شروع کر دیا تو بچہ تنگ آ گیا۔ تم مجھ سے بار بار کیوں پوچھ رہے ہو" حجام نے جواب دیا "پہلے تو یونہی معلومات کے لئے پوچھا تھا پھر ضرورت کے تحت پوچھتا رہا"

"مگر تمہیں کیا ضرورت تھی"۔ بچہ حیران ہو کر بولا۔

حجام نے جواب دیا "دراصل میں جب تم سے امتحان کا نتیجہ آنے کا پوچھا تھا تو تمہارے سر کے بال (شاید خوف سے) کھڑے ہو جاتے تھے اور مجھے کاٹنے میں آسانی ہوتی تھی"

(مرسلہ: خالد محمود، ——— ناظم آباد، کراچی)



ایک دن ملّا نصیر الدین کی لڑکی اپنی سسرال سے روتی پیٹتی آئی اور شکایت کرنے لگی کہ آپ نے مجھے کس بھاڑ میں جھونک دیا ہے۔ میں روز روز کے جھگڑوں سے تنگ آ گئی ہوں۔ میرا شوہر ظالم ہے اور آئے دن مجھے مارتا رہتا ہے، آج بھی مار پیٹ کر اُس نے گھر سے نکال دیا ہے"

ملّا نے جو بیٹی کی روداد سنی تو فوراً اُٹھے اور دو تین ہاتھ زور زور سے بیٹی کے رسید کر دیئے اور غصّے میں لال پیلے ہوتے ہوئے بولے۔

"جا کے اپنے شوہر سے کہہ دے کہ ابھی میرا باپ زندہ ہے تو نے میری بیٹی کو مارا میں نے بھی تیری بیوی کی مرمّت کر دی ہے۔ اور ہاں یہ بھی کہہ دینا کہ اگر آئندہ گھر سے نکالا تو میں کبھی تیری بیوی کو گھر میں نہیں گھسنے دوں گا۔

(مرسلہ: باقر رضا، ——— فیڈرل بی ایریا، کراچی)



ایم۔ وائی۔ صنم

جنگل میں کرسمس

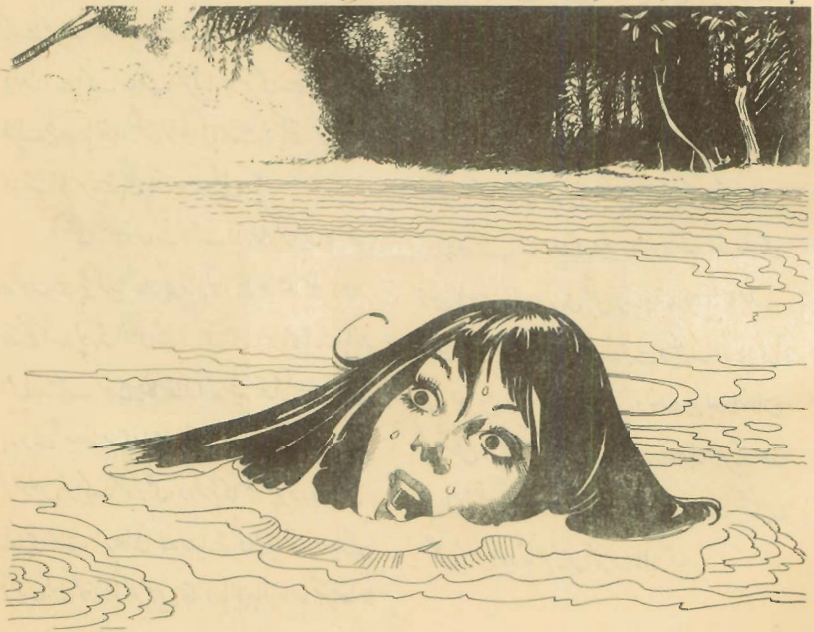
یہ ایک سولہ سالہ جرمن لڑکی جولین کی کہانی ہے۔

جولین.... جسے ایک حادثے کے بعد نئی زندگی ملی۔ ۲۵ دسمبر ۱۹۷۱ء کو کرسمس کے روز صبح تقریباً گیارہ بجے جولین اپنی ماں ڈاکٹر ماریا کے ہمراہ پیرو کے دارالحکومت لیما کے ہوائی اڈے سے ایک طیارے میں سوار ہوئی طیارے میں عملے سمیت ۹۰ مسافر سوار تھے اور وہ شمالی پیرو کے شہر پوکالپا جا رہا تھا۔ جہاں جولین کا باپ ہینز رہتا تھا۔ اور ماں بیٹی کرسمس منانے وہاں جا رہی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹہ کی پرواز تھی۔ طیارہ برف پوش پہاڑوں کے اوپر محو پرواز تھا کہ آدھے گھنٹے بعد اچانک طوفان باد و باراں نے آلیا۔ زبردست دھماکہ ہوا طیارہ ہچکولے کھانے لگا۔ مسافروں کے دل ڈوبنے لگے۔ پھر ان میں افراتفری پھیل گئی۔ اسی اثنا میں جولین نے دیکھا کہ طیارے کے انجن والا حصہ مکمل طور پر آگ کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کچھ ہوا جس کی توقع نہ تھی۔ بس جولین کو اپنی ماں کے آخری الفاظ سنائی دیئے "میرے خدا اتنا خوفناک انجام" ایک اور دھماکہ ہوا جہاز کے پرخچے اڑ گئے۔ جولین فضا میں نیچے آنے لگی مگر اس وقت اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ نہیں زمین پر اُگے ہوئے درخت اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہے ہیں۔ زمین پر گرنے سے پہلے وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ جب اُسے ہوش آیا تو شام ہو چکی تھی ماں کا کہیں نام و نشان تک نہ تھا۔ جولین نے خود پر نظر ڈالی اس کا ایک جوتا غائب تھا۔ ہنسلی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ وہ پیرو کے خطرناک جنگل میں پڑی تھی۔ جہاں زہریلے سانپ چمگادڑیں اور چھوٹے مگر جان لیوا ڈنکوں سے لیس کیڑے مکوڑوں کے بہتات تھی۔ پھر جنگل کا پراسرار ماحول ہی کچھ کم ہولناک نہ تھا۔ سائیں سائیں کرتے درخت اور دور کہیں سے آتی ہوئی مینڈکوں کے لڑانے کی آواز ایک کم عمر لڑکی کے ادسان خطا کرنے کے لئے بہت تھی۔ جولین کم عمر ضرور تھی لیکن کم ہمت نہیں تھی، خوش قسمتی سے جولین جنوبی امریکہ کے جنگلات کے بارے میں پہلے سے جانتی تھی ۱۹۶۷ء سے ۱۹۶۹ء تک وہ پوکالپا کے ریموٹ ریسرچ اسٹیشن میں اپنے والدین کے ہمراہ رہی تھی ان

دو برسوں میں اس نے مشکل حالات میں خود کو بچانے سے متعلق بہت کچھ سیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ چمگادڑیں مکھیاں اور مچھر درندوں سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ جنگل سے بچ نکلنے کے لئے اسے وہیں واقع دریا تلاش کرنا چاہیئے۔ کیوں کہ جنگلوں سے نکلتے دریا صحیح راستے کی نشاندہی کرا دیتے ہیں۔ جولین کے پاس کھانے پینے کی کوئی شے نہ تھی مگر جنگل میں مختلف درخت پھلوں سے لدے پھندے تھے۔ ان میں سے اکثر پھل انتہائی کڑوے بھی تھے۔ جہاز میں سوار ہوتے ہوئے اس کے پاس کرسمس کیک تھا جو کہ جہاز کی تباہی کے ساتھ ہی تباہ ہو چکا تھا۔

کچھ ہی منٹوں بعد بارش شروع ہو گئی۔ جولین نے عقلمندی سے کام لیا اور ایک درخت کی ٹہنی توڑ کر اسے چھڑی میں تبدیل کر لیا۔ وہ اس چھڑی سے سانپوں وغیرہ سے نمٹ سکتی تھی۔ اسے دریا کی تلاش تھی۔ زخمی ہونے کے باعث وہ نقاہت سے چل رہی تھی۔ بارش کی بوچھاڑ سے بچنے کے لئے وہ بار بار گھنے درختوں تلے ٹھہر جاتی۔ چند گھنٹوں کی مسافت کے بعد اسے دریا کے آثار دکھائی دیئے۔ دریا کی بڑی سی لکیر دیکھ کر جولین میں زندگی کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ اگلے چند دنوں میں جولین کا لباس جگہ جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ اور سورج کی تمازت اس کا بدن جھلسا رہی تھی اور مکھیاں مچھر اسے الگ کاٹ کھا رہے تھے۔ مکھیوں کے کاٹنے کا جولین کو پہلے کوئی تجربہ نہ تھا۔ مکھیوں کے ڈنکوں نے اس



اس کی جلد کے اندر سینکڑوں انڈے پیدا کر دیئے تھے۔
ان جان لیوا حالات میں جولین نے کئی مرتبہ ہوائی جہاز کی آواز سنی یوں لگتا ہے جیسے وہ جنگل کے اوپر چکر لگا رہا ہو۔ ایک مرتبہ تو اسے جھاڑیوں کے اندر سے ہیلی کاپٹر کی جھلک بھی نظر آئی اس نے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے اور چلائی مگر پائلٹ اس کی آواز نہیں سن سکتے تھے نہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ ادھر سرکاری طور پر طیارے کے ملبے کا سراغ لگانے کی کوشش جاری تھیں۔ جنگل کے اوپر جہاز اور ہیلی کاپٹروں کا منڈلانا اسی سلسلے کی کڑی تھی۔
جنگل میں جولین کو بھٹکتے غالباً پانچواں یا چھٹا دن تھا۔ اس کا تھیلا جو کندھے پر لٹک رہا تھا، پھٹ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑی جم چکی تھی، اب زندہ رہنے کے لئے صرف اور صرف قوتِ ارادی کی ضرورت تھی۔
دفعتاً اسے ایک سانپ نظر آیا جو تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ لیکن لڑکی کی ہمت دیکھئے اس نے سانپ کا سر اپنے ننگے پاؤں سے کچل دیا۔
جنگلی مکھیوں نے ڈنک مار مار کر اس کا جسم زخموں سے پُر کر دیا تھا۔ کچھ زخم تو اتنے گہرے تھے کہ وہ ان کے اندر پوری انگلی ڈال سکتی تھی۔ اس کا بایاں بازو اس حد تک سوج چکا تھا کہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس بازو سے محروم ہی نہ ہونے پڑے۔ دریا کے کنارے پہنچ کر جولین کو ایک ٹھوکر لگی، وہ گر پڑی مگر پھر خود ہی اس نے اپنی ہمت بندھائی۔ وہ دریائے شی لونیا تھا۔ دریا کے قریب کوئی گاؤں یا گھر نہیں تھا۔ دریا کا بہاؤ خاصا تیز تھا وہ کبھی دریا کے کنارے چلتی اور کبھی دریا میں تیر لیتی۔ اور کبھی خشک لکڑی کی طرح اپنے آپ کو دریا کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے کھلے زخموں کی بُو محسوس کر کے مچھلیاں اس کی طرف بڑھیں گی اور دریا کے کنارے دلدل کے اندر چھپے زہریلے کیڑے بھی اس پر حملہ کر سکتے ہیں۔ وہ ان خطرات سے نمٹنے کے لئے پوری طرح تیار تھی۔ جولین نے دریا کے کنارے بیس کلومیٹر سے زائد فاصلہ طے کیا۔ اچانک ایک جگہ کنارے پر اسے ایک کشتی نظر آئی، وہیں جنگل کے راستے کا نقشہ بھی نظر آیا۔ وہاں سے چند میٹر دور اسے ایک جھونپڑا نظر آیا۔ جھونپڑے کے اندر کشتی میں لگانے والی موٹر اور پلاسٹک کی بڑی سی ایک شیٹ پڑی تھی لیکن کوئی ذی روح نظر نہ آیا۔ اس رات جولین پلاسٹک شیٹ بچھا کر اطمینان سے سوئی اگلی صبح جولین نے کشتی کے قریب آرام کیا۔ وہ کشتی کا انجن چلانا نہیں جانتی تھی۔ جولین چند گھنٹوں کے بعد جائزہ لیتی لیکن کشتی کے مالک کا دور دور تک پتا نہ چلتا۔ اگلے روز وہ تنہا سفر جاری رکھنے کا عزم باندھ رہی تھی کہ تباہ شدہ جہاز کا ملبہ ڈھونڈنے والے تین افراد نے اسے دیکھ لیا وہ لمحہ دیدنی تھا۔ جولین نے ساڑھے دس دنوں کے بعد انسان کی شکل دیکھی تھی۔ ان لمحوں میں وہ جی بھر کے روئی اور ان زخموں کا درد شدت سے محسوس ہوا جنہیں جنگل میں وہ خاطر میں نہیں لائی تھی۔

محمد اعظم ضیاء

میٹھے بول

آپ نے کتنی ہی مرتبہ اس بات کا مشاہدہ کیا ہوگا کہ بعض لوگوں کے آتے ہی محفل میں زندگی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے آنے والے کا چہرہ دیکھتے ہی سبھی چہروں پر مسکراہٹ اور طمانیت آجاتی ہے یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو خوش گفتار، میٹھے اور اچھے انداز سے بات کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں۔ حسنِ گفتار ایک ایسی خصلت ہے جو لوگوں کی محبت اور اُلفت کا باعث بنتی ہے۔ گذشتہ شمارے میں آدابِ زندگی کے سلسلے میں ہم نے ملاقات کے آداب سے آپ کو آگاہ کیا تھا اور ملاقات کے وقت گفتگو لازم ہے اس مضمون میں ہم گفتگو کے آداب آپ کو بتا رہے ہیں۔ اگر آپ خود کو زندگی میں کامیاب مقبول اور خوش دیکھنے کے خواہشمند ہیں تو ہمارے مشوروں پر عمل کرتے ہوئے خود کو اچھی گفتگو کرنے کی عادت ڈالئے۔

- سب سے پہلی بات جس کا آپ کو گفتگو کرتے وقت خیال رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ آپ ہمیشہ سچ بولیں سچے آدمی کی لوگ بھی قدر کرتے ہیں اور اسے کبھی ندامت و پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا اور اس سے اللہ تعالیٰ بھی خوش ہوتا ہے سچ بولنا عظیم خوبی ہے اور کبھی بھی سچ بولتے ہوئے جھجک محسوس نہ کریں۔ چاہے کتنا ہی نقصان ہونے کا اندیشہ کیوں نہ ہو۔
- ہر وقت بولنا اور بلا ضرورت گفتگو جاری رکھنا وقار اور سنجیدگی کے خلاف ہے آپ جب بھی بات کریں کام کی بات کریں اور سوچ سمجھ کر بولیں اس لئے کہتے ہیں پہلے تولو پھر بولو۔
- گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھئے کہ آپ کا انداز نرمی لئے ہوئے ہو اور لب و لہجہ میٹھا ہونا چاہیئے۔ ہمیشہ درمیانی آواز میں بات کرنی چاہیئے نہ زیادہ زور سے بولیں کہ مخاطب پر رعب کا گمان ہو اور نہ اتنا آہستہ بولیں کہ آپ کا ساتھی سُن ہی نہ سکے۔
- گفتگو کرتے ہوئے ہر موقع پر دوسروں کی برائی کرنا، چغلیاں کھانا اور شکائتیں کرنا اچھی بات نہیں اسی طرح

اپنی تعریف خود ہی کرنا اور بڑائی جتانا بھی ٹھیک نہیں۔ اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ گفتگو کرتے ہوئے غرور اور تکبّر کا اظہار کسی طرح بھی نہ ہو۔

• گفتگو کے موقع پر آپ نے کسی بات کی اہمیّت واضح کرنی ہو تو مخاطب کے ذہن و فکر سامنے رکھ کر وضاحت کیجئے۔ اگر مخاطب کی سمجھ میں بات نہ آ رہی ہو تو غصّہ کرنے اور کُڑھنے سے پرہیز کیجئے۔ اور اگر مخاطب کہے تو اپنی بات کو دُہرا دینے میں کوئی مذائقہ نہیں۔

• مختصر بات کیجئے، بلاوجہ گفتگو کو طول مت دیجئے۔ ورنہ مخاطب بور ہو جائے گا اور سمجھے گا کہ آپ اس پر اپنی علمی قابلیّت کا رعب جھاڑ رہے ہیں اس طرح آپ کی قدر اُس کے دل سے نکل جائے گی۔

• سادہ انداز اور آسان الفاظ میں گفتگو کیجئے۔ کوئی اہم بات ذہن نشین کرانی ہو تو نہایت سوز کے ساتھ ایسے انداز میں بات کیجئے کہ مخاطب آپ کو اپنا خیر خواہ سمجھے اور آپ کی بات کا اثر قبول کرے۔

• گفتگو کرتے ہوئے اپنی عزت کا خیال رکھئے کبھی اخلاق سے گری ہوئی بات نہ کیجئے۔ کسی کی خوشامد اور جھوٹی تعریف سے بھی دُور رہیے۔

• دو آدمی بات کر رہے ہوں تو اجازت لئے بغیر دخل نہ دیجئے۔

• گفتگو کرتے ہوئے سلیقے اور شائستگی کا خیال رکھئے، ہر وقت ہنسی مذاق نہ کرتے رہیئے۔ اس سے آدمی کی عزت میں کمی ہوتی ہے اور وقعت جاتی رہتی ہے۔

• کوئی کچھ پوچھے تو پہلے غور سے اس کی بات سُن لیجئے۔ خوب سوچ کر جواب دیجئے۔ اگر کوئی دوسرے سے سوال کر رہا ہو تو خود بڑھ بڑھ کر جواب نہ دیجئے۔

• دورانِ گفتگو کوئی کچھ بتا رہا ہو تو فوراً ہی یہ مت کہہ دیجئے کہ ہمیں معلوم ہے بلکہ مخاطب کی پوری بات سُن لیجئے۔ ہو سکتا ہے کوئی نئی بات سامنے آجائے یا آپ کی معلومات میں اضافہ ہو۔

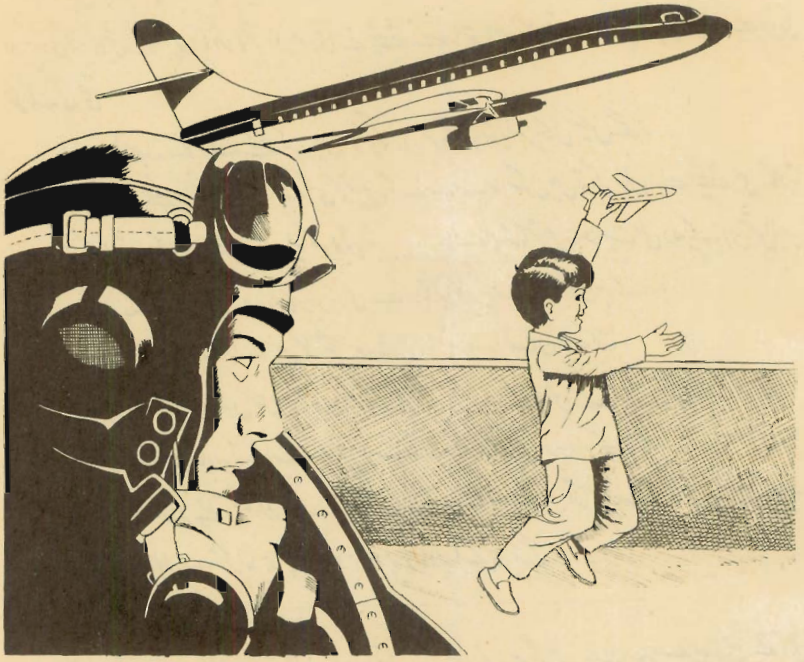
• دورانِ گفتگو آپ کا مخاطب کوئی راز کی بات آپ سے کہے تو اس راز کو اپنے پاس امانت رکھئے۔ دوسروں کے راز کی تشہیر کر کے اپنے راز کو اخفا رکھنے کی خواہش نادانی ہے۔

• ایسی بات، زبان سے نکالنے میں احتیاط کیجئے جس کو سُن کر مخاطب سمجھے کہ یہ صاحب خود تو عمل کرتے نہیں اور مجھے نصیحت کئے جا رہے ہیں۔

ہمیں اُمید ہے کہ ان باتوں پر عمل کر کے نہ صرف آپ کی گفتگو اچھی ہوگی بلکہ آپ کی شخصیت میں نکھار آئے گا اور دوسروں کے نزدیک پسندیدہ اور محبوب ٹھہریں گے۔

مصطفیٰ چاند کی خوبصورت تحریر

پائلٹ



اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ دوسری جماعت میں اوّل آیا تھا تو شمس الدین صاحب جو اس کے استاد بھی تھے اور پڑوسی بھی، اُسے چابی سے چلنے والا رنگ برنگا سا جہاز تحفے میں دینے آئے تھے پھر تو جاوید کے ہاتھ گویا کوئی خزانہ لگ گیا ہو وہ پورا پورا دن جہاز میں چابی بھرتا اور صحن کے اونچے نیچے فرش پر دوڑاتا پھرتا۔

"بیٹا یہ جہاز چھوڑ دے کتابیں پڑھے گا نا تو تجھے اس سے بھی بڑا جہاز ملے گا جو ہواؤں میں اڑے گا اور تو اُس میں بیٹھ کر دُور دُور ملکوں میں جایا کرے گا۔"

"تو ابا میں جہاز کا ڈرائیور ہوں گا....." جاوید حیرانی سے پوچھتا۔

"ارے نہیں بیٹا۔ جہاز کے چلانے والے کو ڈرائیور تھوڑی کہتے ہیں وہ تو پائلٹ ہوتا ہے پائلٹ.....

"تو میں پائیلٹ بنوں گا....." جاوید غیر یقینی کے عالم میں کہتا۔

"ہاں ہاں تو پائلٹ بنے گا۔ کبھی دیس میں جائے گا کبھی پردیس۔ پر بیٹا ہمیں بھول مت جائیو ہاں....." اس کا باپ نصر اللہ اپنی شہادت کی انگلی اس کے چہرے کی طرف تان کر کہتا۔

"نہیں ابا ہم سب ساتھ چلا کریں گے سب سے آگے میں بیٹھوں گا اس سے پیچھے ابا پھر اماں اس کے بعد کوکو اور مودی کو بٹھائیں گے۔ پر ابا اگر کوکو اور مودی نے شیشے سے ہاتھ باہر نکالا تو....." جاوید کو تو ابھی سے ان کی فکر لگ گئی تھی۔

"ارے بیٹا جہاز کے شیشے کھلتے کب ہیں جو کوکو اور مودی ہاتھ باہر نکال سکیں گے۔"

"کیوں ابا کیا کھلنے والے شیشے بنانے کسی کو نہیں آتے۔ ہمارے اسکول میں تو اکبر خان ایسے شیشے بھی لگا دیتا ہے جو اندر کھولو تو اندر کھل جاتے ہیں اور باہر کھولو تو باہر..... ہمارے ہیڈ ماسٹر میں ناعنایت علی وہ ایک دن شمس الدین صاحب سے کہہ رہے تھے کہ اکبر خان بڑا کاریگر آدمی ہے۔ ابا کیا کاریگر بہت بڑا آدمی ہوتا ہے؟"

"ہاں بیٹا ہاتھ کا ہنر جاننے والے سبھی کاریگر ہوتے ہیں۔" نصر اللہ اطمینان سے کہتا۔

"مگر ابا میں کاریگر نہیں بنوں گا میں تو جہاز اڑاؤں گا....." جاوید بڑے جوش کے ساتھ کہنے لگتا۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں جاوید تو پائلٹ بنے گا۔ بہت دُور، دُور، اوپر ہی اوپر جایا کرے گا....."

اور جاوید منہ اٹھا کر نیلے آسمان پر جہاز ڈھونڈنے لگتا اُس لمحے جاوید کو یوں لگتا جیسے وہ آسمانوں پر اُڑتی چیل کے نرم پروں پر بیٹھا بادلوں سے ٹکراتا ہوا چلا جا رہا ہو اوپر ہی اوپر آگے ہی آگے.....!

تین سالوں بعد جب وہ پانچویں کلاس میں آیا تو اس کے چھوٹے سے گھر میں بہت سارے جہاز جمع تھے کوئی لڑاکا طیارہ۔ کوئی ایف سکسٹین ۱۹ر ۱۶ کوئی جمبو جٹ تو کوئی کنکورڈ۔

وہ تمام تر وقت پڑھائی میں گذار دیتا اُسے پتہ تھا کہ مجھے پائلٹ بننا ہے اور ابا کے علاوہ شمس الدین صاحب نے بھی اُسے تاکید کی تھی کہ اگر وہ پائلٹ بننا چاہتا ہے تو پڑھائی پر خوب توجہ دے..... وہ صبح سے دوپہر تک اسکول میں رہتا دوپہر میں نماز اور کھانے سے فراغت کے بعد اسکول کا کام مکمل کرتا اور شام کو بڑی آپا کے ہاں ٹیوشن پڑھنے چلا جاتا۔ مغرب کی نماز وہ راستے کی مسجد میں پڑھتا ہوا ساڑھے سات بجے گھر پہنچتا تو اماں دری بچھائے، چنگیری کھولے کھانے کے انتظار میں بیٹھی دکھائی دیتی۔ پھر عشا کی نماز کے بعد جب وہ کتابیں لے کر بیٹھتا تو نیند ہی اُس

کی آنکھوں سے گھس کر اُس کے ہاتھوں سے کتابیں چھینتی۔ ورنہ تو کتنی بار اس کے جبار ماموں کہہ چکے تھے کہ بیٹا دس گیارہ بجے سو جایا کرو مگر وہ بڑی عجیب سی بات کہتا۔

"جبار ماموں میں سو گیا نا تو میرا جہاز نکل جائے گا نہ معلوم کس وقت آ پہنچے مجھے لینے کے لئے ..... اور اگر میں سو گیا اور جہاز میرا انتظار کرنے کے بعد نکل گیا تو پھر دوبارہ تھوڑی آئے گا ....."

جبار ماموں چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہتے اور پھر بولتے۔

"بیٹا جی ..... یہ بہت اچھی بات ہے مگر یہ بھی تو دیکھو نا کہ متواتر کئی گھنٹے پڑھنے سے خدانخواستہ آپ کی طبیعت خراب ہو جائے اور اگلے چند روز آپ کچھ بھی نہ پڑھ سکیں پھر .....؟"

"اگلے دن کا تو کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا ماموں ..... جو وقت ہے اسے غنیمت نہ سمجھوں .....؟"

جاوید کی دلیلوں کے آگے کوئی بھی نہ ٹھہر سکتا تھا اور وہ پھر سے کتابیں لے کر ایک کونے میں بیٹھ جاتا۔ اب تو کوکو اور مودی بھی پہلی جماعتوں میں آ گئے تھے۔

اُس شام ٹھنڈک خاصی بڑھ چکی تھی۔ ہوا کے یخ بستہ جھونکے اس کے پھٹے ہوئے سویٹر سے آر پار ہو رہے تھے وہ ٹھٹھرتا ہوا کچی پکی گلیوں سے ہوتا ہوا بغل میں کتابیں دبائے حاجی کے ہوٹل سے گذر رہا تھا۔

"کہاں سے آ رہا ہے چھوٹے، اتنی سردی میں ....." حاجی نے ہوٹل سے ہی ہانک لگائی۔

"چاچا ٹیوشن پڑھ کر آ رہا تھا ....." اس نے ایک لمحے کو قدم روکے اور دوبارہ آگے بڑھنے لگا۔"

"ارے ٹھنڈ لگ جائے گی رات میں نہ نکلا کر ....." حاجی نے بڑے کفگیر سے دیگ میں ہلچل مچاتے ہوئے کہا۔

"چاچا مجھے کچھ نہیں ہوتا ....." وہ بدستور چلتے ہوئے بولا۔

"ارے تو کیا کرے گا ان کتابوں کو چاٹ کر، وہی باپ کا سبزی کا ریڑھا چلائے گا۔ پھر بھلا ان بہت سی کتابوں کو نگلنے سے فائدہ .....؟"

حاجی کے لفظوں نے اس کے قدم روک لئے۔

میں سبزی کا ٹھیلا گھسیٹوں گا .....؟ جاوید نے رُک کر اپنے آپ سے سوال کیا حاجی نے جاوید کو ایک جگہ ساکت دیکھا تو دوبارہ سے بولنے لگا۔

"بیٹا سچ کہتا ہوں کچھ نہیں ہے ان کتابوں میں۔ تجھے واپس اسی جگہ پر آنا پڑے گا۔ بھلا کبھی غریب کا بچہ بھی بڑا آدمی بنا ہے ....."

اچانک آنکھ، اور جھٹکا جاوید نے اپنے اندر محسوس کیا۔

"غریب کا بچہ بھی بڑا آدمی بنا ہے ....." چند لمحوں کی کشمکش کے بعد وہ پھر سے ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے بعد بولا۔

"چاچا علم کسی کی میراث تو نہیں ہوتی نا کہ غریب کے حصے میں نہیں آئے گی یہ تو قدرت کی طرف سے ہے کہ جو حاصل کرے اسی کو ملے گی میں نصر اللہ خان سبزی فروش کا بیٹا ضرور ہوں مگر میں تو پائلٹ بنوں گا جہاز اڑاؤں گا۔ اور ایک دن دیکھ لینا چاچا، میں جہاز تیرے ہوٹل کے اوپر سے لے کر جاؤں گا۔ تب تو ساری بستی والوں سے خوشی سے یہ کہتا پھرے گا۔ دیکھو دیکھو..... اپنا جاوا جو کل گلی کوچوں میں کتابیں اٹھائے پھرتا تھا آج بڑے سے جہاز میں میرے ہوٹل سے گذرا ہے....."

جاوید نے ایک ایک لفظ بڑے ٹھنڈے میٹھے لہجے میں ادا کیا۔ حاجی جاوید کا جواب سُن کر زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔

"لگتا ہے چاچا تجھے میری باتوں کا یقین نہیں آیا....." جاوید نے حاجی کی ہنسی دیکھ کر کہا۔

"اللہ کرے تو پائلٹ بنے ..... بس اب دیر مت کر۔ ٹھنڈ بھی بڑھ رہی ہے اور رات بھی، ماں تیری راہ دیکھتی ہوگی شاباش اب فوراً گھر جا....." حاجی نے اُسے پکارتے ہوئے کہا اور جاوید دوبارہ سردی کے ٹھنڈے تیروں سے ٹکراتا چھوٹے بڑے قدم اٹھاتا گھر کی طرف ہو لیا۔

جس وقت وہ گھر پہنچا ساڑھے نو بج رہے تھے۔ کوکو اور مودی دونوں سو چکے تھے البتہ امّاں اور ابّا دونوں زرد سی روشنیوں میں جاگ رہے تھے۔

"آج دیر کر دی تو نے ....." امّاں نے کھانا دری پر رکھتے ہوئے کہا۔

"امتحان قریب ہیں نا بڑی آپا نے کہا تھا کہ اب ذرا زیادہ توجہ دینی پڑے گی ....." جاوید نے روٹی کا پہلا لقمہ توڑا اور منہ میں رکھ لیا۔

"ہاں بیٹا ..... خوب توجہ سے پڑھنا ... تاکہ اچھے نمبر آئیں اور ہمارا بیٹا پائلٹ بن جائے ....." امّاں نے جاوید کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔

"ابّا تو پائلٹ کیوں نہیں بنا ....." جاوید نے اچانک ابّا سے سوال کر ڈالا۔

"بیٹا ..... ہمارا دور اور تھا اس وقت تو لوگ پڑھتے بھی کم تھے اور جو پڑھتے تھے وہ یا تو ڈاکٹر بن جاتے یا وکیل ..... ہمارے ماں باپ کے پاس اتنا پیسہ کہاں تھا کہ وہ ہمیں دے کر کوئی اچھا آدمی بنا سکتے ..... پھر شادی ہوگئی تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا چنانچہ یہ سبزی کا ٹھیلا ایک دوست سے لیا اور یہیں آباد ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہیں پر ہوں

سبزی بیچتا ہوں اور گھر کا خرچ چلاتا ہوں"۔

"ابا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے بھی والدین غریب ہیں پھر بھلا وہ مجھے کس طرح پائلٹ بنائیں گے....." لفظ تیر کی طرح نصراللہ کے سینے میں پیوست ہوگئے وہ چند لمحوں تک کسی مناسب جواب کی تلاش میں خاموش رہا اور بالآخر دوبارہ بول اُٹھا۔

"بیٹا تیرے لئے تو ہم اپنی جان بھی لٹا دیں گے..... ایسی کوئی بات ہوئی نا تو یہ سبزی کا ٹھیلا ہے نا..... اسے ہم بیچ دیں گے..... اگر اور ضرورت ہوئی تو ہم یہ گھر بیچ دیں گے....."

"پھر بھی پورا نہ ہوا تو میرے یہ دو سونے کے کڑے بھی تو ہیں بیٹا کب سے ہاتھوں میں بوجھ اٹھائے پھر رہی ہوں آخر کوئی تو نجات کا ذریعہ ہو....." اماں بھی بیچ میں بول پڑیں۔

تو اس کا مطلب ہے میں غریب نہیں نا....." جاوید نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔ ہاں..... بیٹا تو کہاں سے غریب ہوا..... خدا تجھے لمبی عمر دے۔ بڑی کمائی دے۔ میری تو یہی دعائیں ہیں تیرے لئے....." اماں ہاتھ پھیلا کر پھر سے دعائیں دینے لگیں اور جاوید اطمینان کے ساتھ اُٹھا اور دوبارہ کتابیں لے کر بیٹھ گیا۔

امتحان کے دِن قریب آتے جا رہے تھے جاوید تمام وقت کتابوں سے چمٹا دکھائی دیتا۔ اب کی بار تو مقابلہ بڑا ہی سخت تھا شانی اور خاور اسکول میں اسی سال داخل ہوئے تھے لیکن وہ دونوں بھی بلا کے ذہین تھے ششماہی امتحان میں تو جاوید اوّل آگیا تھا مگر شانی اور خاور کے نمبر بھی کچھ کم نہ تھے بمشکل چند نمبروں کے فرق سے خاور دوسرے اور شانی تیسرے نمبر پر آیا تھا۔ لیکن جاوید کو اب فکر محسوس ہو رہی تھی اُس کو ہر حال میں اپنا سابقہ ریکارڈ برقرار رکھنا تھا۔ تینوں کے درمیان زبردست مقابلہ شروع ہوگیا تھا۔ جوں جوں امتحان کی تاریخ قریب آتی جا رہی تھی جاوید کی نیندیں اُسی تیزی کے ساتھ اڑتی جا رہی تھیں پورے دِن میں وہ بہ مشکل چند گھنٹے آرام کرتا۔

اِس وقت بھی وہ انگلش کی کتاب ہاتھ میں لئے قائداعظم پر مضمون یاد کر رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی "کون ہے بھئی.....؟" جاوید نے ٹہلتے ہوئے ہانک لگائی۔

"جاوید میں ہوں شانی....." شانی کی آواز سن کر جاوید نے جلدی سے دروازے کی کنڈی کھولی۔ شانی سلام کرتا ہوا اندر داخل ہوا۔

"کہو کیسے آنا ہوا....." جاوید نے کتاب کو بدستور ہاتھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

"ایک کہانی سنانے آیا ہوں....." شانی نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا کہانی سنانے آئے ہو.....؟ جاوید نے حیران ہو کر کہا اور دوبارہ بولا۔

"لگتا ہے امتحانوں سے گھبرا کر سٹھیا گئے ہو..... امتحان سر پر ہے اور تمہیں ڈرامے کی سوجھی ہوئی ہے....."

جاوید نے تنگ آ کر کہا۔

"ہاں..... ہاں.... تم سنو تو....." شانی نے ضد کی۔

"اچھا سناؤ....." جاوید ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ کا مکا بنا کر بیٹھ گیا۔

"ایک جہاز کئی سو فٹ کی بلندیوں پر اڑا چلا جا رہا تھا اچانک پائلٹ کو احساس ہوا کہ جہاز میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور جہاز عنقریب تباہ ہو جائے گا۔ جہاز میں دیگر افراد کے علاوہ ایک ایسا بچہ بھی بیٹھا ہے جس کے ماں باپ ائیر پورٹ پر اسے لینے کے لئے آئے ہوئے ہیں بچہ ان دونوں ماں باپ کا آخری اور واحد سہارا ہے جس کی آس پر وہ زندہ ہیں اگر بچہ مر گیا تو ائیر پورٹ سے دو لاشیں مزید نکلیں گی۔ اس کے ماں باپ کی بھی..... پائلٹ اس حقیقت سے آگاہ ہے اب بتاؤ اسے کیا کرنا چاہیئے.....؟

کیا وہ "ایجیکٹ" کا بٹن دبا کر پیراشوٹ کے ذریعے تباہ ہوتے ہوئے جہاز سے نکل جائے.....؟

یا وہ قربانی کے جذبے سے سرشار ہو کر اپنی سیٹ پر اس بچے کو بٹھا دے جسے اپنے ماں باپ کے لئے زندہ رہنا ہے.....؟"

شانی نے کہانی ختم کر دی وہ جاوید کے جواب کا منتظر تھا جاوید چند لمحوں تک سوچتا رہا اور پھر بولا۔

"کہانی تو بڑی عجیب و غریب ہے مگر یہ بتاؤ کہ اس کا کردار کون ہے.....؟ جاوید نے الٹا اس سے سوال کر ڈالا شانی چند لمحے تک کچھ سوچتا رہا اور پھر بولا۔

"اگر میں یہ کہوں کہ پائلٹ تم ہو اور وہ بچہ میں..... تو....."

جاوید چونک کر رہ گیا اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں چند لمحوں تک وہ مسلسل شانی کو گھورتا رہا۔ اور پھر مدھم لہجے میں بولا۔

"شانی میں پائلٹ تو نہیں، ہاں میں نے اس کا خواب ضرور دیکھا ہے مگر تم وہ بچے.....؟ سوال پھر جاوید کے تالو سے چمٹ گیا تھا۔

"جاوید میں اپنے والدین کا پہلا اور آخری خواب ہوں۔ میرا باپ دمے کا مریض ہے ماں تھوڑا بہت کام کر کے گھر کا خرچ چلاتی ہے۔ امتحان قریب ہیں اور میرے پاس کتابیں نہیں....." اس نے مختصر سے الفاظ میں

سادگی سے اپنا دکھ بیان کر دیا۔ جاوید عجیب سی کشمکش دبنج میں پڑ گیا تھا۔ وہ کون سا اتنا امیر تھا کہ اپنی کتابیں اس کو دے دیتا۔ اس نے بھی تو بہت سارے خواب دیکھے تھے پائلٹ بننے کے وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا اور پھر چند کتابیں شانی کے حوالے کرتا ہوا بولا۔

"شانی میں بھی تمہاری طرح پائلٹ کے بجائے سیٹ پر بیٹھا ہوا وہ بچہ ہوں جس کے ماں باپ ائیر پورٹ کی رونقوں میں کھڑے ہیں۔ ہمارے دکھ ایک سے ہیں یہ چند کتابیں لے جاؤ جب یاد ہو جائیں تو دے دینا اور یہ کتابیں لے جانا جو میرے پاس ہیں ہم دونوں ایک ہی کتابوں سے پڑھیں گے ....."

"تھینک یو ..... جاوید تھینک یو ....." شانی کے چہرے پر زندگی کی رونق سمٹ آئی تھی۔ اور وہ ہاتھ ملاتا ہوا تیزی سے باہر نکل گیا۔

جاوید نے دوبارہ انگلش کی کتاب ہاتھ میں پکڑی اور قائد اعظم کا مضمون یاد کرنے لگا۔

پھر وہ مختلف چھوٹی چھوٹی خوشیوں اور غموں کے درمیان چلتا ہوا میٹرک میں آ گیا شانی بھی اس کے ساتھ تھا مختلف جہازوں کے بہت سے ماڈل اب بھی اس کے پاس تھے جنہیں وہ دیکھ کر اکثر سوچتا کہ۔

ایک وقت آئے گا جب یہ جہاز بہت بڑا ہو جائے گا اور اس کے اندر بیٹھے پلاسٹک کے چھوٹے سے آدمی کی جگہ نصر اللہ خان کا بیٹا جاوید خان بیٹھا ہو گا۔ یہ جہاز یہیں الماری کے اوپر اور فرش کے سینے پر دوڑتا رہ جائے گا۔ اور اس کا جہاز فضاؤں میں بلند ہو جائے گا۔"

اکثر کتابوں کے حروف پڑھتے وقت اسے ایسا لگتا کہ جیسے ہر لفظ چھوٹے چھوٹے جہاز میں بدل گیا ہے

اس شام جب وہ گھر میں داخل ہوا تو گھر کے اندر بے انتہا خاموشی برس رہی تھی اور جب خالہ زینب کی آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرائی تو جیسے اس پر پہاڑ گر گیا ہو نصر اللہ اپنا سبزی کا ریڑھا چلاتے ہوئے ہارٹ اٹیک سے مر گیا تھا .....!

اس کو بالکل بھی یقین نہیں آیا اس وقت بھی نہیں جب اس کے باپ کا چالیسواں تھا۔ کتنی آہستگی سے تمام دن گزر گئے۔ وہ سوچ رہا تھا اس کا باپ ابھی کواڑ کھول کر اندر داخل ہو گا اور آتے ہی کہے گا۔

"جاوید تو پائلٹ بنے گا۔ کبھی دیس میں جائے گا کبھی پردیس میں۔ پر بیٹا ہمیں بھول مت جائیو ہاں ....." مگر اب تو اسے پائلٹ کہنے والا کوئی بھی نہیں تھا۔

اس روز جب وہ بڑی آپا کے ہاں سے ٹیوشن پڑھ کر آ رہا تھا تو حاجی کا ہوٹل خالی پڑا تھا حاجی اکیلا بیٹھا حقہ گڑگڑا

رہا تھا حاجی اُسے دیکھتے ہی بولا۔

"او پہلوان کدھر سے نکلا۔ کدھر جا رہا ہے.....؟

"پڑھنے گیا تھا چاچا۔ ابھی واپس آیا ہوں....." اس نے بھی وہیں سے ہانک لگائی۔ حاجی کچھ دیر تک حُقہ کی نال منہ میں دبائے بیٹھا رہا اور پھر بولا۔

"بیٹا ایک بات تو بتاؤ....."

"ہاں چاچا پوچھ....." اس نے کتابیں میز پر رکھ دیں اور جگ اُلٹ کر گلاس بھرنے لگا۔

"گھر کا خرچہ کون چلاتا ہے.....؟ حاجی نے اپنا لاچا ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

"ماں چلاتی ہے۔" اس نے ٹھنڈے پانی کا پورا گلاس انڈیل کر کہا۔

"نہیں بیٹا بُری بات.. ماں سے کام نہیں کراتے۔ تیرے باپ کے بعد اب تو گھر کا سب سے بڑا ہے چھوڑ یہ کتابوں کے دھندے اور کہیں کام پر لگ جا....."

"مگر چاچا میں تو پائلٹ....." اس نے پھر کہنا چاہا۔

"ارے رہنے دے پائلٹ کو۔ یہ سب خواب ہوتے ہیں..... کل سے میرے پاس آجانا تیرے باپ کا ٹھیلا میرے پاس ہے۔ سبزی لگا دُوں گا۔ بس اب تو خود کو گھر کا بڑا سمجھ..... تیرے دو بھائی اور بھی ہیں ان کے مستقبل کی فکر کر....."

حاجی یہ کہہ کر اپنی جگہ سے اُٹھ گیا۔

"اگر دِل مانے تو کل چھ بجے آجانا میرے پاس..... اب گھر جا.....!

جاوید تھکے تھکے قدم بڑھاتا ہوا اپنے گھر کی طرف چل دیا اس کے سارے خواب تو ٹوٹ گئے تھے.....!

اگلے دِن جب وہ اٹھا تو اس نے لکڑی کی الماری پر رکھے اپنے سارے جہاز توڑ ڈالے۔ کنکورڈ، ایف سکسٹین جیٹ طیارہ۔ لڑاکا مار۔

"بھائی انہیں توڑو مت۔ ان سے میں کھیلوں گا....." کوکو مسکین سی صورت بنا کر بولا۔

"ہاں بھائی اس پر ہم جہاز اڑانا سیکھیں گے۔" مودی نے بڑے اشتیاق سے ٹوٹے ہوئے جہازوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جاوید چند لمحوں تک ہاتھ میں جہاز پکڑے کھڑا رہا اور بالآخر سارے جہاز وہیں چھوڑ کر باہر نکل گیا۔

دو مہینے تک وہ اپنے ابّا کا سبزی والا ریڑھا گھسیٹتا رہا۔ گلیوں میں جب وہ سبزیوں کی آواز لگاتا تو گلی والے نصراللہ کے مُغالطے میں باہر آجاتے پھر یہ اس کا روز کا معمول بن گیا۔

اس وقت وہ حاجی کے ہوٹل پر بیٹھا تھا اور گرم چائے اس کے حلق سے اُترتی چلی جا رہی تھی۔

"چاچا اس سبزی میں کمائی کچھ بھی نہیں ہے میرے کو کہیں اور فٹ کر دے....." اس نے اٹھ کر حاجی کے پاس آ کر کہا۔

"ڈرائیوری سیکھے گا....."

"ہاں.... ہاں کیوں نہیں....." جاوید نے جلدی سے کہا۔

"ڈرائیوری سیکھے تو تجھے ایک دو ہزار روپے مہینے کے بچ جایا کریں گے۔" حاجی بال درست کرتے ہوئے بولا۔

"اچھا تو یوں کر ناصر سجت کے پاس چلا جا۔ گاڑی بھی اچھی سکھا دے گا اور نوکری بھی دے دے گا....." حاجی نے آخری فیصلہ سنایا۔

"ٹھیک ہے چاچا....." جاوید ہاتھ ملاتا ہوا باہر نکل گیا۔

سب خوابوں کو بھول کر وہ چند ہی دنوں بعد ایک بس لے کر روڈ پر آ چکا تھا۔ دو تین سالوں کے بعد وہ ڈرائیوری میں لاثانی ہو گیا تھا۔ آمدنی زیادہ ہوئی تو گھر کی حالت بھی بہتر ہونے لگی کوکو اور مودی اب بالترتیب پانچویں اور چھٹی میں آ گئے تھے کوکو ڈاکٹر بہت اچھے لگتے تھے وہ تمام دن دوستوں کی نبضیں دیکھتا رہتا اور پھر ان کو الٹے سیدھے مشورے دیتا۔ مگر مودی انہی جہازوں سے کھیلتا جنہیں جاوید چھوڑ چکا تھا۔

"بھائی میں پائلٹ بنوں گا اور یوں زن سے اُڑتا ہوا گذر جایا کروں گا۔" وہ اکثر جاوید کی گود میں بیٹھ کر ہاتھ کے اشارے سے کہتا۔ اور جاوید ہنس دیتا۔

تین سال اور گذر گئے جاوید اب بائیس سال کا ہو چلا تھا۔ کوکو اور مودی اب آٹھویں اور نویں جماعت میں آ چکے تھے۔

آج کے دن کی گرمی کل کی نسبت کافی تیز تھی جاوید ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا بس دوڑائے جا رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے اس کی بس میں مسافروں کی تعداد کم تھی۔ وہ ایک بس اسٹاپ پر ٹھہر گیا "منگل بازار" سے عورتیں خریداری کر کے بس اسٹاپ کی طرف آ رہی تھیں۔ اسے ٹھہرے ہوئے بمشکل چند منٹ گزرے ہوں گے کہ پیچھے بیٹھے ہوئے لوگ چلانے لگے۔

"بس چلاؤ بھئی....."

"کس کا انتظار ہے یہاں"

"یونہی خوامخواہ روک کر کھڑے ہو گئے ہو بس۔ گرمی اس طوفان کی ہے ...."

مختلف جملے اس کی سماعتوں سے ٹکرانے لگے کنڈیکٹر ان کو جواب دینے لگا وہ بدستور سامنے لگے شیشے سے "منگل بازار" کی گہما گہمی دیکھتا رہا۔ اب لوگ بس کو پیٹنے لگے تھے۔

"آرام سے بیٹھو بھائی ....." اس نے ماتھے کے سامنے لگے شیشے سے پیچھے والوں کو گھور کر کہا سب ایک دم خاموش ہو گئے لیکن اس کو سامنے دیکھتا دیکھ کر پھر سے بڑبڑانے لگے۔ جاوید اسٹیرنگ پر دونوں ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔

"چل بھئی او پائلٹ ....." اچانک جیسے کسی نے جاوید کی بس کو ٹکر مار دی ہو اس کو اپنے اندر ایک بھرپور جھٹکا لگا جملہ اس کی سماعتوں سے چپک کر رہ گیا۔

"چل بھئی او پائلٹ ....."

وہ چوروں کی طرح منہ چھپانے لگا جیسے کسی نے اس کی چوری پکڑ لی ہو۔ اس کے اندر کے چھپے پائلٹ کو دیکھ لیا ہو

"پائلٹ ..... پائلٹ ..... پائلٹ ....."

اس کے کان پر ہتھوڑے سے بجنے لگے۔ اُس نے ایک مرتبہ اپنے تمام جہاز توڑ ڈالے تھے مگر اس کے دل میں بہت سارے جہاز صحیح سالم کھڑے اُڑنے کے منتظر تھے مگر آج اسے یوں لگا تھا کہ جیسے اُس کے دل میں ٹھہرے کنکورڈ، الیف سیکسٹین، جمبو جیٹ، سب کے سب آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ سب چُور چُور ہو گئے ہوں۔ اس کا خواب اتنے عرصے بعد اتنے تیز چھناکے سے ٹوٹا تھا کہ آنسو اس کی آنکھوں سے اُبلنے لگے تھے۔ وہ اسٹیرنگ تھام کر بلک بلک کر رونے لگا۔

عورتیں اس کو حیران ہو کر دیکھنے لگیں مردوں والے حصّے سے لوگ اُچک اُچک کر جاوید کو گھورنے لگے۔

اسی وقت جاوید کے کندھے پر ایک نرم ہاتھ آکر ٹھہر گیا اس نے پلٹ کر دیکھا اس کے پیچھے ایک بارعب آدمی کھڑا تھا۔ جاوید نے اُس کی نگاہوں میں ایک لمحے کو گھورا اور وہ چونک اُٹھا جبار ماموں اس کے سامنے تھے ....!

"ماموں میں سو گیا۔ میرا جہاز نکل گیا ماموں ....." وہ پھر سے زار زار رونے لگا۔

"نہیں جاوید نہیں ..... کوئی جہاز نہیں نکلا سب اپنی جگہ پر ہیں۔"

"مگر ماموں میں تو ایک گھٹیا سا بس ڈرائیور ....." جبار ماموں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"کوئی پیشہ گھٹیا نہیں ہوتا انسان اپنے کردار سے شناخت ہوتا ہے تم چھوٹے کردار کے بڑے آدمی کے بجائے بڑے کردار کے چھوٹے آدمی ہو۔ ..... جانتے ہو بڑے کردار کے آدمی دوسروں کے لئے راستہ چھوڑ دیتے ہیں وہ ان بیجوں کو جنہیں حاصل کرنے کی خواہش خود ان کے دل میں بھی ہوتی ہے اپنے ہاتھوں سے دوسروں کے سینے پر

سجا دیتے ہیں۔ جانتے ہو وہ ایک لڑکا جسے تم نے اپنی کتابیں دی تھیں اور جس کی تم بعد میں بھی مدد کرتے رہے۔ آج پائلٹ بن چکا ہے ....."

"کیا سچ .....؟ جاوید حیرت سے چونکا۔

"ہاں ..... آج وہ فضاؤں میں اُڑتا ہے اور بادلوں کے بگولوں پر تمہارا نام لکھتا ہے ہوا واپس زمین پر آجاتا ہے تم تمام دن فضاؤں میں تیرتے رہتے ہو ..... تم تو سب سے بڑے پائلٹ ہو .....؟

جاوید غیر یقینی کے عالم میں جبّار ماموں کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہاں جاوید ہاں ..... تم پائلٹ ہو اور ابھی بہت سے پائلٹوں کو تمہیں پروان چڑھانا ہے مودی تمہارا ہاتھ پکڑ کر پرواز کرنا چاہتا ہے تمہارا منتظر ہے ..... جاؤ ..... جاوید جاؤ ....."

آنسو صاف کر کے جاوید نے گیئر بدلا اور اس کی بس آگے بڑھنے لگی۔ دُور فضاؤں میں ایک جہاز گڑگڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا جاوید نے ایک نظر بادلوں میں گم ہوتے جہاز کو دیکھا اور فخر سے بولا۔

"میں اب بھی پائلٹ ہوں ..... فضاؤں میں اڑنے والا ....."

یہ کہہ کر وہ پھر سے سڑک پر اس سمت دوڑنے لگا جہاں بہت سارے مستقبل کے پائلٹ اس کے انتظار میں کھڑے تھے!

چندہ

ایک امریکی بہت عرصہ اسکاٹ لینڈ میں گزارنے کے بعد وطن واپس پہنچا اور ملازمت کے متعلق غور کرنے لگا۔ آخر پولیس میں بھرتی ہونے کا فیصلہ کیا تو انٹرویو کے دوران میں اُس سے پوچھا گیا: "امریکہ میں کسی ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے تم کیا کرو گے؟"

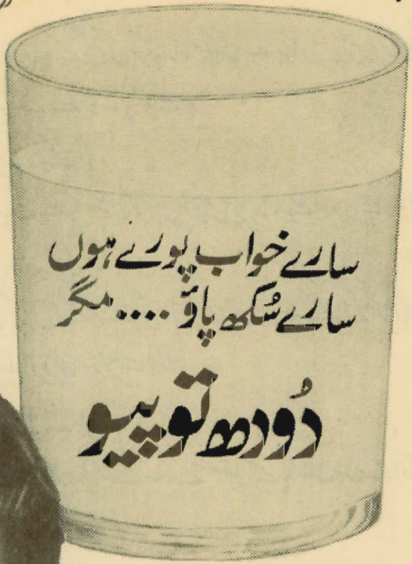
امریکی نے جواب دیا: "امریکہ کے متعلق تو کچھ معلوم نہیں مگر یہ بتا سکتا ہوں کہ اسکاٹ لینڈ میں ہجوم منتشر کرنے کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔"

"اسکاٹ لینڈ میں تم کیا کرو گے؟" انٹرویو لینے والے نے پوچھا۔

"میں چندہ مانگنا شروع کر دوں گا۔

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

مستقبل کی بڑی ذمّہ داریوں کے لئے ابھی سے اپنے ذہن کو تروتازہ اور جسم کو توانا رکھئے غیر متوازن غذائیں انسانی جسم کی تمام ضروریات پوری نہیں کرتیں۔
دودھ واحد غذا ہے جو انسانی جسم کو زیادہ سے زیادہ قوّت فراہم کرتی ہے۔



سارے خواب پورے ہوں
سارے سُکھ پاؤ .... مگر

دُودھ تو پیو



قدرت کی عطا کردہ اِس انمول نعمت میں کیلشیم، پروٹین، وٹامنز اور بہت سے معدنی اجزا شامل ہیں۔ دُودھ کا روزانہ استعمال۔ اچھی صحت، بیدار ذہن اور خوشگوار زندگی کی ضمانت ہے
دن میں دو بار دودھ پینا اپنی عادت بنایئے۔
چاہیں تو دُودھ میں چاکلیٹ یا شربت ڈال کر پی سکتے ہیں۔

یوں گویا۔
غذا کی غذا
مزے کا مزا

اشتہار برائے بہبود اطفال: منجانب ماہنامہ آنکھ مچولی، کراچی

پرنالہ

مسجد نبویؐ کے ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کا مکان تھا جس کا پرنالہ مسجد نبویؐ کے صحن میں گرتا تھا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دور خلافت آیا تو آپ نے یہ دیکھ کر کہ پرنالے کا پانی مسجد نبویؐ میں گرتا ہے جس سے مسجد میں آنے والے نمازیوں کے کپڑے خراب ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ کے حکم سے وہ پرنالہ اکھڑوا دیا گیا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے مدینہ کے قاضی حضرت اُبی بن کعبؓ کی عدالت میں حضرت عمرؓ کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔

جب دونوں فریق عدالت میں پیش ہوئے تو حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ پرنالہ اکھڑوانے کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں۔ میں نے یہ اس لئے کیا کہ مسجد میں آنے والوں کے کپڑے خراب نہ ہوں اور میں نے اپنی سمجھ کے مطابق کوئی ناواجب کام نہیں کیا۔

اب قاضی صاحب نے حضرت عباسؓ سے پوچھا آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ جب سے یہ مکان بنا ہے پرنالہ وہیں رہا اور اس پرنالے کو حضورؐ نے لگوایا۔ حضورؐ نے حکم دیا کہ میرے کندھوں پر کھڑے ہو جاؤ اور پرنالہ لگا دو۔ چنانچہ حضورؐ کے ارشاد کے مطابق میں نے پرنالہ یہاں لگا دیا۔ رسول اللہؐ کے بعد بھی حضرت ابوبکرؓ صدیق کی خلافت کے زمانے میں کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ مگر اب حضرت عمرؓ نے آکر اُسے اکھڑوا دیا ہے۔

قاضی نے حضرت عباسؓ سے کہا کہ آپ اپنے دعوے کے ثبوت میں کوئی گواہ پیش کر سکتے ہیں۔ حضرت عباسؓ گواہ لے آئے جنہوں نے ان کے بیان کی تائید کی۔

اس وقت مسلمانوں کے بڑے خلیفہ حضرت عمرؓ فاروق کی عجیب حالت تھی۔ آگے بڑھے

اور حضرت عباسؓ سے کہا کہ خدا کے لئے میرا قصور معاف کر دیجئے۔ مجھے اس کا علم نہ تھا کہ رسول اللہ نے یہ پرنالہ رکھوایا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا لاعلمی میں ہوا۔ اس کی تلافی یوں ہو سکتی ہے کہ آپ میرے کندھوں پر کھڑے ہو کر یہ پرنالہ اصلی جگہ پر رکھ دیں گے۔

حضرت ابی ابن کعبؓ نے فرمایا "امیرالمومنین انصاف یہی چاہتا ہے۔ آپ کو یہی کرنا چاہیئے۔ پھر لوگوں نے دیکھا کہ قیصر و کسریٰ جس کے نام سے گھروں میں بیٹھے کانپ جاتے تھے وہ دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہے۔ اور حضرت عباسؓ اُس کے کندھے پر سوار ہو کر پرنالہ لگا رہے ہیں۔ پرنالہ لگ چکا تو حضرت عباسؓ نیچے اُتر آئے اور عرض کی۔

امیرالمومنین! یہ جو کچھ ہوا حق کے لئے ہوا جو میرا حق تھا۔ مجھے میرا حق آپ کی حق پسندی کی وجہ سے مل گیا۔

سب سے پہلے تو میں آپ سے اس بے ادبی کی معافی مانگتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ اپنا مکان اللہ کی راہ میں وقف کرتا ہوں۔ آپ کو اجازت ہے کہ آپ اسے مسجد نبوی میں شامل کر کے مسجد کو وسیع کر لیں تاکہ نمازیوں کی تکلیف دُور ہو جائے۔ اللہ میری اس قربانی کو قبول فرمائے۔

خدمت خلق

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں ایک مکان مخصوص کیا جسے آٹا گھر کا نام دیا گیا، اس میں آٹا، ستو، کھجور، خشک انجیر اور ضرورت کی دوسری چیزیں ہوتیں۔ ان سے بے آسرا مسافروں کی مدد کی جاتی اور جو لوگ حضرت عمرؓ سے ملنے آتے، وہاں ٹھہرتے حضرت عمر نے مکہ اور مدینہ کے راستوں میں بے آسرا مسافروں کے لئے اور انہیں ایک چشمے سے دوسرے چشمے تک پہنچانے کے لئے امدادی انتظامات بھی کئے تھے۔

مُرغ کو گالی نہ دو

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرغ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک چیخا تو ایک شخص نے اسے گالی دی تو حضور نے اسے منع کیا اور فرمایا "اسے گالی نہ دو کہ یہ (اپنی اذان سے) نماز کی طرف بلاتا ہے۔"



"جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم"

بالکل ایسے ہی

گرمیوں کی حدّت میں ٹھنڈے اور شیریں احساس

کا

ایک حسین نام

نورس

قومی مشروب

ایک عوامی پیکج میں بھرپور دستیابی ہے

پہچان پر ہے ناز تو پہچان جائیے!



۱



۲



۳



۴



۵



۶



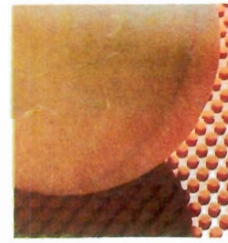
۷



۸



۹



۱۰



۱۱



۱۲

کیا آپ ان ۱۲ تصاویر کو ٹھیک ٹھیک پہچان سکتے ہیں۔ آئندہ ماہ ہم ان تصویروں کے جواب شائع کریں گے اور ان سے آپ اپنی ذہانت کا اندازہ لگا سکیں گے۔ کہ آپ نے کتنی تصویروں کو بالکل صحیح پہچانا۔



عظیم سرور

رومی بھیس بدلتا ہے

آخری قدم

قسط نمبر ۱۱

رومی بچوں کی ایک فلم دیکھنے کے لئے گھر سے نکلا۔ ایک شخص نے ایک کار سے اتر کر تیزی سے ایک رومال اس کی ناک پر رکھا۔ رومی کا سر چکرانے لگا، اسے ہوش آیا تو وہ ایک کمرے میں قید تھا۔ تھوڑی دیر میں اسے کمرے سے نکال کر ایک بڑے بچے بہائے کمرے میں لے جایا گیا۔ ایک تخت پر ایک موٹا سا شخص بیٹھا تھا۔ سب اس شخص کو گرو کہہ رہے تھے۔ رومی کو کسی سیٹھ رفیق کے بیٹے کے دھوکے میں پکڑ کر لایا گیا تھا۔ رومی نے بتایا کہ وہ سیٹھ رفیق کا بیٹا نہیں ہے۔ سیٹھ رفیق کے بیٹے کی تصویر منگوائی گئی تو پتہ چلا کہ موٹے گرو کے آدمیوں نے غلطی کی تھی۔ موٹے گرو نے سیٹھ رفیق کے بیٹے کو پکڑنے کے لئے کہا اور رومی کے بارے میں کہا کہ اسے بھی ختم کر دو کیونکہ اس نے ہم لوگوں کو دیکھ لیا ہے۔ رومی کو کمرے میں بند کرتے وقت وہ شخص کھور دھارم کی شیشی کمرے میں چھوڑ گیا۔ اس شیشی کو لے کر رومی آئندہ لمحوں کا انتظار کرنے لگا۔ ایک شخص کھانا لے کر آیا تو رومی نے اسے بیہوش کیا اور پھر وہاں سے نکل کر موٹے گرو کے کمرے سے چابیاں نکال کر جنگلے سے باہر پہنچ گیا۔ باہر نکل کر اس نے رکشہ روکا اسے اپنے فلیٹ کا پتہ بتایا۔ رکشہ تیزی سے اس کے گھر کی طرف دوڑنے لگا۔ لیکن اس سے زیادہ تیزی سے رومی کا دماغ دوڑ رہا تھا۔

رومی گھر پہنچا تو اس کی امی نے خوشی سے گلے لپٹا لیا۔ محلے کی عورتیں بھی جمع ہو گئیں۔ ابو رومی کی تلاش میں باہر گئے ہوئے تھے وہ رات دیر سے واپس لوٹے رومی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ رومی نے پورا قصہ بیان کیا پھر ان لوگوں نے اسی وقت سیٹھ رفیق کا نمبر ڈائریکٹری میں تلاش کر کے انہیں تفصیلات بتا کر کہا کہ اپنے بیٹے کی حفاظت کریں۔ باپ کا کوئی دشمن آپ کے لڑکے کو اغوا کرنا چاہتا ہے۔ سیٹھ رفیق اپنی کار میں رومی کے گھر آئے۔ رومی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور رومی اور اس کے ابو کے ساتھ پولیس اسٹیشن اس واقعہ کی رپورٹ لکھانے چلے گئے۔ کیس کی اہمیت کے پیش نظر انسپکٹر صاحب کو بلایا گیا۔ رومی نے پورا واقعہ بیان کیا۔ سیٹھ رفیق کو بھی اس درمیان اپنے دشمن کا اندازہ ہو گیا۔ تین چار ماہ قبل ایک موٹا آدمی دو تین آدمیوں کے ساتھ ان سے اپنی اسمگلنگ کی گھڑیاں بیچنے آیا تھا۔ جسے آدھی قیمت پر بھی سیٹھ رفیق

نے لینے سے انکار کردیا تھا۔ اس نے دھمکی بھی کی کہ وہ اس گستاخی کا بدلہ لے گا۔ اسسٹنٹ انسپکٹر نے بھی فائل دیکھ کر یہی بتایا کہ وہ بہت بڑا اسمگلر ہے اور یہ محکمہ تو اس کی تلاش میں ہے۔ انسپکٹر صاحب اسی وقت ان سب کو ایک جیپ میں بٹھا کر اس بنگلے کی طرف روانہ ہوگئے۔ ایک ٹرک پر پولیس ساتھ تھی۔ پولیس نے بنگلے کو گھیر لیا۔ انسپکٹر صاحب جب بنگلے کے اندر داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ بنگلہ خالی ہے۔ اسمگلر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔ ان لوگوں نے بنگلے کے مالک چوہدری برکت علی کا پتہ چلا کر اس سے اس کے کرایہ دار کے بارے میں معلوم کیا تو معلوم ہوا کہ وہ نئے کرایہ دار ہیں اور ان کے بارے میں اُسے کچھ پتہ نہیں۔ انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ اسمگلر تھے اور اب بھاگ چکے ہیں تو چوہدری صاحب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پولیس نے کافی بھاگ دوڑ کی مگر موٹے گرد کا کچھ پتہ نہ چلا۔ سیٹھ رفیق نے خوف سے اپنے بیٹے فرید کو گھر میں بند کر رکھا تھا۔ روی بھی کافی احتیاط برتتا تھا۔ ایک دن روی بازار میں جا رہا تھا کہ اسے موٹے گرد کا ایک آدمی نظر آگیا۔ روی نے اس کا تعاقب شروع کردیا۔ وہ شخص ہوٹل کے ایک کیبن میں جا کر بیٹھا تھا۔ روی پہلے تو باہر کھڑا دیکھتا رہا پھر وہ ساتھ والے کیبن میں جا کر بیٹھا دوسری طرف والی آواز سننے کے لئے یہ پین تھا تھوڑی دیر میں ایک دوسرا آدمی اس شخص سے ملنے آیا، وہ کہہ رہا تھا کہ تمہارے لئے یہ حکم ہے کہ تم اکبر کو اطلاع دو کہ وہ کل صبح گیارہ بجے گاندھی گارڈن میں ایک آدمی سے ملے اور وہ جو حکم دے اس پر عمل کرے اس آدمی کی پہچان یہ ہوگی کہ وہ کالا رومال بائیں جانب کی پتلون کی جیب سے بار بار نکال کر اپنے چہرے پر پھیرے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ گرد کا یہ حکم اُسے ایک آدمی کے توسط سے ملا ہے۔ اور یہ کہ گرد خود کسی کے سامنے نہیں آتا۔ پہلا آدمی گرد کے ٹھاٹ باٹ پر بڑا رشک کر رہا تھا۔ دوسرے شخص نے اسے خرچ کے لئے روپے بھی نکال کر دیئے۔ اسی دوران روی جلدی سے نکل کر باہر گیا تاکہ وہ اس کا چہرہ دیکھ سکے پہلے تو وہی آدمی نکلا جس کا وہ تعاقب کرتا ہوا آیا تھا۔ دوسرا لمبا تڑنگا شخص تھا۔ جس نے روی کو کوٹھی کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ دونوں باہر نکل کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر علیحدہ ہوگئے۔ روی نے سوچا کہ تعاقب کرنا فضول ہے۔ پولیس کو اطلاع دے دینی چاہئے۔

پولیس انسپکٹر نے کہا شکل تو یہ ہے کہ اس گرد کے کسی آدمی کو پوری بات معلوم نہیں ہم اگر ان کے کسی آدمی کو گرفتار بھی کرلیں تو وہ ہمیں کوئی بات نہیں بتا سکتا۔ انسپکٹر نے کہا کہ مجھے مجسمہ نمبر ۱ کے گرد کو پکڑنے کے لئے روی کی مدد کی ضرورت ہے۔ روی نے انسپکٹر سے کہا کہ وہ اس کام کے لئے بالکل تیار ہے۔ دوسرے دن صبح انسپکٹر نے روی کو اسکا کام سمجھایا۔ روی ایک پالش والے کے بھیس میں گاندھی گارڈن میں داخل ہوا۔ روی پالش کروانے والوں کو کسی نہ کسی طرح ٹالتا رہا۔ اُس کو کالے رومال والا شخص نظر نہیں آیا تھا کہ اچانک اُس نے دیکھا کہ فوارے کے پاس ایک آدمی نے اپنی پتلون کی بائیں جیب سے کالا رومال نکالا اور چہرے پر پھیر کر پسینہ پونچھنے لگا۔ روی کے دل کی کلی کھل گئی

وہ بڑی ہوشیاری سے اس آدمی کی حرکتیں دیکھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ایک مُحنّا سا آدمی اس کی طرف بڑھا۔ روی کو پتہ چل گیا کہ چھوٹے قد والا یہ آدمی اکبر ہے۔ روی نے اپنی صندوقچی اٹھائی اور برش کو لہراتا ہوا بوٹ پالش کی آواز لگانے لگا اور ان دونوں آدمیوں کے پاس پہنچ کر پالش کرنے کے لئے کہنے لگا۔ آخر کار چھوٹے قد والا آدمی پالش کروانے پر تیار ہوگیا۔ روی دونوں آدمیوں کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا کہ ان کی آواز صاف سنائی دینے لگی۔

مونچھوں والے آدمی نے چھوٹے قد والے کو بتایا کہ کل تم کو ریل کا سفر کرنا ہے تم حیدرآباد کا ٹکٹ خرید کر کراچی ایکسپریس میں سوار ہو جانا گے راستے میں جس اسٹیشن پر بھی تم کو نیلی پگڑی والا آدمی کالے رومال سے چہرہ صاف کرتا ملے گا۔ تم وہیں اُتر جانا۔ پھر اُس نے اشارہ بتایا۔ اس آدمی کے پاس ایک صندوق ہوگا تم گاڑی سے اُتر کر اس آدمی کے ساتھ ہی پلیٹ فارم پر بیٹھ جانا پھر واپس کراچی آنے والی گاڑی میں اس کے ساتھ سوار ہو جانا اگلے اسٹیشن پر وہ اُتر جائے گا۔ اس کے بعد تم کو صندوق کراچی لانا ہوگا۔ پھر چھوٹے قد والے آدمی نے اُس سے پیسے مانگے اتنے میں روی نے بھی اپنا کام ختم کرلیا تھا۔ چھوٹے قد والے آدمی نے روی سے دوبارہ جوتا پہنانے کو کہا روی نے انکار کردیا اُس نے روی کو پیسے دینے سے انکار کردیا۔ روی نے کہا کہ ہم پیسے کا لالچی نہیں ہے اور یہ کہہ کر پالش کی ڈبیہ اور برش سنبھال کر آگے بڑھ گیا

روی جب گھر میں داخل ہوا تو اس کی امی نے اُس کو بالکل ہی نہیں پہچانا۔ روی نہا دھو کر دوبارہ پولیس اسٹیشن پہنچا انسپکٹر صاحب روی کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے روی کی تعریف کی روی نے سارا قصہ انسپکٹر صاحب کو سنایا۔ انسپکٹر صاحب نے روی کو گھر بھیجا اور شام کو اس سے ملنے آئے انہوں نے بتایا کہ وہ چھوٹے قد والے اکبر کے گھر کا پتہ چلانے میں کامیاب ہوگئے ہیں لیکن کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ انسپکٹر صاحب نے روی کے ابّا سے کہا کہ آپ روی کو ایک بہت بڑی مہم پر جانے کی اجازت دیجئے۔ روی کے ابّا نے اجازت دیدی۔ انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ روی کراچی ایکسپریس میں سفر کرے گا جس اسٹیشن پر اکبر اترے اس پر یہ بھی اتر جائے گا۔ انسپکٹر صاحب نے روی کو دوسرے دن صبح بلایا۔

رومی دوسرے دن انسپکٹر صاحب کے ساتھ پلیٹ فارم پر چلا جا رہا تھا اس نے خاکی رنگ کی میلی سی نیکر اور سفید قمیض پہن رکھی تھی اس کا حلیہ ٹھنڈی پتلیں پینے والوں جیسا تھا انسپکٹر صاحب نے رومی کو ٹھیکیدار کے حوالے کیا۔ رومی کی دوسرے سوڈالیمن پینے والے لڑکوں سے ایک جھڑپ بھی ہوئی گاڑی چلنے والی تھی رومی آخری ڈبے میں گھس گیا۔ اور سوڈالیمن بارف کی آواز لگائی رومی کے ساتھ سادہ لباس میں پولیس والے بھی تھے۔

آخری ڈبے میں چھوٹے قد والا اکبر نہیں تھا اسی طرح تلاش کرتے کرتے رومی کو ایک ڈبے میں اکبر مل گیا وہ اسی ڈبے میں بیٹھ گیا۔ رومی نے باہر جھانک کر دیکھا جنگ شاہی کے اسٹیشن پر ایک دیہاتی نیلی پگڑی پہنے ہوئے ایک درخت کے نیچے کھڑا تھا پاس ہی ایک کالے رنگ کا بڑا سا صندوق تھا اس دیہاتی نے جیب سے کالا رومال نکالا اور چہرے پر پھیرنے لگا۔ دمی جلدی سے نیچے اتر گیا اور اکبر سے پہلے دیہاتی کے پاس ایک بنچ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اکبر دیہاتی کے قریب سے گذرا اور اس نے اپنے آپ سے بات کرنے کے انداز میں کہا گرو! بڑا پروا دیہاتی نے کالا رومال اپنی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا' مالم پُروا'۔

اکبر اور دیہاتی آپس میں باتیں کرنے لگے۔ رومی پہلے سے بیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ پھر اپنا منہ تیز جھاڑ کے گانا گانے لگا اکبر نے اُس کو بھگانا چاہا لیکن رومی ضد بھی کر درخواست کی دیہاتی کو رحم آگیا۔ اُس نے اس کو وہیں بیٹھنے کی اجازت دے دی۔ پھر اکبر نے رومی سے بوتل مانگی۔ رومی نے دو بوتلیں نکال کر دیں اور ان کی باتیں غور سے سننے لگا۔ وہ گروکے اور صندوق کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اکبر نے دیہاتی کو پیسے دیئے اور دیہاتی نے اکبر کو اپنا کراچی کا ٹکٹ دیا

پھر کراچی جانے والی گاڑی میں دیہاتی اور اکبر بیٹھ گئے۔ رومی کو دوسرے ڈبے میں جگہ ملی پھر وہ پانی والے ڈبے میں بیٹھ گیا لڑکوں نے اُس کا مذاق اڑایا اور کہتے رہے کہ آنے دے بیٹا کراچی آنے دے اور رومی بھی دل ہی دل میں کہہ رہا تھا کراچی میں کیا کیا ہوتا ہے۔ دیکھ لیں گے۔

گاڑی کراچی ریلوے اسٹیشن کی حدود میں داخل ہو گئی تھی رومی کی نگاہیں انسپکٹر صاحب کو تلاش کر رہی تھیں وہ دو تولوں کا کریٹ چھوڑ کر جا گا۔ انسپکٹر صاحب کی طرف پہنچا تو انہوں نے کوئی توجہ نہیں دی رومی بات سمجھ گیا اور وہ ان کے ساتھ کھڑے ہو کر دوسرا طرف صندوق کے ساتھ سانے لگا۔ رومی نے اکبر کو دیکھا کہ وہ صندوق پلیٹ فارم پر رکھ کر ادھر اُدھر دیکھ رہا ہے انسپکٹر صاحب سے رومی نے کہا بھی آدمی ہے اسے گرفتار کر لیجئے انسپکٹر صاحب نے کہا کہ اصل مجرم تو ان کا گرو ہے۔ تم اکبر کے ساتھ رہو جب اس کو نیلی کار والا آدمی لینے آئے تو تم اس کے ساتھ رہو۔ رومی نے دیکھا کہ اکبر مسکراتا ہوا قلی کے سر پر صندوق رکھوا رہا ہے اور اسٹیشن سے باہر نکل رہا ہے۔ رومی کو اس کی مسکراہٹ زہر لگی اس نے دل میں سوچا موٹے گرو کے ساتھ جب چیل کی ہوا کھائے گا پھر اس سے کہوں گا۔ ذرا اب ہنس کے دکھا۔ اب آگے پڑھیئے

ریلوے اسٹیشن کے باہر والے اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے ہو کر رومی نے ایک نظر دوڑائی۔

کتنی ہی کاریں، ٹیکسیاں اور رکشے ایک قطار میں کھڑے تھے مسافر ٹیکسیوں میں اپنا سامان لاد رہے تھے۔ رکشوں میں بیٹھ رہے تھے کچھ قلیوں کی مزدوری چکا رہے تھے۔ رومی کو نیلے رنگ کی کار کی تلاش تھی۔ لیکن یہ دیکھ کر وہ کچھ دیر کو سٹپٹا سا گیا کہ قطار میں ایک کی بجائے نیلے رنگ کی تین گاڑیاں کھڑی تھیں۔

شاید یہی دیکھ کر اکبر کے بھی قدم رُک گئے جو رومی سے کچھ دیر پہلے ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلا تھا۔ اس نے قلی کو رُکنے کے لئے کہا۔ اور پریشان سا ہو کر کاروں کی طرف دیکھنے لگا۔

تینوں کاروں کے پاس ایک ایک آدمی کھڑا تھا۔

رومی نے سوچا اصلی کار کا پتہ اس وقت چلے گا۔ جب دو نیلی کاریں چلی جائیں گی۔ اور یہی انتظار اکبر کو بھی تھا قلی نے کچھ دیر پریشان ہونے کے بعد صندوق سر سے اُتار کر زمین پر رکھ دیا۔

تھوڑی دیر میں ایک آدمی بہت سا سامان قلیوں پر لدوائے ہوئے ایک نیلی کار کے پاس پہنچا۔ کار کے پاس کھڑے ہوئے آدمی نے تیزی سے ڈگی کھولی اور قلیوں کے سر پر صندوق اور بستر وغیرہ اتروا کر اس میں رکھنے لگا۔

رومی نے سوچا۔ "چلو ایک کار کا تو پتہ کٹا۔ اب مقابلہ دو میں رہ گیا ہے۔"

اُس نے اکبر کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی کھِل سا گیا۔ قلی بار بار اُس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ لیکن اکبر کی توجہ تو کاروں کی طرف تھی۔

رومی نے دِل میں دُعا کی یا اللہ! ان کاروں کا فائنل مقابلہ بھی ہو جائے۔ تاکہ میدان میں کُودوں اپنا کام کروں اور پھر گھر جا کر کھانا کھاؤں۔

رومی نے اپنے دماغ میں سارا منصوبہ بنا لیا تھا اب وہ اس وقت کا انتظار کر رہا تھا۔ جب صرف ایک نیلی کار رہ جائے گی۔ اور اکبر اُس میں صندوق رکھوانے کے لئے آگے بڑھے گا۔

ریلوے سٹیشن کے باہر اب انسانوں اور موٹروں کا رش ختم ہو رہا تھا اور نیلی کار کی طرف ایک بڑے میاں اور ایک بڑی بی بہت سے بچے اور دو قلی بڑھ رہے تھے۔

بڑے میاں نے جب قلیوں کو سامان اُتارنے کا اشارہ کیا تو اکبر نے اپنے قلی کو صندوق اٹھانے کا اشارہ کیا۔ صندوق سر پر رکھوانے میں اس کی مدد کی اور اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کر کے تیزی سے اس نیلی کار کی طرف چل پڑا جس کے باہر کھڑا ہوا آدمی دُھوپ اور انتظار سے پریشان ہو رہا تھا۔

کار ریلوے سٹیشن کی حدوں سے باہر نکلی تو رومی نے منہ ٹیڑھا کر کے بھولپن سے ایک فلمی گانا گانا شروع کر دیا سامنے دیکھنے کے بجائے وہ کھڑکی کی طرف مُنہ کر کے بیٹھا ہوا تھا۔

اکبر اور دوسرا آدمی تھوڑی دیر تو اُس کا گانا سُنتے رہے پھر اُس آدمی نے اسے ڈانٹ دیا۔

رومی چپکا ہو کر کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

گاڑی ذرا اور آگے بڑھی تو وہ آدمی بولا۔ "بھائی اکبر"

میں تمہارے لئے ایک خوشخبری بھی لایا ہوں۔" اکبر نے خوش ہو کر کہا۔

"کیا کچھ مال وال لائے ہو۔" وہی آدمی بولا۔

"مال تو نہیں لایا۔" "لیکن مال کی خبر لایا ہوں؛"

"اب تمہیں خود گرو اپنے ہاتھ سے مال دیا کریں گے۔"

کار والے آدمی کی نظریں سامنے سڑک پر تھیں اور وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہا تھا۔

"آج جو تم نے مال یہاں پہنچایا ہے اس سے تمہارا عہدہ بڑھ گیا ہے۔"

"اب تمہاری ڈیوٹی مال لانے کی ہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ملک کے باہر سے جو سامان آئے گا۔

"اسے بھی تم ہی ٹھکانے لگایا کرو گے۔"

اکبر نے خوش ہو کر کار والے آدمی کا کندھا دبایا۔

"بھائی اس بات پر تو میں تمہیں چائے پلاؤں گا۔"

تھوڑی دیر دونوں چپ رہے۔ پھر دوسرا آدمی بولا۔

"کل ٹھیک بارہ بجے تم فریئر گارڈن پہنچ جانا" وہاں جنوب کی طرف کے آخری کونے میں پام کے درخت کے نیچے ایک آدمی بیٹھا ہو گا۔ اس کے کپڑے سفید ہوں گے۔

لیکن ہاتھ میں سبز رنگ کا ہیٹ ہو گا۔

"وہ آدمی تم کو گرو کے سامنے پیشی کا وقت اور جگہ بتائے گا۔"

اکبر بولا؟ "اس پیشی میں کیا ہو گا۔"

"بتا دیا نا تم کو!"

"آگے کے لئے ڈیوٹی بھی بتایا جائے گا اور پیسہ بھی ملے گا۔"

اکبر خوش ہو کر بولا۔ "اچھا اچھا"

اکبر نے اس آدمی کے پاس پہنچ کر ہاتھ ملایا۔ اتنے میں قلی بھی پہنچ گیا اکبر نے اس کے سر سے صندوق اتروایا۔ اور دوسرا آدمی کار کے پیچھے کی طرف جا کر ڈگی کھولنے لگا۔

رومی نے آہستہ آہستہ کار کی طرف چلنا شروع کیا اور جس وقت کار والا آدمی قلی کو پیسے دے رہا تھا۔

رومی کار کے پاس پہنچ گیا۔ بڑی زور سے ہنس کر بولا۔

"سیٹھ ہمارا چھٹی ہو گیا۔"

اکبر نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

رومی نے اپنی قمیض کے کاج میں ڈوری کے ساتھ بندھی ہوئی بوتل کھولنے کی چابی دکھا کر کہا۔ "سیٹھ"! ہم نے تم کو بوتل پلایا تھا نا۔

اکبر نے کہا "تو کیا مفت پلایا تھا۔ پیسے نہیں لئے تھے۔"

رومی نے پھر پاگلوں کے سے انداز میں کہا۔ "پیسے لئے تھے سیٹھ"

"پر وہ تو ہمارے سیٹھ نے لے لئے اب ہم صدر تک تمہارے ساتھ جائے گا۔ بیٹھ جائے ہم بھی؟

دوسرے آدمی نے ناگواری سے رومی کی طرف دیکھا اور اکبر سے بولا۔ "یہ کیا مصیبت ہے؟"

اکبر بولا۔ "یار یہ لڑکا مست قلندر ہے، ریل میں سوڈا لیمن بیچتا ہے!"

وہ آدمی پھر بولا۔ "تو دفعہ کرو اسے"

رومی بولا "سیٹھ ہم کو صدر پر دفعہ کرنا۔ ابھی کار میں بٹھالو۔"

اکبر نے پیسے نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔

"لے مجھ سے پیسے لے اور بس میں چلا جا۔"

"نہیں! ہم کسی سے پیسہ نہیں لیتا۔ ہماری ماں مارے گی۔" رومی پیچھے ہٹ گیا۔

اکبر نے کار والے آدمی سے کہا "یار اِسے بٹھا ہی لو۔ صدر پر اتار دیں گے۔"

وہ آدمی بولا۔ لیکن اکبر بھائی تمہیں معلوم ہے۔ "گرو کا آرڈر کیا ہے۔"

"لیکن یار یہ بھی تو مست قلندر ہے اس کے مُنہ سے بددعا نکل گئی تو کہیں معاملہ خراب نہ ہو جائے۔"

یہ سن کر کار والا آدمی خاموش ہو گیا۔ دروازہ کھول کر کار کے اندر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اچھا پھر بٹھالو اس کو بھی۔"

اکبر نے پیچھے والا دروازہ کھولا اور رومی کو بٹھا کر اسے بند کر دیا۔

اگلا دروازہ کھول کر اکبر اُس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اور کار چل دی۔

کار والے نے گاڑی آہستہ کی اور بولا۔ "ہاں اب بتاؤ کس جگہ اُتاروں۔"

اکبر نے کہا: بس ایمپریس مارکیٹ کے پاس اتار دینا۔"

"اور اس مصیبت کو کہاں اُتاروں"۔

اُس کا اشارہ رومی کی طرف تھا۔

"اس کو یہیں اُتار دو۔" کار والے آدمی نے کار سڑک کے کنارے کر کے روک لی اور رومی سے کہا۔

"چل بھئی قلندر اُتر جا۔ دیکھ کر اترنا۔"

رومی نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ کار سے باہر نکل کر دروازہ پھر بند کر دیا۔

رومی فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا نیلی کار ٹریفک کے سمندر میں کھو گئی۔

اور پھر ایک سفید رنگ کی کار اُس کے پاس آکر کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر انسپکٹر صاحب بیٹھے ہوئے تھے "آؤ بیٹے" کہہ کر وہ پیچھے کی طرف مڑے اور اندر سے دروازے کو کھول دیا۔"

رومی جلدی سے کار میں بیٹھ گیا۔

اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ باہر سے کوئی بھی اُسے نہ دیکھ سکتا تھا۔

انسپکٹر صاحب بولے "کیوں بیٹے کچھ کامیابی ہوئی؟"

"جی ہاں"

"ماشاءاللہ۔ چلو پولیس اسٹیشن پہنچ کر سب باتیں بتانا۔"

رومی کا اصل کام ختم ہو چکا تھا۔ اور بھوک پھر اُبھر آئی تھی۔

پولیس اسٹیشن جانے کا مطلب یہ تھا کہ ایک اور گھنٹہ تک بھوکا رہنا پڑے گا۔ رومی نے کچھ سوچ کر انسپکٹر صاحب سے کہا۔

"آپ مجھے گھر پر اتار دیجئے۔"

کھانا وغیرہ کھانے کے بعد میں پولیس اسٹیشن آکر آپ کو ساری بات بتا دوں گا۔"

انسپکٹر صاحب نے کہا "کھانا تم ہمارے ہاں کھا لینا بیٹے۔"

جی نہیں شکریہ!"

امی بھی کچھ فکرمند ہوں گی۔ میں جلد از جلد آپ کے پاس آنے کی کوشش کروں گا۔"

بہت اچھا کہہ کر انسپکٹر صاحب نے ڈرائیور کو رومی کے گھر کی طرف چلنے کو کہا۔"

اور رومی سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

پھر کیا ہوا۔ ——————— یہ آئندہ ماہ پڑھیے۔

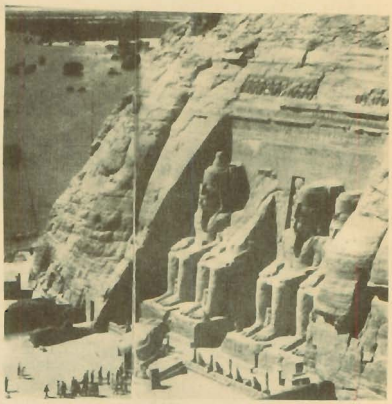


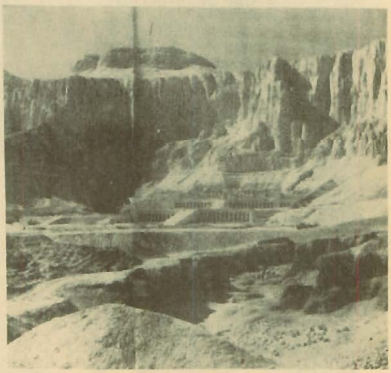
میں نیل ہوں

دریائے نیل کی کہانی، اُسی کی زبانی

سیّد ابُو احمد عاکف







میں قدرت کا ایک عظیم کرشمہ ہوں۔ میں نبی نوع انسان کی اس دنیا میں آمد سے بھی زیادہ پرانا ہوں۔ میں انسانوں کی سب سے قدیم تہذیب کا نہ صرف ایک زندہ گواہ ہوں بلکہ اس تہذیب کے معرض وجود میں آنے کی اصل وجہ۔ میں انسانوں کی کارآمد ترین ایجادوں کی طرح کارآمد ہوں۔ میں دنیا کے ایک وسیع علاقے کو زندگی بخشتا ہوں۔ میں دنیا کا سب سے لمبا اور تاریخی دریا ہوں، میں عظیم ہوں۔ میں حسین ہوں۔ میں نیل ہوں۔

افریقہ کے پراسرار براعظم کے دل سے نکل کر میں خط استوا کی سے لے کر بحیرہ روم تک نو ملکوں میں کروڑوں انسانوں کے لئے زندگی کا سامان پیدا کرتا ہوں۔ زرخیز مٹی اور آبی غذاؤں سے بھرپور میرا پانی ان کے لئے خونِ جگر کی طرح اہم ہے۔ میری ہی وجہ سے ان لوگوں نے سات ہزار سال قبل میرے کناروں پر ایک عظیم تہذیب کی بنیاد ڈالی اور یوں وہ روزمرہ کی زندہ رہنے کی جدوجہد سے آزاد ہو کر فنون اور علوم، مذہب اور شہنشاہیت، تعمیر و انتظامِ مملکت کے ایسے عظیم کارنامے انجام دینے لگے جنہیں آج بھی دنیا حیرت کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ میرے سیلابی اور خشک مہینوں کا حساب رکھ کر زرعی فائدہ اٹھانے کے لئے ان لوگوں نے ۴۲۹۱ قبل مسیح میں دنیا کی پہلی تقویم (دنوں کا حساب رکھنے کا طریقہ یا کیلنڈر) ایجاد کی جس نے سال کو ۳۶۵ دنوں میں تقسیم کیا۔ میرے پانی سے کاشت کئے گئے کھیتوں کی پیمائش اور میرے پانی کو استعمال کرنے کے لئے نہروں کی تعمیر کے لئے انہوں نے ریاضی، جیومیٹری کے وہ اصول دریافت کئے جو آج بھی طالب علم اسکولوں میں سیکھتے ہیں۔

میری تمام تر عظمت اور اہمیت کے باوجود لوگ ہزاروں سال تک میرے مقامِ آغاز کو ڈھونڈ نکالنے اور میری پوری ۴۱۴۵ میل لمبائی پر سفر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ کارنامہ صرف پچھلی اور موجودہ صدیوں میں مشہور مہم جو سیاحوں نے انجام دیا۔ انہوں نے نہ صرف یہ ثابت کیا کہ میں ایک دو سرے سے بہت جدا و مختلف مقامات سے شروع ہوتا ہوں بلکہ یہ کہ مصر کا مشہور نیل اصل میں دو الگ الگ اور مختلف مزاجوں کے دریاؤں کے ملنے سے وجود میں آتا ہے۔ یہ ہیں میری زیادہ لمبی شاخ وہائٹ یا سفید نیل اور چھوٹی شاخ بلو یا نیلا نیل۔

میری "سفید" شاخ وسطی افریقہ کے ملک برنڈی کے جنوبی پہاڑی سلسلے میں سطح سمندر سے ۸۶۰۰ فٹ اونچائی پر شروع ہوتی ہے۔ پہاڑوں سے نیچے آنے کے بعد میں تنزانیہ، یوگنڈا، اور کینیا کے درمیان واقع بڑی جھیل وکٹوریہ میں پہلے داخل ہوتا ہوں اور پھر جھیل کے شمالی ساحل پر جنجا نامی شہر کے ساتھ یوگنڈا میں داخل ہو جاتا ہوں۔ ۱۸۶۲ء میں انگریز مہم جو سیاح سپیک نے اس مقام کو میرا نقطۂ آغاز قرار دیا تھا اور یہ بات ۱۹۲۷ء میں اس وقت تک تسلیم کی جاتی رہی جب تک ڈاکٹر بوخارٹ نامی جرمن مہم جو نے برنڈی میں میرے اصل مقامِ آغاز کی نشاندہی نہیں کی۔

یوگنڈا میں میرے داخلے کے مقام پر میرے پانی سے بجلی بنانے کا ایک عظیم بند تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ ہے۔ اوون فالز (آبشار اوون) بند جو نہ صرف یوگنڈا کی تقریباً تمام بجلی کی ضروریات پوری کرتا ہے بلکہ ہمسایہ ملک کینیا کو بھی بجلی مہیا کرتا ہے۔ اس مقام سے کوئی سو میل تک میں سرسبز جنگلوں میں عمودی چٹانوں کے درمیان سے شمال کی جانب سفر کرتا ہوا کائی اور گھاس سے اٹی ہوئی جھیل کیوگا میں جا گرتا ہوں۔ یہاں سے میرا رُخ پہلے شمال اور پھر مغرب کی طرف رہتا ہے اور گزرگاہ چٹانوں کے درمیان ہی رہتی ہے۔ جھیل کیوگا سے ڈیڑھ سو میل کے فاصلے پر میں انتہائی زور و شور کے ساتھ مرکی سن آبشار کے صرف ۴۰ فٹ چوڑے دہانے سے ۱۲۰ فٹ سے جھیل البرٹ میں گرتا ہوں۔ میرے اس حصّے کو جو جھیل وکٹوریہ اور جھیل البرٹ (جن کے نام برطانیہ کی مشہور ترین ملکہ اور ان کے خاوند کے نام پر رکھے گئے ہیں) کے درمیان ہے اسے وکٹوریہ نیل کہتے ہیں۔ یوگنڈا اور زائیر کے درمیان واقع جھیل البرٹ میں داخلے کے مقام سے کچھ ہی دور میں ایک بار پھر شمال کی جانب اپنا سفر جاری کرتا ہوں۔ اور اس بار البرٹ نیل کے نام سے پکارا جاتا ہوں۔ جھیل البرٹ سے لے کر یوگنڈا، سوڈان، سرحد تک کے دو سو میل لمبے ٹکڑے میں پھر جنگلوں کے درمیان ہلکے ہلکے چوڑی ہوتی ہوئی وادی سے گزرتا ہوں۔ سوڈان کی سرحد عبور کر کے میرا نام سفید نیل پڑ جاتا ہے اور یوں میں اس ملک میں شمال کی جانب سوڈان کے دارالحکومت خرطوم تک ڈیڑھ ہزار میل کا سفر کرتا ہوں۔ جنوبی سوڈان میں میرا پانی سینکڑوں چھوٹے چھوٹے حصّوں میں بٹ کر گھاس اور پیپرس کے پودوں (جن کے پتّوں کو قدیم مصری کاغذ کے طور پر استعمال کرتے تھے اور جن کے نام سے کاغذ کے لئے انگریزی کا لفظ پیپر آیا ہے) سے ڈھکے ہوئے ایک وسیع و عریض میدان میں بہنے لگتا ہے۔ ساڑھے چار سو میل لمبے کیچڑ اور دلدل کے اس ہموار میدان کو سُدّ کا نام دیا جاتا ہے۔ سُدّ کے کیچڑ میں دریائی گھوڑے اور دنیا کے سب سے بڑے مگرمچھ کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ چونکہ اس علاقے میں پورے سال شدید گرمی پڑتی ہے اس لئے یہاں میرا زیادہ تر پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے۔ میرے پانی میں کچھ اضافہ سُدّ کے شمالی سرے پر دریائے سوبت کے شامل ہونے سے ہوتا ہے جو نیلے نیل کی طرح حبشہ (ایتھوپیا) کے پہاڑی علاقوں سے آ رہا ہوتا ہے۔

سُدّ کے اختتام پر میں پہلے نیم خشک اور پھر سوڈان کے دارالحکومت خرطوم کے قریب ریگستانی علاقے میں بہتا ہوں۔ خرطوم شہر ہی وہ مقام ہے جہاں مجھ میں میرا دوسرا حصّہ یعنی نیلا نیل آ ملتا ہے۔ شہر کے مشرق سے نیلا نیل اور جنوب مغرب سے میں یعنی سفید نیل آ رہا ہوتا ہوں اور یوں خرطوم ہمارے درمیان بننے والے جزیرہ نما میں واقع ہے۔ ساڑھے پانچ لاکھ باشندوں والا قدیم خرطوم رقبے کے لحاظ سے افریقہ کے سب سے بڑے ملک کا صدر مقام ہے۔ مگر خرطوم شہر میری دو بڑی شاخوں کے سنگم پر واقع واحد شہر نہیں ہے۔ نیلے نیل کے دائیں اور

قدیم خرطوم کے مخالف کنارے پر چار لاکھ کی آبادی والا شمالی خرطوم شہر اور سنگم کے عین ساتھ بائیں کنارے پر اُمدرمان نامی شہر ہے جس کی آبادی چھ لاکھ ہے۔ یوں میرے سنگم کے دیدہ زیب علاقے میں کوئی سولہ لاکھ لوگ آباد ہیں۔

میری دونوں شاخوں کے درمیان کا علاقہ جو مقامی طور پر جزیرہ کہلاتا ہے انتہائی زرخیز ہے اور یہاں ہی دنیا بھر میں سوڈان کی مشہور لمبے ریشے والی روئی پیدا ہوتی ہے۔ نیلے نیل پر باندھے ہوئے سنسار بند سے بھی مختلف فصلوں کے لئے پانی مہیا ہوتا ہے۔

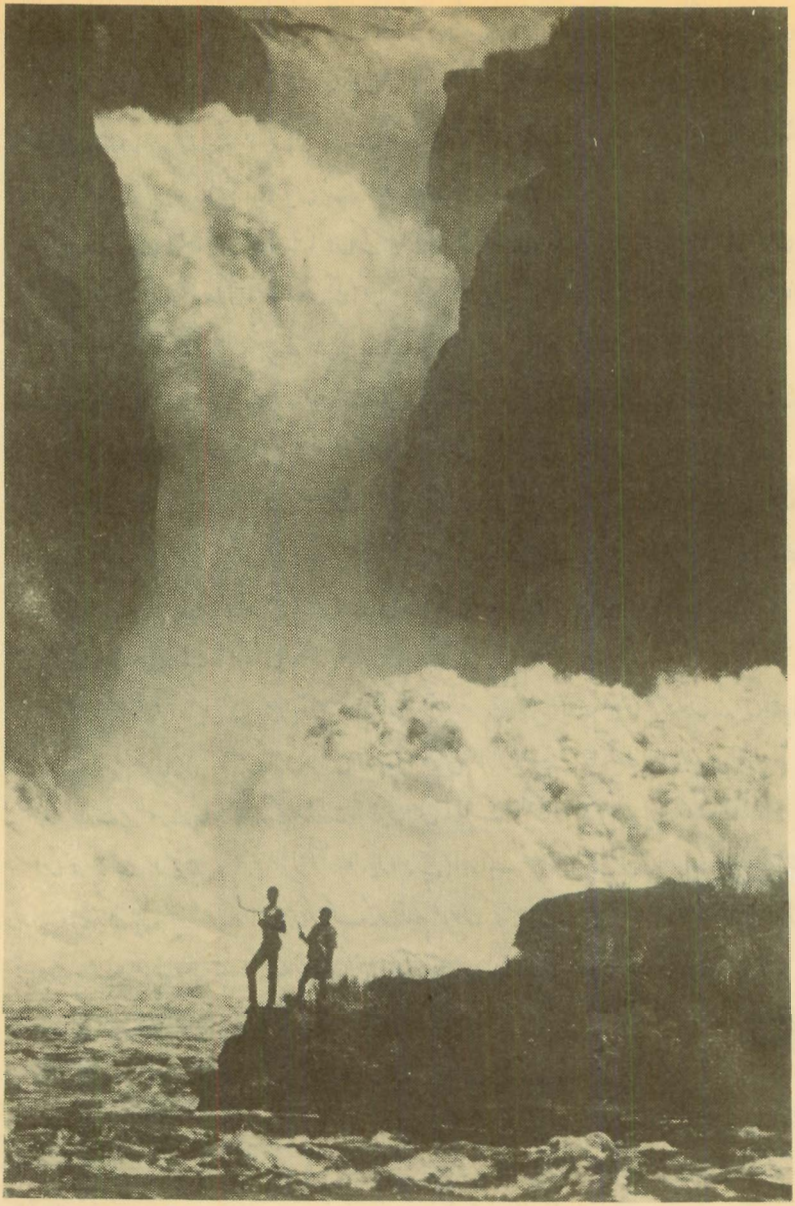
میری دوسری شاخ یعنی بلو نیل ایتھوپیا کے شمال مغربی پہاڑی علاقے میں چھ ہزار فٹ بلندی پر واقع ٹانا جھیل سے نکلتی ہے اور پھر میرا پانی نوراہی کئی سو فٹ بلند ٹینی سات آبشار سے گرتا ہے۔ اس کے بعد چار سو میل تک انتہائی دشوار گزار اور گھنے جنگلوں میں سے ہوتا ہوا چار ہزار فٹ گہری کھائی سے گزرتا ہے۔ یہاں میرے پانی کا شور اور سفید جھاگ سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ گو نیلا نیل لمبائی میں خاصا چھوٹا ہے مگر یہی میری اہم شاخ ہے۔ یکجا ہوئے نیل کے کل پانی کا ساٹھ فیصد حصہ نیلے نیل اور صرف ۲۰ فیصد حصہ سفید نیل کا ہوتا ہے۔ باقی ۱۳ فیصد حصہ ایتھوپیا کے اسی پہاڑی علاقے سے آئے ہوئے دریائے اتبارہ کا ہوتا ہے جو خرطوم سے دو سو میل شمال میں مجھ سے آن ملتا ہے۔ یوں دریائے سوبت کے پانی کو ملا کر نیل کے مجموعی پانی کا اسی فیصد حصہ ایتھوپیا کے پہاڑوں سے اور صرف بیس فیصد وسطی افریقہ سے سفید نیل کی صورت میں آتا ہے۔ اور ہاں نیلا نیل ہی پہاڑوں سے وہ زرخیز مٹی لاتا ہے جس کی وجہ سے مصر کی تہذیب وجود میں آئی اور جس کی وجہ سے مصر کو نیل کے تحفے کا نام دیا گیا۔ نیلے نیل کے کم از کم اور زیادہ سے زیادہ بہاؤ میں چار سو گنا فرق ہے۔ اس کے برخلاف سفید نیل کے پانی میں صرف پانچ یا چھ گنا اضافہ ہوتا ہے اور اس کے پانی میں مٹی بالکل نہیں ہوتی۔

خرطوم شہر میں سنگم کے بعد میں صحیح معنی میں نیل ہو جاتا ہوں اور اس طرح مزید ۱۸۵۰ میل سفر کرتا ہوں۔ مگر شاید یہی سفر میری اصل شہرت کی وجہ ہے۔ شمالی سوڈان اور مصر میں میرا زیادہ تر سفر ریگستانی علاقے میں طے ہوتا ہے اور میں اس لئے بھی منفرد ہوں کہ کوئی اور اتنا بڑا دریا دو بڑے صحراؤں کے درمیان سے نہیں گزرتا

خرطوم سے صرف پچاس میل دور متحدہ نیل کی چھ مشہور آبشاروں میں سے پہلی آبشار ہے۔ یہ آبشاریں جن میں سے پانچ سوڈان میں ہیں۔ اور صرف ایک مصر میں ہے اور آبشاروں کی طرح نہیں ہیں۔ ——— ——— جہاں پانی نسبتاً تنگ جگہ سے بہت نیچے گرتا ہے بلکہ یہ آبشاریں چھوٹی چھوٹی سیڑھیوں کی مانند ہیں جن کے ذریعے میرا پانی پوری چوڑائی میں پتھروں کے اوپر سے سفید جھاگ بن کر ہلکے ہلکے نیچے اترتا ہے۔ اس سے ملتا جلتا منظر تمہاری نہروں کے ہیڈ ورکس پر نظر آتا ہے۔ ان چھ آبشاروں کے ذریعے میرا پانی مجموعی طور پر

۹۲۵ فٹ نیچے آتا ہے۔ ان آبشاروں کے نام نہیں ہیں اور انہیں صرف ایک سے چھ تک شمالاً جنوباً نمبر دیئے گئے ہیں۔ سوہاؤ کے لحاظ سے خرطوم کے سب سے قریب واقع حامد قبصے کے ساتھ آبشار نمبر چھ ہے۔ نمبر چھ آبشار سے نمبر ایک آبشار تک میرا بہاؤ انگریزی کے حرف s کی طرح ہے۔ آبشار چھ اور بربرنامی شہر سے متصل آبشار پانچ کے درمیان دریائے اتبارہ اسی نام کے قصبے پر مجھ میں شامل ہوجاتا ہے۔ کریمہ نامی شہر سے کچھ پہلے آبشار نمبر چار ہے اور آبشاروں کے علاقے میں صرف اس مقام سے آبشار نمبر تین تک کشتی سے سفر ممکن ہے۔ سوڈان اور مصر کی سرحد سے چند میل دور وادی حلفہ نامی شہر کے ساتھ آبشار نمبر دو ہے۔ اس آبشار کے فوراً بعد ہی میں انسان کی بنائی ہوئی دنیا کی سب سے بڑی جھیل جو مصر کے سابق صدر کے نام سے موسوم ہے میں داخل ہوجاتا ہوں۔ یہ جھیل جو اسوان کے مقام پر تعمیر کئے گئے اونچ بند (یہ بند کا نام ہے اور اس لئے رکھا گیا ہے کہ اسی مقام پر ایک نیچا بند ۱۹۰۲ء تعمیر کیا گیا تھا) ۳۱۰ میل لمبی اس جھیل کی تہہ میں قدیم مصر کی نوبیائی ریگستان کی تہذیب کے آثار اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں۔ مگر ہاں اہم آثاروں کو ہزاروں حصوں میں توڑ کر انہیں جھیل کے پانی سے اونچے مقامات پر لے جایا گیا اور پھر وہاں انہیں از سر نو جوڑ کر اصلی حالت میں لے آیا گیا تاکہ آنے والی نسلیں ہمارے ـــــ دور کے لوگوں کو یہ الزام نہ دے سکیں کہ ہم نے قدیم مصر کی ثقافت کے آثار اپنے فائدے کے لئے تباہ کر دیئے پانی سے بچائے گئے آثاروں میں ابوسمبل میں واقع رمیسس دوم کے دیوہیکل مجسمے اور مندر خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان آثار کو اقوام متحدہ کی ثقافتی اور سائنسی تنظیم یونیسکو نے چالیس ملکوں کے تعاون سے چار کروڑ بیس لاکھ ڈالر کے خرچ سے ۱۰۴۸ حصوں میں ان کی اصل جگہ سے ۲۲۵ فٹ اوپر منتقل کر دیا۔ اس کام میں پانچ سال صرف ہوئے۔

اسوان کے نئے اونچے بند کی وجہ سے میرے سالانہ سیلابی پانی اور اس کی تباہ کاریوں کو قابو کیا جا چکا ہے اور ساتھ ساتھ خشک موسم کے لئے پانی کا ذخیرہ بھی موجود رہتا ہے۔ ورنہ بند کی تعمیر سے پہلے میرا پانی ہزارہا سال سے جولائی سے اکتوبر تک ۲۰ فٹ چڑھ کر میری پوری وادی کو ایک بڑی جھیل میں تبدیل کر دیتا۔ گھر اور سڑکیں وغیرہ سب اونچائی پر بنائے جانے کے باوجود خراب ہوجاتے۔ مگر اب یہ سلسلہ بدل گیا ہے اور میرے پانی کو اسوان پر قابو کر لیا جاتا ہے۔ ڈھائی میل لمبے اور ۳۶۴ فٹ اونچے اس بند کا شمار دنیا کے عظیم بندوں میں ہوتا ہے۔ اس کی تعمیر ۱۹۷۰ء میں ڈیڑھ ارب ڈالر کی لاگت سے مکمل ہوئی۔ اس کی بدولت مصر میں مزید ۲۵ لاکھ ایکڑ قابل کاشت بنائے گئے ہیں اور غذا کی پیداوار میں ۳۵ فیصد اضافہ ہوا ہے۔ بند کی وجہ سے اب لوگ میری وادی کی پتلی پٹی (جو زیادہ سے زیادہ پندرہ میل چوڑی ہے) سے نکل کر ریگستانی علاقوں میں آباد ہونا شروع ہو گئے

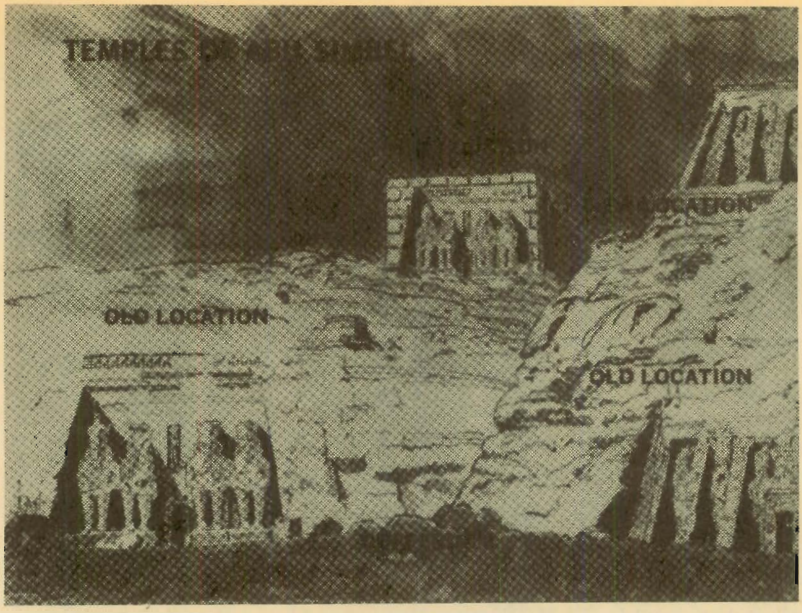


دریائے نیل ایک حسین آبشار کی شکل میں

ہیں۔ یوں میری وادی جو ملک کے رقبے کا صرف ۴ فیصد ہے مگر جس میں ملک کے ۹۵ فیصد لوگ رہتے ہیں اب کم گنجان ہونے لگی ہے۔ اسوان کے بند سے سالانہ آٹھ ارب کلوواٹ بجلی بھی پیدا ہوتی ہے جو ملک کی ۷۰ فیصد ضروریات پوری کرتی ہے اور جس کی بدولت ملک کے تمام تر دیہات (تقریباً ۴۰۰۰) اب اس نعمت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ سچ پوچھیں تو اس بند نے مصر کی قسمت ہی بدل دی ہے۔

بند سے گزرنے کے بعد میں چھ آبشاروں کے سلسلے کی پہلی آبشار سے گرتا ہوں اور پھر فوراً ہی اسوان کے شہر پہنچ جاتا ہوں۔ ڈیڑھ لاکھ باشندوں کے اس شہر کے چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے۔ کہیں گندم تو کہیں گنا اور کھجور تو بکثرت۔ اسوان شہر سے شمال کی جانب قاہرہ اور میرے ڈیلٹا کے دوسرے علاقوں کی طرف جانے کے لئے چپٹے پیندوں والے اسٹیمر (دوخانی کشتیاں) باآسانی دستیاب ہیں۔ ان کے پیندے چپٹے اس لئے ہوتے ہیں کہ مصر کی وادی میں میری گہرائی زیادہ نہیں ہے۔ اگر ان جہازوں میں شمال کی طرف سفر کیا جائے تو دیکھنے والے کو میرے پانی کی تاثیر کا اندازہ ہو سکے گا۔ جہاں پانی کی رسائی ختم ہوتی ہے وہیں سے ریگستان شروع ہو جاتا ہے۔ کناروں پر عورتیں برتن اور کپڑے دھونے میں مصروف، بچے کھیل رہے ہیں اور کچھ لوگ مچھلی پکڑنے میں لگے ہوئے ہیں اور جگہ جگہ کولہو میں بچتے بھینسے پانی کے پہیوں کو چلا رہے ہیں۔ کھجور اور سفیدے کے جھنڈ میں مٹی کے گھر مصر کے ایک عام گاؤں کا منظر بھی بہت پیارا لگتا ہے۔

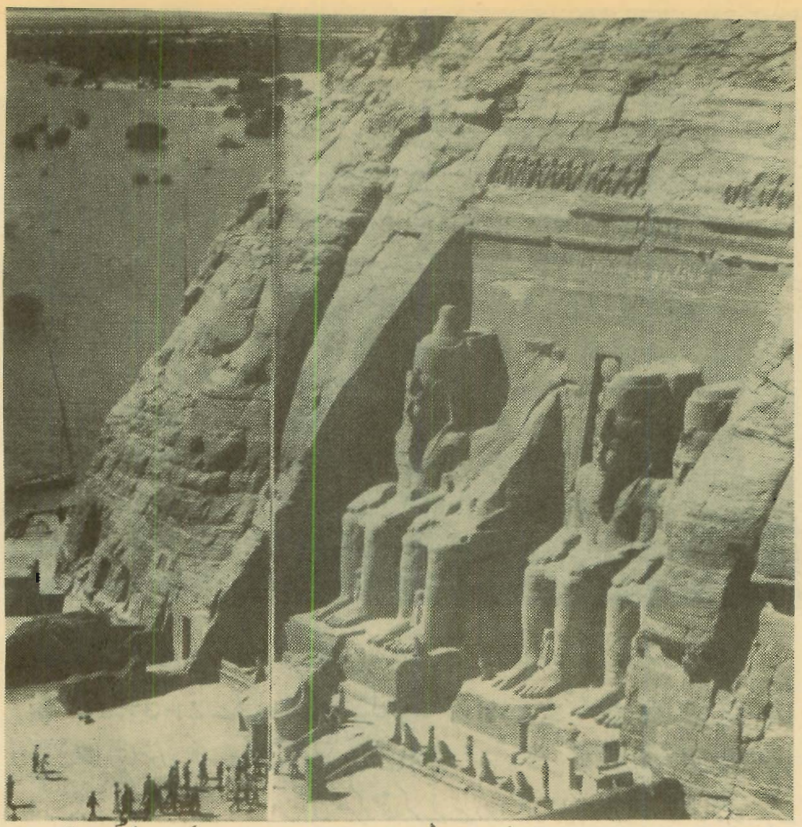
اسوان سے سوا سو میل شمال میں قدیم مصر کا تاریخی شہر لکسر ہے۔ یہیں قدیم مصری فرعونوں نے اپنی درمیانی سلطنت (قدیم مصر کی تین سلطنتیں تھیں۔ پرانی، درمیانی اور نئی) کا دارالحکومت بنایا تھا۔ یہاں میرے دائیں یا مشرقی کنارے پر لکسر کے شاندار مندر کے کھنڈرات آج بھی اس تابناک ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ ایک مندر کے ستون تو ۵۲ فٹ اونچے ہیں (پانچ منزلہ عمارت سے زیادہ اونچے) اور ایک فرعون کے مجسمے کے پاؤں کے ہر ایک ناخن پر آپ بیٹھ سکتے ہیں۔ مگر لکسر کے پاس ہی کرناک میں قدیم مصریوں کے سورج کے دیوتا آمن را کا مندر تو اپنی مثال آپ ہے۔ اس کا پتھر سے تراشا ہوا دروازہ دس منزلہ اونچا اور پچاس فٹ چوڑا ہے۔ لکسر کے سامنے میرے بائیں کنارے پر تھیبس کا قدیم قبرستان ہے۔ یہاں آٹھ سو سے زیادہ مزار پتھر کی چٹانوں میں کاٹ کر بنائے گئے ہیں ان میں سے کم از کم چونسٹھ مصری فرعون بادشاہوں کے ہیں اور اس لئے اس علاقے کو بادشاہوں کی وادی کہا جاتا ہے۔ یہیں ۱۹۳۲ء میں انگریز ماہر آثار قدیمہ کارٹر نے اس صدی کے سب سے اہم آثار قدیمہ کی دریافت کی۔ یہ تھی بادشاہوں طوطان خامن کے مزار کی دریافت جس میں ۱۹ سال کی عمر میں وفات پانے والا بادشاہ اصلی سونے کے تابوت میں ممی (مصالحہ لگا کر جسم محفوظ کرنے کی شکل) کی صورت میں لیٹا تھا۔ مزار میں سونے



کے ۱۷۵۰ فلروف بھی تھے۔ یہ مزار قدیم مصر کے ان چند مزاروں میں سے تھا جو ڈاکوؤں سے محفوظ رہا تھا۔

لکسر کے تاریخی علاقے سے گزر کر میں مغرب کی طرف مڑتا ہوں پھر پہلے شمال مغرب اور اس کے بعد شمال کی طرف بہتا رہتا ہوں۔ لکسر سے کوئی چار سو میل کے فاصلے پر قدیم شہر ممفس کے آثار ہیں۔ ممفس پرانی مصری سلطنت (جو بادشاہ مینس کے شمالی اور جنوبی مصر کو متحد کرنے سے وجود میں آئی) کا دارالحکومت تھا یہیں مصر کے مشہور اہرام واقع ہیں۔ یہ قدیم تہذیبوں کی مشہور ترین آثار ہیں جنہیں دیکھنے دنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔ پانچ ہزار سال قبل تعمیر ہونے والا بادشاہ خوفو کا اہرام ۴۵۰ فٹ بلند ہے اور اس کی تعمیر میں ڈھائی ٹن وزنی ۲۰ لاکھ تراشے ہوئے چوکور پتھر استعمال ہوئے۔ ان پتھروں کو اس بلندی تک پہنچانا آج کی مشینوں سے بھی آسان نہیں اور اس اہرام کی تعمیر ایک لاکھ مزدوروں نے دو سال میں کی۔

ممفس سے صرف ۲۰ میل دور میرے کناروں پر افریقہ کا سب سے بڑا شہر مصر کا دارالحکومت اور دنیائے اسلام کا ایک عظیم اور تاریخی شہر آباد ہے۔ یہ ہے قاہرہ جو ۹۶۹ء میں قائم ہونے والے اس شہر میں بیس عجائب گھر اور کئی خوبصورت مساجد ہیں۔ مگر مسلم علماء کے لئے ہزار سال قدیم دنیا کی سب سے پرانی یونیورسٹی جامعہ ازہر دور میں راہنما بن کر زندہ رہی ہے میرے کناروں پر آباد ہونے کی وجہ سے قاہرہ کے حسن میں چار چاند لگ گئے ہیں کئی



دریائے نیل پر بنے ہوئے فراعین مصر کے مجسمے

جزیرے اور پُل، بلند و بالا عمارتیں اور شام کو پانی پر ڈوبتے ہوئے سورج کا منظر دیکھا تو جا سکتا ہے مگر اس کی دلکشی کو بیان کرنا مشکل ہے۔ پچاس لاکھ لوگوں کا یہ شہر تمام تر میری ہی وجہ سے ہے۔ میں اور قاہرہ ایک دوسرے کے بغیر تصور ہی نہیں کیے جا سکتے۔

قاہرہ سے نکلتے ہی میں اپنے ڈیلٹا میں داخل ہو جاتا ہوں۔ یہاں میری دو بڑی شاخیں ہو جاتی ہیں جو پھر کئی چھوٹی شاخوں میں تقسیم ہو کر سمندر میں جا گرتی ہیں۔ یہ بڑی شاخیں روزیٹا اور ڈامیٹا دریا کہلاتی ہیں۔ اور دونوں قاہرہ سے تقریباً ۱۵۵ میل دور بحیرۂ روم میں مل جاتی ہیں اور یوں میرا طویل سفر ختم ہوتا ہے۔



ویلکم کی

کوپیکس

اینٹی لائس لوشن



جُوئیں ایک بچّے سے دوسرے بچّے اور بڑوں میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ خون چُوستی ہیں اور بچّوں کی ذہنی نشوونما پر اثر انداز ہوتی ہیں :

جوؤں سے موثر نجات کیلئے
کوپیکس اینٹی لائس لوشن

کوپیکس ڈی۔ڈی۔ٹی، بی ایچ سی اور میلاتھیان سے پاک ہے۔

کوپیکس لوشن میں جدید تحقیق پر مبنی کیڑے مار دوا پرمیتھرین شامل ہے جو سر کی جوؤں اور لیکھوں کے خاتمہ کے لئے نہایت موثر ہے۔



Wellcome


فراسٹ
مزہ خود بتاتا ہے
فراسٹ
میں فروٹ زیادہ ہے



گپ شپ

خواجہ عابد نظامی

اک ہیں مسٹر گول مٹول
شہر ہے اُن کا استنبول

نام ہے ان کا بکّے خان
بھائی ہیں اُن کے تکّے خان

وزن ہے ان کا اسّی من
حلوہ کھاتے ہیں اک ٹن

کچّی میں وہ پڑھتے ھیں
دن بھر گپیں گھڑتے ھیں

اے بی سی سب آتی ہے
اردو انہیں کب آتی ہے

ہر دم کھیلتے رہتے ھیں
ڈنٹر پیلتے رہتے ھیں

اچھے خاصے ہاتھی ھیں
سب بچوں کے ساتھی ھیں

بس میں سیریں کرتے ہیں
ٹھنڈی آہیں بھرتے ہیں

بھائی ہیں ان کے تکّے خان
یعنی دبلے پتلے خان

وزن ہے جن کا ڈھائی سیر
کھاتے ہیں بس اک دو سیر

دن بھر پڑھتے رہتے ہیں
آگے بڑھتے رہتے ھیں

قد ہے ان کا بارہ فیٹ
پاؤں میں وہ رکھتے ہیں فلیٹ

کھیلتے ہیں دونوں اک ساتھ
ہاتھوں میں وہ دیکر ہاتھ

جو سمجھے یہ بات مخول
فوراً جائے استنبول

پُرلطف، پُرذائقہ، ٹھنڈے ٹھنڈے مزیدار

ہوئیسٹ®

ڈراپس

گلے کی خراش میں
انتہائی مفید

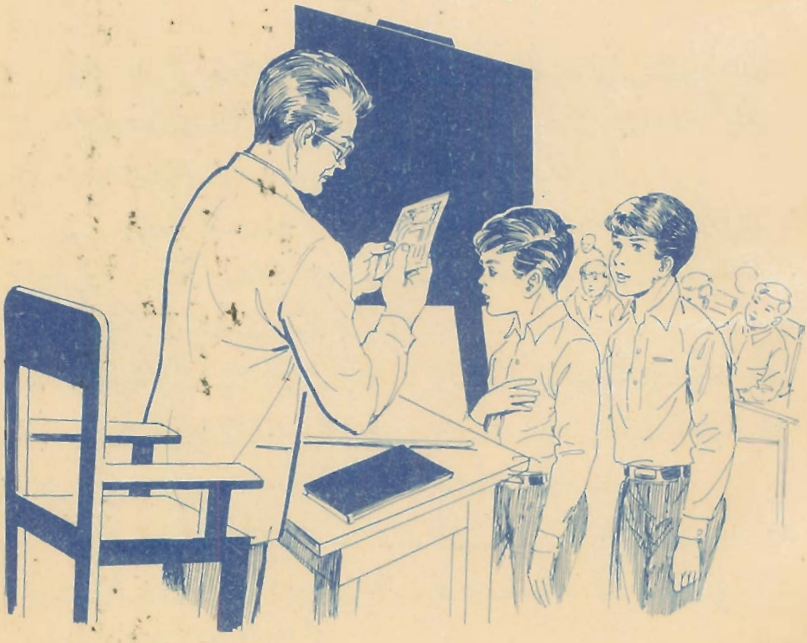


محمد املیٰ خان دلؔ

انجام

کلاس میں آج پھر میرے بستے سے "ٹیکنیکل ڈرائنگ" کی کتاب چوری ہوگئی میرے ساتھ ایسا چوتھی بار ہوا۔ کبھی انگریزی کی کتاب غائب کبھی سائنس کی تو کبھی ریاضی کی۔ اس طرح کتابوں کی مسلسل چوری سے میں تنگ آگیا تھا۔ ابّو کہتے ہیں "کتابیں بڑی مہنگی ملتی ہیں۔ بعض کتابیں تو ملتی بھی نہیں"، اُف میرے خدا میں کیا کروں میں سوچنے لگا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے پہلی بار جب میری انگریزی کی کتاب گم ہوئی تھی تو میں نے کلاس ٹیچر سے



شکایت کی تھی مگر انہوں نے بجائے مناسب تدارک کرنے کے خود مجھے ہی تلقین کی تھی "اپنی کتابوں کی حفاظت کیا کریں۔ کسی پر یوں ہی جھوٹا الزام لگانا ٹھیک نہیں۔"

ان کا یہ رُوکھا سا جواب سُن کر میری دِل شکنی ہوئی تھی اور کتاب چوری کرنے والے کی حوصلہ افزائی میں کفِ افسوس مل کر رہ گیا تھا۔ کرتا بھی کیا۔ چوری کرتے ہوئے بھی تو کسی کو نہیں دیکھا تھا۔ کس کو موردِ الزام ٹھہراتا؟

گھر آکر جب میں نے امّی کو اس واقعہ کی تفصیل بتائی تو انہیں بھی اس بات کا بڑا دکھ ہوا تھا انہوں نے میری ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے جیسے میرے دِل کی کیفیت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ پیار اور ممتا کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے مجھے تسلی دی تھی۔

"بیٹے گھبرانے کی کوئی بات نہیں اگر تمہاری کتاب چوری ہو گئی ہے تو میں تمہیں نئی کتاب منگوا دوں گی" ان کی یہ باتیں سن کر میری تسلی ہو گئی تھی۔ مگر جب ابّو شام کو دفتر سے واپس آئے اور میری چھوٹی بہن مُونا نے چوری کا یہ واقعہ انہیں بتایا تو بغیر سوچے سمجھے پہلے تو انہوں نے میری پٹائی کر دی اور بعد میں جلی کٹی بھی سنائیں۔

"اپنی چیزوں کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ ذمہ داری کا کوئی احساس نہیں۔ پچھلے ہفتے ہی نئی کتابیں خرید کر دی ہیں کھیل سے تو فرصت ہی نہیں ملتی۔ بستہ جہاں پایا پھینک دیا۔" وہ تو امی نے بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ اور کیا کچھ سننا پڑتا۔ ابّو کی تربیت کا یہ انداز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ مگر شاید انہوں نے ٹھیک ہی کیا ہو۔

آج جب پھر میری کتاب چوری ہو گئی تو گذرا ہوا واقعہ میری آنکھوں میں فلم کی طرح گھوم گیا۔ کلاس ٹیچر کا مایوس کُن جواب، امی کی محبت بھری تسلی۔ ابّو کی ڈانٹ یہ سب باتیں میرے ذہن میں خلط ملط ہو گئیں اور میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس بار کسی سے کچھ نہیں کہوں گا۔

مجھے اس بات کا اچھی طرح علم ہو چکا تھا کہ کتابوں کی چوری میں کس کا ہاتھ ہے۔ مگر میرے کسی ساتھی کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ آیا میری کتابیں چوری بھی ہوئی ہیں یا نہیں؟ سبھی کہتے "آخر تمہاری ہی کتابیں چوری کیوں ہوتی ہیں؟ کسی اور کی کیوں نہیں ہوتیں؟ یہ جھوٹ ہے الزام ہے۔"

گویا میں ہی جھوٹا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں بھی سوچ میں پڑ جاتا۔ بات تو صحیح ہے آخر میری ہی کتابیں کیوں چوری ہوتی ہیں؟ شاید میری شرافت سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ میں نہ جانے کن کن خیالات میں گم رہنے لگا۔

کتابوں کی چوری کا چوتھا واقعہ پیش آیا تو مجھے بڑا غصہ آیا۔ آج فیصلہ ہو ہی جائے گا، کلاس کے باہر جا کر اس کی خوب اچھی طرح مرمت کروں گا، اس کے دانت توڑ دوں گا، ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا میں قدرے جذباتی ہو گیا۔ پھر اچانک میری سوچ میں تبدیلی آگئی یہ طریقہ ٹھیک نہیں، اسے ایک موقع اور دینا چاہیئے، اور یہی سوچ کر اس بار بھی میں نے وہی شرافت کا راستہ اختیار کیا اور بڑے حوصلے سے کلاس ٹیچر سے شکایت کی کہ راشد نے میری کتاب چرائی ہے، مگر میری بدقسمتی کہ اس بار بھی مجھے شرمندگی اٹھانا پڑی، کیونکہ تلاشی لینے پر اس کے بستے سے کتاب ہی برآمد نہیں ہوئی۔ نہ جانے کہاں چھپا دی تھی اس نے، ٹیچر نے مجھے سخت سزا دی۔

اس واقعہ کو گذرے ہوئے اگرچہ کئی ہفتے ہو چکے تھے مگر میرے ذہن میں اس کی تازگی ہنوز برقرار تھی۔ میں اس اُدھیڑ بن میں مبتلا تھا کہ اس کی کیا ترکیب کی جائے؟

کئی دِنوں کے بعد آج جب کلاس میں داخل ہوا تو مجھے ایسا محسوس ہوا کہ آج کامیابی میرا قدم چومے گی۔ پھر مجھے کتنی خوشی ہوگی! میرا دل ابھی سے آنے والے اس خوش کُن لمحے کی بے پناہ لذّت محسوس کر رہا تھا۔ آج پھر میں حسبِ معمول راشد کے برابر والی نشست پر بیٹھا، ابھی کلاس ٹیچر کلاس میں نہیں آئے تھے پہلا گھنٹہ بج چکا تھا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنا بستہ وہیں چھوڑ کر اُٹھا اور کلاس سے باہر برآمدے میں چلا آیا اور راشد کی نظروں سے اوجھل ہو کر ساتھ کی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا، راشد کو اس بات کا ذرا بھی گمان نہ ہوا کہ میں اُسے دیکھ رہا ہوں۔ موقع پاتے ہی اس نے اپنا کام تمام کر لیا اتنے میں کلاس ٹیچر بھی حاضری رجسٹر لے کر آتے دکھائی دیئے اور میں بھاگ کر اپنی نشست پر جا بیٹھا۔ جب ہماری حاضری لے لی گئی تو میں اپنی نشست سے اٹھا اور سیدھا کلاس ٹیچر کے پاس گیا اور چپکے سے انہیں پوری تفصیل بتا دی خدا کا شکر کہ اس بار انہوں نے غور سے سنا اور مثبت رویّہ اختیار کیا۔

انہوں نے راشد کو آواز دی، پوری کلاس میں خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے طوفان آنے سے پہلے فضا میں سکوت طاری ہو جاتا ہے۔ سب کی نگاہیں راشد کی طرف مرکوز تھیں۔

"تم نے خالد کے بستے سے ....." ابھی وہ پورا جملہ ادا بھی نہیں کر پائے تھے کہ درمیان میں ہی وہ بول اٹھا۔

"سر! وہ جھوٹ بولتا ہے۔ پھر مجھ پر چوری کا الزام لگا رہا ہے۔ سر! یہ غلط ہے۔ خالد بکواس کرتا ہے،" اِس نے ڈھٹائی سے جواب دیا اور آنکھیں لال پیلی کرتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ جیسے مجھے کھا جائے گا۔

سارے لڑکے دم بخود بیٹھے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ادھر آؤ! کلاس ٹیچر نے راشد کو ڈانٹ کر اپنی طرف بلایا۔ وہ سٹپٹاتا ہوا بوجھل قدموں سے ان کی طرف گیا "سر میرا بستہ دیکھ لیا جائے میں نے خالد کی کتاب نہیں چرائی ہے" اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "یہ کیا ہے؟" ٹیچر نے اس کی جیب سے دس کا نوٹ نکالتے ہوئے غصّہ سے پوچھا۔

"سر! میری امّی نے مجھے یہ نوٹ دیا تھا کہ میں اسکول سے واپسی پر ان کے لئے دوا لیتا جاؤں۔ اُن کی طبیعت خراب ہے" اس نے فوراً وضاحت کی جیسے اس بات کے لئے وہ پہلے سے تیار تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو" ٹیچر نے قدرے خفگی کا اظہار کیا۔ "نہیں سر! میں ہرگز جھوٹ نہیں بولتا آپ مجھ سے قسم لے لیں"۔ وہ اپنے آپ کو پارسا ثابت کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

انہوں نے دس کا وہ نوٹ اپنے ہاتھوں میں لے کر غور سے دیکھا اور غصّے سے تلملا اٹھے۔ بلا تامل اس کا کان کھینچ کر زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے گویا ہوئے "چوری اس پر سے یہ سینہ زوری بدمعاش! دیکھ اس نوٹ پر کس کے دستخط ہیں! تیری امّی کے یا خالہ کے؟" غصہ سے ٹیچر کی آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ آج راشد سے پچھلی ساری کسر نکال لینا چاہتے تھے۔

انہوں نے مجھے بھی ہدایت کی کہ میں راشد سے بدلہ لوں اور سخت سزا دوں۔ تمام لڑکوں کے سامنے اسے تھپڑ لگاؤں رسوا کروں۔ میں نے بھی سوچا موقع اچھا ہے اپنے دِل کی بھڑاس نکال لوں مگر اچانک مجھے یہ قول یاد آگیا کہ "معافی سب سے بڑی سزا ہے"۔ پھر میرے اُٹھتے ہوئے قدم رک گئے اور میں نے سر سے کہا کہ "میں راشد کو معاف کرتا ہوں"۔

میں نے دیکھا کہ میری اس معافی پر راشد کی آنکھوں سے ندامت کے آنسو ٹپکنے لگے۔ وہ اپنے کئے پر نہایت شرمندہ ہوا۔ اس نے جھوٹ بولنے اور چوری کرنے سے توبہ کر لی۔ میری اس معافی سے کلاس ٹیچر بھی خوش ہوئے تھے۔ اور خود میرے دِل کو بھی اطمینان اور سکون حاصل ہو گیا۔ کتابوں کے گم ہونے کا غم بھی جیسے کافور ہو گیا۔

میں نے گھر جا کر جب امّی کو آج کلاس میں رونما ہونے والا واقعہ بتایا تو مارے خوشی کے انہوں نے میری پیشانی چومتے ہوئے کہا "واہ بیٹے! تم نے آج ایک مثالی لڑکے کا کردار ادا کیا۔ خدا تمہیں خوش رکھے اور آئندہ بھی اس سے بہتر مثال قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

محمد خالد

زبان کی کہانی



ننھی مشعل نے لیٹے لیٹے تیزی سے ہاتھ پاؤں چلائے اور منہ کھول کر آواز نکالی "آآآآغوں" اور پھر خوشی سے ایک کلکاری ماری۔ "امّی مشعل بولنا کب شروع کرے گی؟"

نوفل میاں نے اپنی امّی سے پوچھا۔ "ایسی بھی کیا بے چینی! ابھی تو وہ تین ہی مہینے کی ہے۔"

امی نے مشعل کے کپڑے تبدیل کرتے ہوئے جواب دیا۔

"لیکن اسے بولنا کون سکھائے گا؟" نوفل نے بے صبری سے کہا

"بیٹا بچے خود بخود بولنا سیکھتے ہیں" امّی نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو کیا میں نے بھی خود بخود بولنا سیکھ لیا تھا؟" نوفل کو یقین نہیں آیا۔

"اور کیا، تم کو کوئی بات سمجھانے سے تو سمجھ میں آتی نہیں" نوفل کی بڑی بہن تابندہ نے بیچ میں دخل دیا، وہ ان کے سوالات سے عاجز تھی۔

"تم مت بولو، تم سے کوئی نہیں پوچھ رہا ہے۔"

"بھئی لڑو مت، یہاں آؤ کیا بات ہے؟" ان کے دادا نے کہا جو ابھی ابھی اخبار پڑھ کر فارغ ہوئے تھے۔

"دادا جان دیکھئے یہ ہر وقت مجھ سے لڑتا رہتا ہے۔ میری چوٹیاں بھی کھینچتا ہے۔"

"دادا جان یہ ہر وقت مجھے ٹوکتی رہتی ہے۔ یہ مت کرو۔ یہ کیوں کیا، وہ کیوں کیا۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ" دادا جان نے ہاتھ پھیلا کر اشارہ کیا۔ "یہ بتاؤ کہ مشعل سے کون زیادہ پیار کرتا ہے؟"

"میں!" نوفل اور تابندہ نے ایک ساتھ ہاتھ کھڑا کر کے جواب دیا۔

"اب تم ہی بتاؤ کہ جب وہ بڑی ہو گی اور تم دونوں کو یوں لڑتا جھگڑتا دیکھے گی تو کیا وہ بھی جھگڑالو نہیں ہو جائے گی؟"

"اچھا دادا جان ہم وعدہ کرتے ہیں کہ آئندہ نہیں لڑیں گے۔" تابندہ نے شرمندہ ہو کر کہا۔

"میں تو بس پوچھ رہا تھا کہ بچے خود بخود بولنا کیسے سیکھ لیتے ہیں۔" نوفل نے منہ لٹکا لیا۔

"اچھا تو یہ بات تھی! ہم تمہیں بتاتے ہیں بچے بہت نقال ہوتے ہیں۔ وہ بڑوں کی نقل کرتے ہیں اور آہستہ آہستہ ان کی طرح بولنا شروع کر دیتے ہیں۔" دادا جان نے سمجھانا شروع کیا۔

"جیسے نوفل نے اس روز آپ کی نقل میں آپ کی شیروانی، ٹوپی، جوتے اور عینک پہن لی تھی؟"

تابندہ نے یاد دلایا۔

"ہاں" کچھ ویسے ہی" دادا جان نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"نقل تو بندر بھی کرتے ہیں!" وہ کیوں نہیں بولتے؟" نوفل کو یکایک بندر کا تماشہ یاد آ گیا۔ جس میں ایک بندر ٹوپی اور چشمہ پہن کر چھڑی کندھے پر رکھ کر ٹھمک ٹھمک کر چل رہا تھا

"بیٹے اللہ تعالیٰ نے انسان ہی کو حیوان ناطق بنایا ہے۔" دادا جان بولے۔

"ہم حیوان ہیں؟ وہ کیسے؟" نوفل میاں پریشان ہو گئے۔

"حیوانِ ناطق کا مطلب ہے بولنے والا جانور۔" دادا جان نے جواب دیا۔

"پھر تو ہمارا مٹھو ہوا نا حیوانِ ناطق۔" تابندہ کی حیرانی قائم رہی۔

پورے گھر میں دادا جان ہی تھے جو ان دونوں بچوں کے مسلسل سوالات سے پریشان نہیں

ہوتے تھے اور شاید ہوتے بھی ہوں تو ظاہر ہرگز نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اب ایک نئے رُخ سے بات شروع کی۔

"دیکھو ایسے یوں سمجھو کہ طوطا گنتی کے چند الفاظ ہی سیکھ سکتا ہے جیسے بندر انسان کی چند حرکتوں کی نقل کر سکتا ہے سارے طوطے ہماری طرح نہیں بولتے، سارے بندر ہماری طرح عینک ٹوپی وغیرہ نہیں پہنتے۔ یہ تو حضرت انسان کی صحبت اور تربیت کا کمال ہے کہ وہ جانوروں کو انوکھی انوکھی چیزیں سکھا کر اُن سے تفریح لیتے ہیں۔ انسان نے تو اب سے ہزاروں سال پہلے بولنا شروع کیا تھا غالباً شروع شروع میں اس نے بھی ہماری ننھی مشعل کی طرح غوں غاں کی آوازیں نکالی ہوں گی۔ اور پھر جیسے جیسے اس کی تہذیب ترقی کرتی گئی ویسے ویسے اس کی زبان بھی بدلتی گئی اور اب ہزاروں زبانوں اور لاکھوں کروڑوں الفاظ کے ذریعے ہم دوسروں تک اپنا مطلب پہنچاتے ہیں۔"

"اچھا!" نوفل کی حیرانی کی انتہا نہ رہی "آپ کو تو ساری زبانیں آتی ہوں گی؟ نوفل کے خیال میں ان کے دادا دنیا کے سارے علوم کے ماہر تھے۔ دادا جان مسکرائے۔

"ساری زبانیں جاننے کا دعویٰ تو کوئی نہیں کر سکتا، دنیا بھر میں کوئی تین ہزار زبانیں بولی جاتی ہیں ان میں انگریزی، چینی اور اردو بولنے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔

لیکن رنڈانڈین لوگوں کے بعض ایسے چھوٹے چھوٹے قبیلے بھی موجود ہیں جن میں ہر قبیلے کی الگ زبان ہے۔"

"یہ قبیلے کتنے چھوٹے ہوں گے دادا جان۔" تابندہ نے دونوں ہتھیلیوں پر چہرہ ٹکا کے سوال کیا۔

"یہی کوئی دو تین ہزار افراد کا ایک قبیلہ ہو گا۔"

"زبانوں کے بھی قبیلے ہوتے ہیں؟" بات پوری طرح نوفل کی سمجھ میں نہیں آئی۔

"زبانوں کے قبیلے نہیں عقلمند۔ قبیلوں کی الگ الگ زبانیں ہوتی ہیں۔" تابندہ نے اپنے بھائی کو ٹوکا۔

"میں دادا جان سے پوچھ رہا ہوں۔ تم سے نہیں!" نوفل نے ناک چڑھائی۔

"لو بھئی اب میں بات ختم کرتا ہوں، تم لوگ تو پھر لڑنے لگے۔" دادا جان نے تنبیہ کی۔

"نہیں دادا جان مسکرانے لگے۔" نوفل کی بات بھی ایک حد تک ٹھیک ہے۔ زبانوں کے بھی قبیلے یا خاندان ہوتے ہیں مثلاً دنیا کی آدھی سے زیادہ آبادی انڈو یورپین خاندان سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولتی ہے۔ یوں سمجھو کہ برصغیر ہندو پاک سے یورپ تک بولی جانے والی تقریباً تمام زبانیں اسی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ شمالی اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں بھی یہی زبانیں عام ہیں۔ اُردو، ہندی، فارسی، روسی، یونانی، فرانسیسی، جرمن، انگریزی وغیرہ سب کا تعلق اسی خاندان سے ہے۔ ان سب زبانوں میں بہت سی باتیں ملتی جلتی ہیں مثلاً ہندی میں باپ کو "پتا" اور ماں کو "ماتا" کہتے ہیں فارسی میں "پدر" اور "مادر" انگریزی میں "فادر" اور مدر" فرانسیسی میں پیئر اور میئر کہتے ہیں۔

واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ہزاروں میل کے فاصلے پر رہنے والے ایک جیسے الفاظ بولیں؟ تابندہ کو یقین نہیں آیا۔ "بات دراصل یہ ہے" دادا جان سمجھاتے ہوئے بولے۔ "کہ پہلے پہل یہ تمام لوگ شمالی یورپ میں بحیرۂ بالٹک کے آس پاس رہتے تھے پھر ہوا یوں کہ رزق کی تلاش میں ان میں سے کچھ لوگ مشرق کی جانب چلے گئے، کچھ جنوب کی طرف اور کچھ مغرب کو۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے رہن سہن کے طریقے اور بول چال میں تبدیلی ہوتی چلی گئی۔

"اور باقی دنیا میں کونسی زبانیں بولی جاتی ہیں؟" تابندہ نے پوچھا۔

"دوسرے علاقوں میں جو زبانیں بولی جاتی ہیں ان کا تعلق کئی مختلف خاندانوں سے ہے۔ ان میں خاص، خاص سامی، کوشی، خاندان ہیں جنہیں انگریزی میں SEMITIC اور CUSHITIC کہتے ہیں۔ سامی خاندان میں دو مشہور زبانیں عربی اور عبرانی ہیں۔ افریقہ کے اکثر علاقوں میں کوشی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن پورے شمالی افریقہ میں رہنے والے عربی یا اس سے ملتی جلتی زبانیں بولتے ہیں ان کے علاوہ 'حامی' یا hamitic زبانیں بھی ہیں جو قدیم زمانے میں مصر اور دوسرے شمالی افریقی علاقوں کے رہنے والے بولا کرتے تھے۔ اب بھی بربر قبیلے کی مختلف بولیاں حامی زبانوں کی شکلیں ہیں۔

"پھر یورالی زبانیں ہیں اور التھائی زبانیں ہیں۔ بعض ماہرین ان دونوں قسموں کو ایک ہی گروپ میں شمار کرتے ہیں۔ فن لینڈ، ہنگری وغیرہ کے رہنے والے یورالی زبانیں بولتے ہیں اور ترکوں

کی زبان کا تعلق التائی خاندان سے ہے۔

"ایک اور اہم خاندان چینی تبتی زبانوں کا ہے جو سارے چینی برمی اور تبتی لوگ بولتے ہیں جنوبی ہندوستان کی زبانیں جیسے تامل، تیلگو اور ملیالم، دراوڑی زبانیں کہلاتی ہیں، ملایا، انڈونیشیا، جاوا وغیرہ کے لوگ جو زبانیں بولتے ہیں انہیں علیحدہ خاندان میں شمار کیا جاتا ہے"

"دادا جان دادا جان" نوفل جو اتنی لمبی تقریر سے گھبرا گئے تھے بے چینی سے بول اٹھے" یہ انگریزی بولنے والے مرغ COCK-A-DOODLE-DOO کیوں بولتے ہیں، ککڑوں کوں کیوں نہیں بولتے؟"

"بھئی واہ نوفل میاں" آپ بھی کمال کرتے ہیں! ایک بات اور بتائیں فرانسیسی زبان میں مرغے کو کوری کو' پکارتے ہیں رومانوی زبان میں 'ککوری کو' کہتے ہیں اور اٹلی کے مرغے بانگ دیتے وقت ککیتری کی' کہتے ہیں یہی تو بات ہے۔

ابتدا میں الفاظ ایسی ہی قدرتی آوازوں سے بنے تھے بلکہ آپ ہماری اپنی زبان میں ایسے بہت سے الفاظ سنتے اور بولتے ہیں جو قدرتی آواز کو ظاہر کرتے ہیں' مثلاً بادلوں کی گھن گرج پرندوں کی چہچہاہٹ' گھوڑے کی ٹاپ کی آواز۔ لیکن ہماری زندگی میں اس قسم کی آوازیں اور الفاظ ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ ہے۔ جیسے جیسے انسان کی تہذیب ترقی کرتی گئی نئے نئے خیالات ظاہر کرنے کے لئے نئے نئے الفاظ کی ضرورت پڑتی گئی۔ زبانیں تو اب بھی تبدیل ہو رہی ہیں ایک زبان کے الفاظ دوسری زبان میں شامل ہو رہے ہیں۔ کتنی سو سال پہلے یونانی زبان کے بعض الفاظ عربی میں شامل ہو گئے مثلاً لفظ 'امیر البحر' سے 'ایڈمرل' بنا۔ اب انگریزی کے بعض الفاظ ہم اردو میں بھی بولتے ہیں۔ مثلاً ریڈیو' ٹیلی فون'۔ انہی الفاظ کو عربی میں 'رادیو' اور 'تلفن' کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک زبان کے بعض حروف کا تلفظ دوسری زبان میں نہیں ادا ہو سکتا۔ بہرحال ہمیں تو ایسا ہی لگتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساری زبانوں کے الفاظ ایک دوسری زبان میں اس طرح شامل ہو جائیں گے کہ آئندہ زمانے کا ہر شخص ایک دوسرے کی بات ذرا سی کوشش سے سمجھ سکے گا۔" ایک زبان 'انٹرلنگوا' کے نام سے بنائی گئی تھی ایک اور ایس پے رانٹو' کے نام سے سوائے چند لوگوں کے جنہوں نے خاص طور پر یہ زبانیں سیکھیں کسی نے ان میں دلچسپی نہیں لی۔

زبانیں وجود میں آنا اور ان میں تبدیلی ہونا ایک فطری عمل ہے۔ اسے کسی ایک فرد کی کوشش

یا حکومت کے قانون کی مدد سے نافذ نہیں کیا جا سکتا اب ہماری زبان اردو ہی کو لے لو۔ یہ سب سے زیادہ نئی زبان ہے۔ اور برصغیر میں مغل بادشاہوں کے دور میں وجود میں آئی ہے۔ اردو کا مطلب ہے، لشکر، یعنی یہ زبان لشکر میں شامل مختلف زبانیں بولنے والے افراد کے آپس میں میل جول سے بنی ہے اس میں ہندی فارسی اور عربی کے الفاظ شامل ہیں اگر دیکھا جائے تو یہ ایک ایسی زبان ہے جو انگریزی کے بعد دنیا کے سب سے زیادہ علاقوں میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔

دادا جان نے نوفل میاں کو اپنی گود سے اتار کر کہا "اب آپ جا کر اپنی اردو کی کتاب لے آیئے اور ہمیں نظمیں سنایئے"۔ نوفل کو نظمیں یاد کرنے کا بہت شوق تھا اور تابندہ کو کہانیاں لکھنے کا۔ پیارے بچو آپ کو کس چیز کا شوق ہے؟



طاہر نقوی

نئی زندگی

میری دادی اماں اٹھتے بیٹھتے ٹوکتے ہوئے مجھ سے ہمیشہ یہی کہتی کہ ہر آدمی پر محنت فرض ہے۔ تعلیم کے ساتھ تمہیں ہاتھ سے کمانے کا فن بھی آنا چاہیئے۔ اور میں ان کی اس بات پر بس کڑھتا رہتا آخر ایک دن بیزاری سے پوچھ بیٹھا کہ آپ ہی بتایئے کیا سیکھوں۔ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ بیٹے کوئی بھی روزمرہ کا کام مثلاً میز کرسی بنانا۔ قالین بننا۔ چٹائی بُننا۔ کپڑے سینا یا کوئی اور ہاتھ کا کام۔ میں ان کی اس بات پر یہ سوچ کر ہنس دیا کہ بھلا اتنے بڑے باپ کے بیٹے کو کوئی ایسا کام سیکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ چنانچہ اب بھی یہ سن کر میں ہنستے ہوئے ان کے پاس سے اٹھنے ہی والا تھا کہ دادی اماں نے غصّے سے کہا کہ تمہیں زندگی میں ہر قسم کی آسائش



میسر ہے اور بے فکر زندگی بسر کرتے ہو اسی لئے تم میری بات کی پرواہ نہیں کرتے۔ میں بڑبڑاتا ہوا اس وقت اٹھ گیا لیکن رات کو کھانے کی میز پر دادی اماں نے پھر وہی بات چھیڑ دی اور نہایت نرمی اور ملائم لہجے میں بولیں کہ بیٹے دیکھو ہماری قوم کے ہر بچے کو کسی نہ کسی شریفانہ فن سے واقفیت ہونی چاہیئے جس سے وقت پڑنے پر نہ صرف وہ خود باعزت زندگی گزار سکے بلکہ آڑے وقت میں ملک کے بھی کام آسکے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا کہ ایسے کام تو ان لوگوں کو کرنے چاہئیں جو غریب ہوں یہ سن کر انہوں نے ڈانٹا اور کہا کہ غرور کی باتیں مت کرو۔ غرور کا سر ہمیشہ نیچا ہوتا ہے۔ باپ کی کمائی پر اتنا گھمنڈ اچھا نہیں۔ اپنے بازو پر بھروسہ کرنا سیکھو۔ اس قوم کے ہر بچے کو اپنے قدموں پر کھڑا ہونا ہے"۔

دادی اماں کی یہ باتیں میری امی جان کو بھی ناگوار گزرتیں مگر خاموش ہی رہتیں۔ دادی اماں مجھ سے تو کہتی ہی تھیں ابا جان سے بھی کہتیں کہ اسے کوئی کام سکھانے کا انتظام کرو۔ آخر دادی اماں کے روز روز کے اصرار سے مجبور ہو کر ابا جان نے چھٹیوں کے زمانے میں مجھے ایک ادارے میں چٹائیاں بننے کے کام پر لگوا دیا۔ وہاں مجھ ایسے بہت سے بچے یہی کام سیکھتے تھے۔ شروع میں میرا جی نہ لگا۔ مگر اپنے جیسے دوسرے بچوں کی محنت اور شوق کو دیکھ کر مجھ میں بھی دلچسپی پیدا ہونے لگی اور میں نے دل لگا کر یہ کام تھوڑے عرصے میں ہی سیکھ لیا۔ جب میں یہ کام سیکھ چکا تو مجھے اپنے اندر ایک قسم کا اعتماد محسوس ہوا اور دادی اماں خاص طور پر بے حد خوش ہوئیں اور بولیں کہ اب تم ضرورت پڑنے پر زندگی میں کبھی ناکام نہیں رہو گے۔ یاد رکھو دولت ہمیشہ ساتھ نہیں دیتی اور نہ ماں باپ ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ ہمارے بچوں کو وقت پڑنے پر ملک و قوم کی ہر خدمت کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

شام کا وقت تھا اور اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ سڑکیں سنسان تھیں۔ اونچے اور بڑے علاقوں کی سڑکیں زیادہ تر یونہی سنسان رہتی ہیں۔ میں اپنے ایک دوست کے ہاں سے پیدل ہی واپس آرہا تھا کیونکہ گھر زیادہ دور نہیں تھا۔ مجھ پر دادی اماں کی باتوں کا اثر بھی تھا کہ میں اکثر پیدل ہی آتا جاتا تھا۔ اپنا کام خود ہی کرنا پسند کرتا۔ نماز بھی پابندی سے پڑھنے لگا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے جا رہا تھا کہ پہلے مغرب کی نماز پڑھوں گا اس کے بعد اسکول کا کام کروں گا کہ اچانک ایک آواز سے چونک پڑا۔ ایک آدمی کھڑا مجھے ٹھہرنے کو کہہ رہا تھا۔ معلوم نہیں کیا ہوا کہ اس جگہ سے حرکت کرنا میرے بس میں نہیں رہا۔ وہ میرے قریب آیا اور مجھ سے ایک پتہ دریافت کرنے لگا میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک ہاتھ پیچھے سے میرے منہ پر آیا اور پھر اس کے بعد جب میری آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا کہ عجیب جگہ ہے۔ مجھ ایسے دوسرے لڑکے پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے

محنت مزدوری کر رہے ہیں۔ اپنے جیسے بہت سے بچوں کی زندگی کا یہ رخ دیکھ کر میرے جسم میں جھرجھری آنے آنے لگی۔ مجھے اپنے ماں باپ اور اپنے گھر کا خیال آنے لگا۔ میں نے سوچا شاید اب میں وہاں واپس کبھی نہ جا سکوں گا۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ اتنے میں ایک لڑکا میری جانب آیا اور بولا ارے تم رو رہے ہو۔ اب رونے سے کچھ نہ ہوگا۔ بتاؤ کہ تم کیسے پھنس گئے۔ میں نے پورا حوال کہہ سنایا تو بولا کہ یہ مت بتانا کہ تم کسی امیر آدمی کے بیٹے ہو ورنہ یہ لوگ تمہارے والد کو پریشان کریں گے اور روزان سے روپے اینٹھیں گے، بس قسمت سمجھ کر جو کہا جائے وہی کرتے رہو۔ میں اس کی اس بے بسی پر دم بخود رہ گیا اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں بچوں کو اغوا کرنے والے گروہ کے ہتھے چڑھ گیا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ لڑکا دوسری جانب کھسک گیا کیونکہ خوفناک قسم کا ایک آدمی ادھر ہی آرہا تھا وہ چہرے مہرے سے بھی بُرا آدمی لگ رہا تھا اس کے قریب آتے ہی میں لرزنے لگا اس نے ڈانٹتے ہوئے پوچھا کہ تمہارا باپ کون ہے اور کیا کرتا ہے۔ میں نے سنبھلتے ہوئے جواب دیا کہ میں تو ایک غریب لڑکا ہوں، میرے والدین بمشکل مجھے تعلیم دلواتے ہیں آپ مجھے یہاں کیوں لائے ہیں۔ اس نے مجھے مزید ڈانٹا کہ اب تم یہاں رہ کر روپے کماؤ گے سمجھے، میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا کہ مجھے تو کوئی کام نہیں آتا۔ اس پر اس نے بتایا کہ چند دن ہم تمہیں سکھائیں گے اور اس کے بعد تم باہر جا کر بھیک مانگ کر لایا کرو گے۔ یہ سن کر میرا رواں رواں کانپنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کیسا سلوک کیا جا رہا ہے۔ یوں تو رفتہ رفتہ پوری قوم میں یہ عادت سرایت کر جائے گی۔ یہ سوچ کر میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا کہ میں کچھ اور کر لوں گا یہ کام آپ مجھ سے نہ کرائیں مہربانی ہوگی۔ وہ یہ سن کر زور سے ہنستے ہوئے کہنے لگا کہ بھلا تم اور کیا کر سکتے ہو ہمیں تو روپیہ چاہیے روپیہ۔ تمہیں آرام سے روٹی نہیں ملے گی۔ اس وقت مجھے گھر کا آرام اور آسائش یاد آنے لگی۔ چنانچہ کچھ سوچتے ہوئے میں نے جواب دیا کہ میں بہت اچھی قسم کی چٹائیاں بن سکتا ہوں اس بات پر وہ تعجب کرنے لگا شاید اس کے لئے میں ایسا بچہ تھا جو کوئی کام جانتا تھا اس لئے وہ کچھ نرم پڑ گیا اور کہنے لگا کہ اس سے ہمیں کیا کمائی ہو سکتی ہے۔ میں فوراً بول پڑا کہ میں آپ کو ایک جگہ بتا دوں گا وہاں جا کر آپ وہ چٹائیاں فروخت کریں گے تو آپ کو منہ مانگے دام ملیں گے۔ میں اور میرے گھر والے اپنی بنائی چٹائیاں وہیں بیچا کرتے تھے جن سے ہمارا خرچ چلتا تھا دراصل وہ کم داموں ہماری یہ چٹائیاں خرید کر مہنگے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ وہ کچھ سوچ کر راضی ہو گیا اور مجھے ضروری سامان اور اوزار مہیا کر دیئے۔

میں نے چند ہی دنوں میں چٹائیاں بن کر اسے دے دیں اور اسے وہاں کا پتہ بتاتے ہوئے کہا کہ ان لوگوں کو چٹائیوں سے مطلب ہے آپ انہیں بتا دیں کہ وہ لڑکا بیمار ہے اب میں ہی لایا کروں گا۔ وہ مطمئن

ہوکر چلا گیا۔ میں نے اپنے اس اچھے فیصلے پر خدا کا شکر ادا کیا۔ کیونکہ ان چٹائیوں پر میں نے ابا جان کے نام ایک پیغام اور اس گروہ کے اڈے کا پتہ بھی بُن دیا تھا جو محض ایک ڈیزائن معلوم ہوتا تھا اور غور کرنے سے ہی پڑھا جا سکتا تھا۔

واپس آکر اس آدمی نے خوش ہو کر مجھے وہ نوٹ دکھائے اور کہا کہ ہاں تم روز ایسی چٹائیاں بنایا کرو ان لوگوں نے مجھے بہت سارے روپے دیئے۔ میں اپنے تیئں پلان کی کامیابی کی دعا مانگ رہا تھا۔ اگر صدقِ دل سے دعا مانگی جائے تو قبول ضرور ہوتی ہے۔ اس کو آئے ہوئے ابھی تین چار گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ اچانک باہر گولیاں چلنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی پولیس والے اندر داخل ہونے لگے۔ چنانچہ وہ ملک دشمن اور اس کے کارندے جان بچانے کی فکر میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے مگر قوم کے مجرم پولیس سے کہاں تک چھپتے لہٰذا وہ پکڑے گئے اور تمام بچے اس قدر خوش ہوئے کہ باہر نکل نکل کر جدھر جس کا منہ اٹھتا وہ اس طرف بھاگنے لگا۔ میں بھی باہر نکلا تو پولیس کی جیپ کے پاس ابا جان کھڑے تھے۔ میں دوڑ کر ان کے پاس گیا اور انہوں نے مجھے بے اختیار گود میں اٹھا لیا۔

گھر پہنچ کر میں سب سے پہلے دادی اماں کے قدموں میں گر گیا امّی جان بھی انہیں عقیدت سے دیکھ رہی تھیں۔ ہمارے گھر میں اور خود میری زندگی میں ایک بار پھر بہار آگئی تھی۔ ابا جان نے بتایا کہ جب وہ آدمی چٹائیاں لے کر آیا تو میں نے تمہارے ہاتھ کی بنی ہوئی چٹائیاں فوراً پہچان لیں پھر کھول کر دیکھا تو تمہارا پیغام پڑھا اور اس کی اطلاع فوراً پولیس کو دی۔ دادی جان نے شفقت سے مجھے تھپتھپاتے ہوئے کہا کہ شاباش تم بہت سمجھ دار اور باہمت نکلے۔ ہر پاکستانی بچے کو ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ میں نے ان کی طرف تشکر اور عقیدت سے دیکھا۔ میری اور دوسرے بچوں کی زندگیاں اور مستقبل محض دادی اماں کی وجہ سے محفوظ رہے ورنہ خدا جانے ہم سب کا کیا حشر ہوتا۔!!!

تجربہ

ایک آدمی بڑی مدت کے بعد اپنے ایک دوست سے ملا جو کار میں جا رہا تھا، دوست نے کار روک روک کر اسے اندر بٹھا لیا "ارے تم تو کنگال تھے یہ کار کہاں سے لی۔"

"دوست بولا" کاروبار میں دولت کمائی ہے"۔ "مگر کاروبار کے لئے روپیہ کہاں سے آیا"

ایک آدمی مل گیا تھا، اس کے پاس روپیہ تھا اور میرے پاس تجربہ۔ اب گزشتہ دو سال سے اس کے پاس تجربہ ہے اور میرے پاس روپیہ"

محمد سعید عباس

کومان کا آدم خور

"کومان" نامی بستی افریقہ کے جنگلوں کے قریب واقع بستیوں میں سے ایک تھی میں اس وقت اس بستی کے رسیٹ ہاؤس میں موجود تھا چند دنوں سے ایک آدم خور شیر نے بستی والوں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا یہاں کے رہنے والے لوگ اس شیر سے بہت خوفزدہ تھے شام ہوتے ہی بستی کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں گھس جاتے ہیں چونکہ ایک شکاری ہوں اس لیئے محکمۂ جنگلات نے اس آدم خور شیر کو مارنے کے لیے میری خدمات حاصل کیں اور آج میں یہاں موجود تھا۔ اس بستی کے علاوہ آس پاس کی دوسری بستیوں اور گاؤں والوں کو بھی میری آمد کی خبر مل گئی تھی میں نے یہ محسوس کیا کہ لوگ اس آدم خور شیر سے بہت خوفزدہ ہیں۔



مجھے یہاں آئے ہوئے ایک دِن گذر گیا تھا میں نے چند لوگوں کو اس کام پر لگا دیا تھا کہ جیسے ہی کہیں سے اس شیر کے بارے میں کوئی اِطلاع ملے تو مجھے خبر کریں اس وقت میں ریسٹ ہاؤس کے ہال میں بیٹھا ہوا کافی پی رہا تھا کہ دُور سے لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں سُنائی دیں۔ میں نے کافی کی پیالی ایک جانب رکھی اور اس شور وغُل کی وجہ معلوم کرنے کے لیے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا۔

ریسٹ ہاؤس کے باہر کافی لوگ جمع تھے ایک بوڑھا آدمی ایک جانب کھڑا رو رہا تھا میں نے لوگوں سے اس کے رونے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ اس بوڑھے کا بیٹا کل رات سے گھر میں نہیں آیا ہے مگر اس میں رونے کی کیا بات ہے میں نے حیرت سے پوچھا ایک آدمی بولا دراصل بات یہ ہے صاحب کہ جنگل میں مشرق کی جانب کچھ دُور خون کے چند دَھبّے اور نشانات موجود ہیں اس لئے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اس بُوڑھے کا بیٹا کہیں شیر کا شکار نہ بن گیا ہو کیا تم لوگوں نے اِس نوجوان کی لاش تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی میں نے حیرت سے کہا نہیں جناب کوئی بھی اُس جگہ جانے کو تیار نہیں ہے۔ جہاں وہ خون کے دَھبّے دکھائی دیئے ہیں۔ ہر ایک کو یہی خطرہ ہے کہ آس پاس وہ آدم خور شیر موجود نہ ہو "چلو میں تم لوگوں کے ساتھ وہاں چلتا ہوں" میں نے کہا اور اندر سے جا کر اپنی رائفل اٹھائی اور ان لوگوں کے ساتھ جنگل کے اس حصّے کی جانب چل پڑا جہاں ان لوگوں کے خیال میں اس نوجوان کی لاش موجود ہونا چاہیئے تھی۔

جنگل میں کافی فاصلہ طے کرنے کے بعد ایک آدمی نے ہاتھ سے ایک جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا وہ دیکھئے جناب میں نے دیکھا کہ درختوں میں گھری ہوئی اس جگہ پر کافی بڑی بڑی گھاس اُگی ہوئی تھی۔ گھاس کئی جگہ سے دبی دبی محسوس ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ کسی چیز کو گھسیٹ کر گھاس کے اندر لے جایا گیا ہے کئی جگہ گھاس پہ خون کے دَھبّے بھی موجود تھے۔ جو اَب سیاہ رنگت اختیار کر چکے تھے۔

میں نے سب لوگوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور خود اپنی رائفل سیدھی کر کے آہستہ آہستہ ان نشانوں کے پیچھے چل پڑا کچھ دُور تک چلنے کے بعد مجھے گھاس میں ایک انسانی ٹانگ نظر آئی جو کچھ دُور موجود گھنی گھاس میں سے باہر نکلی ہوئی تھی میں اس جگہ ٹھہر گیا اور سانس روک کر آہٹ یا کوئی آواز سننے کی کوشش کرنے لگا کہ کہیں وہ شیر لاش کے آس پاس موجود نہ ہو کافی دیر تک کوئی آواز سنائی نہ دی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا لاش تک پہنچ گیا وہ ایک نوجوان آدمی کی لاش تھی۔ جس کی گردن اُدھڑی ہوئی تھی لاش کا پیٹ پھٹا ہوا تھا اور اس کی انتڑیاں دکھائی دے رہی تھیں دائیں جانب سے سینے کا گوشت غائب تھا اور ایک بازو کا گوشت بھی آدھے سے زیادہ کھایا جا چکا تھا۔ میں نے اطمینان کرنے کے بعد لوگوں کو آواز دی جو کچھ دُور درختوں کے پیچھے چھپے کھڑے تھے وہ سب وہاں پہنچ گئے۔

بوڑھا تو اپنے بیٹے کی لاش دیکھ کر بے ہوش ہو گیا لوگوں نے نوجوان کی لاش وہاں سے لے جانی چاہی لیکن میں نے انہیں منع کر دیا جس پر کچھ لوگ بگڑ گئے میں نے انہیں یہ کہہ کر سمجھا لیا کہ اگر وہ آدم خور سے نجات چاہتے ہیں تو لاش کو آج رات یہیں رہنے دیں۔ کیونکہ شکار نہ ملنے کی صورت میں وہ آدم خور دوبارہ یہاں آئے گا۔

میں نے لوگوں کی مدد سے اس جگہ سے کچھ دُور ایک مضبوط سے درخت پر مچان تیار کر لی اس دوران شام ہو گئی اور میں ایک آدمی کے ساتھ اس مچان پر بیٹھ کر آدم خور شیر کا انتظار کرنے لگا۔

رات کے تقریباً ایک بجے ہلکی سی آہٹ ہوئی میں فوراً چوکنا ہو گیا اور اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمی کو ہدایت کی کہ جیسے ہی میں کہوں وہ فوراً ہاتھوں میں پکڑی ہوئی ٹارچ کو روشن کر دے اور پھر خود آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں اس جانب دیکھنے کی کوشش کرنے لگا جہاں وہ لاش موجود تھی۔ اچانک مجھے ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی کچھ چبا رہا ہو۔ میں نے فوراً اس آدمی کو اشارہ کیا اس نے ایک دم ٹارچ روشن کر دی میں نے دیکھا کہ ایک بڑی جسامت کا شیر لاش کے پاس کھڑا ہوا ہے میں نے فوراً گولی چلا دی شیر نے ایک زور دار جست لی اور جنگل میں ایک جانب غائب ہو گیا رات کا سناٹا رائفل چلنے کی آواز سے جنگل گونج اُٹھا۔

اس کے بعد ساری رات اس آدم خور کا انتظار کرتے ہوئے گذر گئی مگر وہ دوبارہ اس جانب نہ آیا صبح ہم جب رات کے تھکے ہوئے دوبارہ ریسٹ ہاؤس پہنچے تو خبر ملی کہ اس آدم خور نے ساتھ والے گاؤں کے قریب ایک آدمی کو ہلاک کر دیا ہے میں چونکہ پہلے ہی اپنے نشانے کے خطا ہو جانے کی وجہ سے بہت افسردہ تھا اس لیئے فوراً اس گاؤں کی جانب ایک آدمی کے ساتھ چل دیا۔ ایک گھنٹے سفر کے بعد میں اس گاؤں میں پہنچ گیا وہاں چند لوگوں کی راہ نمائی میں اس جگہ پہنچا جہاں اس آدمی کی لاش موجود تھی وہ بے چارہ کوئی مسافر دکھائی دے رہا تھا۔ جس جگہ لاش پڑی تھی اس سے کچھ دُور ۲۰ یا چالیس فٹ بلند ایک چھوٹی سی پہاڑی موجود تھی جس سے پانی ایک آبشار کی صورت میں نیچے گر رہا تھا۔ اچانک میری نظر خون کے چند بڑے بڑے دھبوں پر پڑی جو آبشار کی جانب جاتے دکھائی دے رہے تھے اُوہ میرے ذہن میں فوراً خیال آیا کہ کہیں میری گولی سے وہ آدم خور زخمی نہ ہو گیا ہو۔ اور میں یہ سوچ کر رائفل ہاتھوں میں لیے ان دھبوں کا تعاقب کرتا ہوا آگے کی جانب بڑھتا گیا دھبے اس پہاڑی کے نیچے جا کر غائب ہو گئے۔ جہاں پہاڑی سے آبشار کی صورت میں گرنے والا پانی ایک چھوٹی سی جھیل کی صورت میں جمع ہو رہا تھا میں نے دیکھا کہ کچھ دُور جا کر وہ دھبے دوبارہ نظر آنا شروع ہو گئے اب وہ اس پہاڑی کی پچھلی جانب جا رہے تھے میں ان کا تعاقب کرتے ہوئے پہاڑی کی پچھلی جانب پہنچ گیا ایک موڑ مڑتے ہی میری نظر سامنے کی جانب پڑی میں گویا سُن ہو کر رہ گیا۔ آدم خور میرے سامنے تھا اس کی نظریں مجھ پر تھیں

میں نے دیکھا کہ اس کی پچھلی بائیں ٹانگ سے اوپر ایک سوراخ تھا جس میں سے خون نکل نکل کر جمع ہو گیا تھا وہ میری گولی کا نشان تھا جو رات کو اس کے لگی تھی اس وقت میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ رائفل تھام کر اس کا نشانہ لیتا۔ اُسی وقت اس نے اپنا پیٹ زمین سے لگا کر ایک زبردست چھلانگ میری جانب لگائی زخمی ہونے کے باوجود اس کی طاقت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ میں نے فوراً رائفل کی لبلبی دبا دی گولی چلنے کا دھماکہ ہوا اور وہ آدمخور راستے میں ہی قلابازیاں کھاتا ہوا زمین پر آگرا گولی سیدھی اس کے سر میں لگی تھی۔

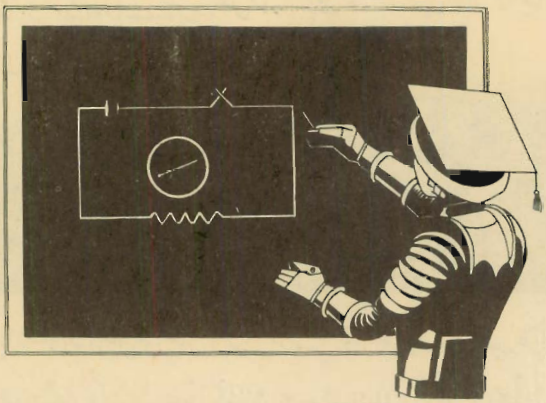
گولی کی آواز سن کر لوگ بھی وہاں پہنچ گئے انہوں نے جب آدم خور شیر کی لاش دیکھی تو خوشی سے ناچنے لگے ان میں سے چند نے تو مجھے کندھوں پر اٹھا لیا اور چند نے ایک بانس پر آدم خور کی لاش کو باندھ لیا، اور اسے گاؤں کی جانب لے چلے۔ میں ان لوگوں کے ساتھ یہ سوچتا ہوا چل رہا تھا کہ اگر گولی آدمخور کے سر میں نہیں لگتی تو میں بھی اس آدمخور کا نوالہ بن چکا ہوتا۔

آدمخور کے مرنے کی خبر جلد ہی آس پاس کے دوسرے گاؤں اور بستیوں میں بھی پہنچ گئی اس دن اس آدم خور کے مرنے کی خوشی میں ایک جشن منایا گیا اور اس طرح وہاں کے لوگوں کو ایک ایسے خطرناک آدمخور شیر سے نجات مل گئی جو اب تک چونسٹھ آدمیوں کو اپنا نوالہ بنا چکا تھا۔



انکل آئی کیو روبوٹ

سوالاً جواباً



- انکل بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہمارے جسم کو کام کرنے کے لئے توانائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بتایئے کہ ہم اپنے جسم کے لئے توانائی کہاں سے حاصل کرتے ہیں۔؟

(عمیر ناظم آباد، کراچی)

بھئی یہ بہت سادہ سی بات ہے کہ آپ اپنے جسم کے لئے ضروری توانائی کھانے پینے کی چیزوں سے حاصل کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضروری ہے کہ آپ کو اپنے جسم کو متوازن غذا دینی چاہیئے تاکہ آپ کا جسم صحت مند رہ سکے یہ نہ ہو کہ آپ کھانا کھا کر بیمار پڑ جائیں۔ آپ کے جسم کو وٹامن اور معدنیات کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ آپ سبزیوں اور پانی سے حاصل کرتے ہیں۔ پھر آپ کے جسم کو پروٹین، نشاستے اور چربی کی ضرورت ہوتی ہے۔ پروٹین کی ضرورت آپ انڈے، دودھ، گوشت اور کچھ سبزیوں سے پوری کرتے ہیں۔ یہ آپ کے جسم کی ہڈیوں اور عضلات کو مضبوط بنانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔

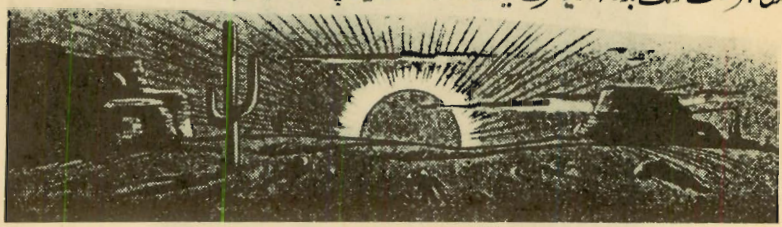
نشاستہ اور روغن یا چربی آپ کے جسم کو دوڑنے کودنے چلنے تیرنے میں مدد دیتی ہے حتیٰ کہ سوچنے کے لئے بھی نشاستہ اور چربی ضروری ہے۔ شکر نشاستہ حاصل کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس کے علاوہ نشاستہ آلو میں دلیہ میں بھٹے میں گندم میں اور جو میں موجود ہوتا ہے اس سے آپ روٹی بناتے ہیں روغن یا چربی آپ مکھن، گوشت اور نباتی تیلوں

سے حاصل کرتے ہیں۔

انکل یہ بتایئے کہ ڈوبتے وقت سورج کا رنگ سرخ کیوں ہوتا ہے۔؟

(میا صدیقی فیڈرل کیپٹل ایریا، کراچی)

بھئی تمام دن کے وقت جب سورج ڈوب رہا ہوتا ہے تو وہ منظر بڑا ہی خوبصورت لگتا ہے۔ اور ہم یہ کہہ اٹھتے ہیں اس وقت سورج کتنا سرخ ہو رہا ہے۔ لیکن دراصل سورج بذات خود سرخ نہیں ہوتا۔ یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ سورج دن بھر مختلف رنگ بدلتا ہو۔ یہ صرف ایک خاص وقت میں اپنا رنگ بدلتا ہے۔



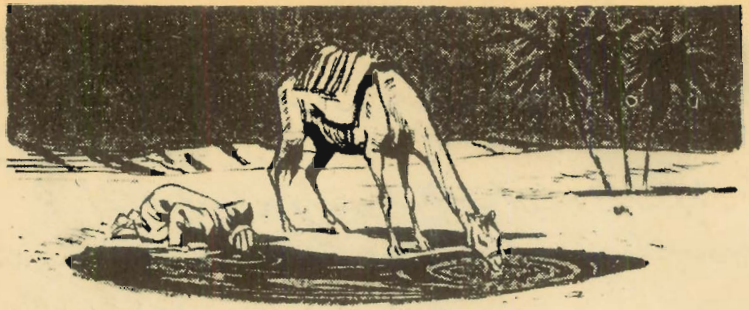
سورج کی روشنی جو دراصل کئی رنگوں کا مجموعہ ہے جو آپ کی آنکھوں کو عموماً سفید نظر آتی ہے۔ لیکن فضا میں ہوا کے مالی کیول ہوتے ہیں، گرد ہوتی ہے، آبی بخارات ہوتے ہیں اور دوسری کثافتیں ہوتی ہیں روشنی ان سب میں سے گزرتی ہے اور یہ رکاوٹیں اس کو مختلف رنگوں میں تقسیم کرتی ہیں۔ ہماری فضا سورج کی روشنی کو بالا نفشی نیلی سبز سرخ اور زرد روشنی میں بھی تقسیم کرتی ہے۔ جب سورج ڈوبنے لگتا ہے۔ تو سرخ اور زرد رنگ زیادہ نمایاں ہو جاتے ہیں اس لئے آپ کہتے ہیں کہ سورج کا رنگ سرخ ہو گیا ہے۔

انکل ہمیں پیاس یا بھوک کیوں لگتی ہے؟

(شوکت اکبر، بھریا روڈ، نوابشاہ)

آپ کو بھوک اور پیاس اس لئے لگتی ہے کہ آپ کے جسم کو غذا کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن بھوک محض خالی پیٹ ہونے پر نہیں لگتی ہے جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ خالی پیٹ ہونے پر بھوک بہت زیادہ لگتی ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ کیونکہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کا پیٹ بالکل خالی ہوتا ہے اور کئی دنوں تک اُس کو بھوک نہیں لگتی اور اکثر بیمار اور بخار میں مبتلا خالی پیٹ لوگوں کو بھی بھوک نہیں لگتی۔

بھوک دراصل خون میں سے ضروری غذائی اجزاء کی کمی کے باعث لگتی ہے۔ جب خون میں سے یہ اجزاء کم ہوتے ہیں تو دماغ کے "مرکزِ بھوک" کو ان اجزاء کی کمی کا پیغام پہنچتا ہے۔



"مرکزِ بھوک" آنتوں اور معدے کے لئے بریک کا سا کام کرتا ہے اور جب خون کو مناسب غذا مل جاتی ہے تو مرکزِ بھوک آنتوں اور معدے کو آہستہ آہستہ کام کرنے کی اجازت دے دیتا ہے۔ جب خون سے ضروری غذائی اجزا کم ہوتے ہیں تو معدہ اور آنتیں تیزی سے اپنا کام شروع کر دیتی ہیں۔ تبھی تو لوگ کہتے ہیں کہ ہماری آنتیں بھوک کے مارے قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

جب ہمیں بھوک لگتی ہے تو اس وقت کسی خاص قسم کے کھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بس قوت بخش غذا کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہماری بھوک ایک مرتبہ کھانے سے پوری نہیں ہوتی تو یہ صحت مندی کی علامت نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب نہیں ہے کہ اگر ہم کو بھوک لگے تو ہم صرف آلو کھائیں۔ نہیں بلکہ کچھ آلو ہوں سوپ ہو، گوشت ہو۔ یعنی متوازن کھانا ہو تو ہماری بھوک مٹ سکتی ہے اور ہمیں کھانے کا صحیح لطف آئے گا۔

ہم کتنی دیر بھوکے رہ سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ تو آپ کو رمضان میں ہو گیا ہوگا۔ ایک بہت صحت مند شخص بہت دنوں تک بھوکا رہ سکتا ہے۔ کیونکہ اس کے جسم میں پروٹین جمع رہتی ہے جو اس کا جسم آہستہ آہستہ خرچ کرتا ہے دنیا میں سب سے زیادہ بھوکے رہنے کا ریکارڈ کہا جاتا ہے کہ جنوبی افریقہ کی ایک عورت کا ہے جس کا دعویٰ ہے کہ اُس نے ایک سو دو روز تک کچھ نہیں کھایا بلکہ صرف پانی اور سوڈا واٹر پیتی رہی۔

اب یہ سوال کہ پیاس کیسے لگتی ہے۔ جب ہمیں پیاس محسوس ہوتی ہے تو ہم کچھ پینا چاہتے ہیں لیکن اگر ہمیں پینے کو کچھ نہ ملے تو ہم کیا کریں گے کہا جاتا ہے کہ ایک انسان کو اگر تین ہفتے تک پانی نہ ملے تو وہ مر جاتا ہے۔ ہمارے جسم کو پانی فراہمی کی سخت ضرورت ہوتی ہے کیونکہ ہمارے جسم میں پچاس فیصد وزن صرف پانی کا ہوتا ہے۔ اور ایک بڑا آدمی روزانہ اپنے جسم سے تقریباً ایک لیٹر پانی ضائع کرتا ہے اسی طرح ہم پانی پئیں یا نہ پئیں ہمارا جسم اپنی غذا سے ایک لیٹر پانی حاصل کر لیتا ہے۔

لیکن غذا کو ہضم کرنے کے لئے معدے کو بھی پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس طریقے سے جسم کے پانی کی ضرورت

کا نظام صحیح طور سے برقرار نہیں رہ سکتا۔ پیاس اس بات کی علامت ہوتی ہے کہ ہمارے جسم کو مزید پانی کی ضرورت ہے۔
حلق اور منہ کے خشک ہونے کی وجہ صرف پیاس نہیں ہوتی۔ منہ خشک ہونے کی کئی اور وجوہات بھی ہیں ان میں گھبراہٹ، ورزش اور تھوک کا کم بننا۔

تھوک کم بننے کا علاج تو یہ ہے کہ لیموں کا شربت پیا جائے، تو تھوک معمول کے مطابق بننے لگے گا۔ بعض اوقات نمکین چیزیں کھانے کے بعد پیاس تیزی سے لگنے لگتی ہے اور بعض اوقات جسم کے اندر نمک کے اجزاء کی تبدیلیوں کی وجہ بھی پیاس لگنے لگتی ہے۔

ہمارے خون میں پانی کی مناسب مقدار ہوتی ہے۔ جب اس میں نمک کی مقدار بڑھائی جاتی ہے تو ہمارے خون کو پانی کی مزید ضرورت ہوتی ہے اور ہمارے دماغ کا مرکز پیاس بتاتا ہے کہ جسم میں نمک کی مقدار بڑھ گئی ہے پانی کی ضرورت ہے یہ پیغام حلق تک پہنچتا ہے۔ اور حلق میں پیاس لگنا شروع ہو جاتی ہے۔

- انکل تانبا کیا ہوتا ہے۔ ؟

(اُسامہ، سہراب گوٹھ)

بھئی تانبا ایک سرخی مائل بھوری دھات ہے جو آسانی سے دوسری دھاتوں کے ساتھ مل جاتی ہے اس کو ٹن کے ساتھ ملا کر کانسی کی دھات بناتے ہیں۔ اور زنک کے ساتھ ملا کر پیتل بناتے ہیں۔ اس کو لوہے کی طرح زنگ نہیں لگتا اس کو بوائلرز میں پائپوں میں ٹینکوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے آباؤ اجداد نے کانسی تیار کرنے کا طریقہ تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح دریافت کر لیا تھا۔

مختصر جوابات

- کیا کسی اور ستارے پر بھی مخلوق دریافت کی گئی ہے۔

(سعدیہ یونس مردان)

- انکل کیا زمین کے علاوہ اور ستاروں میں بھی زندگی پائی جاتی ہے۔

(محمد شاہد فیروز گوجرانوالہ)

اب تک تو زمین کے علاوہ دوسرے ستارے پر کسی مخلوق یا زندگی کے آثار نہیں ملے ہیں۔ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ صرف زمین پر ہی زندگی کے لیئے موزوں ہے۔

برگد کا درخت

محمد عمر احمد خان

سرد اور تیز ہوا چل رہی تھی، درختوں کے خشک اور زرد پتے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہے تھے، ہوا انہیں اُڑا کر دور لے جا رہی تھی۔

سر سلمان تیسری جماعت کو سائنس کا سبق پڑھا رہے تھے۔ سبق کا موضوع تھا "جانوروں کی کھال" سر سلمان بچوں کو سمجھا رہے تھے کہ "جانوروں کی کھال ان کے ماحول کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ ایک طرف جہاں



انہیں گرمی و سردی سے بچاتی ہے وہیں دشمنوں سے بھی محفوظ رکھتی ہے۔ مثلاً ہرن کی دھبے دار بھورے رنگ کی کھال اسے بھوری جھاڑیوں میں گڈمڈ کر دیتی ہے اس لئے وہ آسانی سے دکھائی نہیں دیتا۔ بالکل اسی طرح برفانی ریچھ کی سفید کھال کا رنگ برف میں مل جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ آسانی سے پہچانا نہیں جا سکتا۔"

یہاں تک پہنچ کر سر سلمان کچھ دیر کے لئے رُکے پھر انہوں نے اپنے بیگ سے کھال والے مختلف جانوروں کے ماڈل نکالے۔ اس کے بعد انہوں نے جانوروں کے ماڈل دکھا کر ——— مختلف سوالات کئے۔ بچے سبق میں پوری دلچسپی لے رہے تھے۔ سر سلمان نے آخر میں بچوں سے یہ سوال پوچھا۔

" اچھا یہ بتایئے! جانوروں کی کھال انسان کے کس کام آتی ہے یا دوسرے لفظوں میں یہ بتائیں کہ جانوروں کی کھال سے انسان کو کیا فائدے ہوتے ہیں؟"

سر سلمان کا یہ سوال سُن کر کلاس میں مکمل خاموشی چھا گئی۔ بہت سے لڑکوں کو شاید اس سوال کا جواب نہیں آتا تھا۔ جن کو آتا تھا انہوں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

سر نے شہباز سے کہا

" آپ بتایئے!"

شہباز نے کھڑے ہو کر سوال کا جواب دیا " جانوروں کی کھال سے انسان بہت سے فائدے حاصل کرتا ہے۔ یہ انسان کے بہت سے کام آتی ہے۔ جانوروں کی کھال سے جوتے، ہاتھوں کے دستانے، مونڈھے، جیکٹس کمبل، بریف کیس اور چمڑے وغیرہ کا بہت سا سامان بنتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈھول ڈرم اور دوسری کئی چیزوں میں بھی جانوروں کی کھال استعمال ہوتی ہے۔"

شہباز نے مکمل جواب دے دیا تو سر سلمان نے اُسے شاباش دی پھر انہوں نے شہباز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ شہباز اپنی جگہ پر بیٹھ گیا تو سلمان صاحب نے جانوروں کی کھال کے بارے میں مختصر سا لیکچر دیا۔ لیکچر کے ختم ہوتے ہی سر سلمان بولے۔

" کل تمام لڑکے جانوروں کی کھال کے فوائد پر دس دس جملے لکھ کر لائیں گے۔"

سلمان صاحب نے بچوں کو گھر کا کام دیا ہی تھا کہ چھٹی کی گھنٹی بج اٹھی۔

ٹن ٹن ٹن ..... ٹن ٹن ٹن .....

کلاس کے تمام بچے قطار بنا کر باہر جانے لگے۔ سلمان صاحب نے دیکھا شہباز سب سے پیچھے تھا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا پھر کچھ دیر بعد انہوں نے اسے املی کے بڑے برگد کے درخت کے پاس کھڑا دیکھا۔ وہ آہستہ آہستہ

اس کے تنے کو تھپتھپا رہا تھا۔ بڑی محبت سے تنے پر ہاتھ پھیر رہا تھا، حالانکہ اس وقت برگد کا درخت خزاں کے موسم کی وجہ سے ٹنڈ منڈ ہو رہا تھا اور دیکھنے میں بالکل گنجا لگ رہا تھا شہباز کافی دیر تک برگد کے درخت کے پاس کھڑا رہا جب تمام لڑکے اسکول سے باہر چلے گئے تو وہ بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا اسکول سے باہر نکل گیا۔

سر سلمان نے تعجب سے اپنے دونوں شانے اُچکائے۔ شہباز کی بہت سی حرکتیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں یہ حرکت بھی ان کی سمجھ میں نہ آسکی تھی اس لئے وہ مجبوراً شانے ہلانے کے علاوہ کچھ نہ کر سکے۔

دوسرے دن ہاف ٹائم کے بعد والا پیریڈ خالی تھا۔ سلمان صاحب کلاس میں پہنچے تو تمام لڑکے کھڑے ہو گئے۔

"بیٹھ جائیے!" سر سلمان نے لڑکوں کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تمام بچے اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو سلمان صاحب بولے: "یہ پیریڈ خالی ہے اس پیریڈ میں ہم کچھ نہیں پڑھیں گے بلکہ میں آپ لوگوں سے کچھ باتیں کروں گا۔" سر سلمان کی یہ بات سن کر تمام بچوں کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ بچوں کا خیال تھا کہ سر سلمان آج انہیں کوئی دلچسپ سا قصہ یا کہانی سنائیں گے کیونکہ سلمان صاحب اکثر خالی پیریڈ میں بچوں کو تازہ دم رہنے کے لئے کوئی دلچسپ سا واقعہ یا پھر کوئی سبق آموز قصہ سنایا کرتے تھے۔

بچوں کو اپنی طرف متوجہ پاکر سلمان صاحب بولے۔

"آج میں آپ لوگوں کو کوئی کہانی یا قصہ وغیرہ نہیں سناؤں گا بلکہ آج اس خالی پیریڈ میں آپ لوگوں سے آپ کے ارادے معلوم کروں گا کہ آپ لوگ پڑھ لکھ کر کیا بنیں گے؟"

سر سلمان کی یہ بات سن کر کلاس میں ایک لمحے کے لئے خاموشی چھا گئی۔ سلمان صاحب نے کلاس پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی۔ تمام بچوں کے چہرے جوش سے سرخ ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ جو بننا چاہتے ہوں بن گئے ہوں لیکن ابھی وہ تصور ہی تصور میں کچھ بن رہے تھے۔ اپنے ارادوں کو عملی جامہ پہنا رہے تھے۔ سلمان صاحب نے کلاس کے پہلے لڑکے سے سوال کیا "کمال، تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہتے ہو؟" کمال نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔ "سر! میں پڑھ لکھ کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں۔ تاکہ دکھی انسانیت کی خدمت کر سکوں۔" "شاباش! ماشاء اللہ بہت نیک ارادے ہیں" سلمان صاحب بولے۔ پھر انہوں نے یہی سوال کلاس کے تمام بچوں سے کیا۔ سب کے ارادوں میں ان کے پرعزم مستقبل کی جھلک نظر آتی تھی۔ کوئی انجینئر بننا چاہتا تھا، کوئی پائلٹ، کوئی استاد کوئی وکیل، کوئی ادیب تو کوئی شاعر۔ کچھ بچے سائنسدان بن کر ملک و قوم کے لئے قابل قدر کارنامے سرانجام دینا چاہتے تھے۔ کلاس کے ایک ننھے سے بچے کو شاید بڑا ہونے کے بعد دولہا بننے کا تصور تھا اس نے سلمان صاحب کے سوال کے جواب میں بڑی معصومیت سے تتلاتے ہوئے کہا:

"تل میں بلا ہوتل دولا بنوں دا" (سر میں بڑا ہو کر دولہا بنوں گا!)

کلاس کے تمام بچے اپنے ارادوں کا اظہار کر چکے تھے لیکن ایک لڑکا ابھی باقی تھا کلاس کا سب سے ذہین اور لائق شاگرد شہباز سلمان صاحب نے سب سے آخر میں اس سے پوچھا۔ شہباز تم بڑے ہو کر کیا بننا چاہو گے۔

"سر میں بڑا ہو کر برگد کا درخت بننا چاہتا ہوں۔

شہباز کا یہ جواب سن کر پوری کلاس ہنس پڑی۔ سر سلمان بھی ایک لمحے کو چونک گئے۔ شہباز ہمیشہ چونکا دینے والی باتیں کیا کرتا تھا۔ کلاس میں چہ مگوئیاں ہونے لگیں۔ لڑکے اسے حیرانی سے اس طرح تک رہے تھے جیسے اس کی شاخیں نکل آئی ہوں وہ واقعی برگد کا درخت بن گیا ہو۔ سلمان صاحب نے کلاس کی کھلی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برگد کا درخت سردی میں ٹنڈ منڈ خاموش کھڑا تھا۔ کلاس کے ایک شریر لڑکے نے کھڑکی سے باہر جھانک کر درخت کا بغور جائزہ لیا پھر اس نے سوالیہ انداز میں شہباز سے کہا: "کیا واقعی تم برگد کا درخت بننا چاہتے ہو جو خزاں کے موسم میں بالکل ٹنڈ منڈ ہو جاتا ہے جس کا ایک پتہ بھی شاخ پر باقی نہیں رہتا؟" اس شریر لڑکے کی بات سن کر شہباز بولا: خزاں کا موسم تو انسان پر بھی آتا ہے لیکن یہ اس کے حوصلے کو آزمانے کے لئے ہوتا ہے جس طرح مصیبت کے بعد راحت آتی ہے اسی طرح خزاں کے بعد بہار کا موسم بھی آتا ہے۔ نئے پتے نئے جذبے، نئی امنگیں اور نئے حوصلے ——— درخت کو کبھی ٹنڈ منڈ نہیں رہنے دیتے"

"لیکن تم برگد کا درخت کیوں بننا چاہتے ہو؟" ایک دوسرے لڑکے نے سوال کیا۔ شہباز آہستہ آہستہ بولا: میں برگد کا درخت اس لئے بننا چاہتا ہوں کہ برگد کا درخت خود تکلیف اٹھا کر تیز دھوپ اور بارش سے لوگوں کو بچاتا ہے جو لوگوں کو ٹھنڈی ہوا دیتا ہے ان کے سروں پر اپنا سایہ رکھتا ہے" شہباز ایک لمحے کو خاموش ہوا پھر دوسرے ہی لمحے اس نے ہاتھ ہلا کر بڑے جوش بھرے لہجے میں کہا: "میں بڑا ہو کر بالکل برگد کے درخت کی مانند ہی بننا چاہتا ہوں جو خود تکلیف اٹھا کر لوگوں کو سکھ پہنچاتا ہے"

شہباز کی بہت سی باتیں سلمان صاحب کی سمجھ میں نہیں آتی تھیں لیکن آج کی بات ان کے دل میں اتر گئی تھی۔ سلمان صاحب نے بڑے فخر سے شہباز کی طرف دیکھا پھر انہوں نے لڑکوں سے کہا "جس طرح برگد کا درخت خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو سکون بخشتا ہے بالکل اسی طرح کا سکھ و آرام ہم دوسرے لوگوں کو بھی پہنچا سکتے ہیں۔

"سر سلمان صاحب کو یوں محسوس ہوا جیسے سب لڑکے درخت بن گئے ہوں برگد کا درخت۔ خدمت و ایثار کا نشان۔

صدف حسنین کاظمی

وہ جو آج بھی زندہ ہیں

جب چنگاری شعلہ بنی ...

ہر روز کی طرح وہ آج بھی شکار کے لئے نکلا تھا۔ صحرا میں گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے سارا دن گزر گیا تھا۔ لیکن وہ جہاں سے گزرتا لوگ اسے دیکھتے رہ جاتے۔ اونچا قد، سرخ و سفید رنگت، روشن آنکھیں، مضبوط جسم، وہ ایسا حسین جوان تھا۔ لوگ ایک بار تو ضرور پلٹ کر دیکھنے پر مجبور ہوتے۔ کہ اس سرزمین پر ایسے جوان کم کم ہی دکھائی دیتے ہیں۔

یہ تو اس کا روز کا مشغلہ تھا کہ تیر کمان کندھے پر ڈالے گھوڑے کی لگام ہاتھ میں لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ، اور کبھی تنہا۔ صحرا کی کھلی فضا میں نکل جاتا۔ کھجوروں کے جھنڈ لہرا لہرا کر اسے خوش آمدید کہتے۔ ریت کے بگولے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیتے۔ صحرا کی ریت کے لہریئے۔ گویا اس کے لئے راستوں کا نشان بن جاتے۔ چاند سورج گویا اس کا راستہ ہی دیکھتے تھے۔ اور قبیلے کے لوگ اس پر فخر کرتے تھے تو کچھ بے جا نہیں تھا۔ آخر کو وہ سب سے بڑے اور معزز قبیلے کے سردار کا نور نظر اور لختِ جگر تھا اور کوئی تعجب نہ تھا کہ مستقبل میں وہ قبیلے کا سردار ہوتا۔ لیکن قدرت نے اسے کسی اور ہی سرداری کے لئے پیدا کیا تھا۔ وہ اپنے بہن بھائیوں میں اکیلا تو نہ تھا لیکن اس کا اپنا ایک مقام تھا ایک حیثیت تھی۔ اور بوڑھے سردار کا چہیتا فرزند بھی تو تھا۔ ساتھ ہی اسے ایک اور منصب بھی ملنے والا تھا۔ جس کے لئے زمین و آسمان جانے کب سے منتظر تھے۔

اور وہ دن ہر گذرنے والے دن کے ساتھ ساتھ آہستہ آہستہ قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ صحرا کی ریت۔ ریت کے بگولے۔ چٹانیں۔ کھجوروں کے جھنڈ، چشمے، نخلستان، سب کے سب۔ اس کے منتظر تھے۔ صحرا میں چاند طلوع ہونے والا تھا۔ اور صحرا میں ابھرتا چاند۔ کتنا روشن نظر آتا ہے۔ اور پھر تاریکی چھٹنے لگی اور رات نے پر سمیٹنے شروع کئے چاند طلوع ہوا اور اس کی روشنی سارے عالم پر پھیلتی چلی گئی۔ سورج نے دنیا کو روشن کر دیا۔ اور روشنی نے اس کی آنکھوں کو بھی چوما تھا! —— اس روز۔

دن بھر شکار کے پیچھے گھوڑا دوڑانے کے بعد وہ گھر لوٹ رہا تھا۔ گھر سے کچھ فاصلے پر ایک عورت مل گئی۔ اس نے آواز دی۔ ابو عمارہ"!

ابو عمارہ نے گھوڑا روک لیا۔ اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ کیا بات ہے"؟۔ ابو عمارہ! تم نے سنا تمہارے بھتیجے کو آج پھر گالیاں دی گئی ہیں! اور بُرا بھلا کہا گیا ہے"!

کیا یہ صحیح ہے؟ خوبصورت ابو عمارہ نے غصّے سے پوچھا۔

"ہاں، ہاں"! عورت نے اس وجیہہ جوان کے غصّے سے کچھ ڈرتے ہوئے کہا۔

آخر کو وہ سردار کا بیٹا بھی تو تھا۔

"اچھا"! ابو عمارہ نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی "آج دیکھتا ہوں ایسا کرنے والا میرے ہاتھ سے کیسے بچتا ہے"!

خانہ کعبہ میں حسب معمول چند قریشی بیٹھے بحث میں مصروف تھے۔ کہ ایک شخص خانہ کعبہ میں آیا۔ دُبلا پتلا، زرد چہرہ، اور بے ہنگم سا حلیہ۔ اس نے باتیں سنیں تو غصے میں آکر کہا۔ میں جاتا ہوں اور محمدؐ کو دو چار سنا کر آتا ہوں۔ وہ گیا اور شانِ رسالتؐ میں گستاخی کر کے لوٹ آیا۔ اور واپس آکر مزے لے لے کر اپنا کارنامہ قریشیوں کو سنایا۔ کچھ نے دبی زبان میں تعریف کی اور کچھ دل میں ڈرے کہ معلوم نہیں کہ اب کیا ہوگا۔ کہ محمدؐ کا خاندان بھی تو قبیلے کے سردار کا خاندان تھا۔ قبیلہ بھی وہ جو پورے حجاز کا سب سے معزز قبیلہ تھا۔ اس لئے کہ اسے مقدس کعبہ کی حفاظت و نگرانی کا شرف حاصل تھا۔

اس روز شام کا ذکر ہے۔

ایک گورا چٹا، لمبا تڑنگا، مضبوط جسم کا جوان کندھے پر تیر کمان ڈالے، تیز قدم اٹھاتا۔ خانہ کعبہ میں داخل ہوا۔ جہاں حسبِ معمول قریشی جمع تھے اور ان کے درمیان وہی بدشکل شخص تھا۔ اس شیر کو آتے دیکھ کر سبھی ٹھٹھر کر رہ گئے۔ وہ جوان سیدھا اس شخص کی طرف بڑھا، کندھے سے کمان اتاری اور اس زور سے اس کے سر پر ماری کہ اس کا سر پھٹ گیا اور خون بہنے لگا۔

پھر وہ جوان شیر کی طرح دہاڑا۔ سن ابوالحکم۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ محمدؐ بن عبداللہ بے سہارا ہے۔ اور کیا تو نے سمجھ لیا ہے کہ بنو ہاشم سارے کے سارے مر گئے ہیں"!

ابوالحکم کے ساتھی یہ سن کر آپے سے باہر ہو گئے لیکن اس نے اپنے ساتھیوں کو یہ کہہ کر روک دیا کہ اسے کچھ نہ کہو۔ کیونکہ آج میں نے بھی اس کے بھتیجے کو گالیاں دی ہیں"؟۔

وہ جوان سیدھا اس ہستیؐ کے حضور پہنچا جس کی حمایت میں اس نے یہ جنگ کی تھی۔ اور ان کے

سامنے سارا واقعہ عرض کیا۔ نبی آخر الزمانؐ نے فرمایا۔ چچا جان۔ میں تو اس وقت خوش ہونگا جب آپؓ بھی اس دین میں داخل ہو جائیں گے۔ جس کو میں لے کر آیا ہوں ؟

اس کے ساتھ ہی بنو ہاشم کے ایک اور شیر جوان کو اسلام کے دائرے میں داخل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ابو عمارہ۔ جن کو ہم آپ حضرت امیر حمزہؓ کے نام سے جانتے ہیں۔

آپ کا اصل نام حمزہ بن عبد المطلب اور کنیت یعنی دوسرا نام ابو عمارہ ہے۔ آپؓ حضور اکرمؐ سے صرف دو سال بڑے تھے آپؓ کی والدہ حضرت ہالہ بنت وہبؓ نبی کریمؐ کی والدہ ماجدہ حضرت آمنہؓ کی چچا زاد بہن تھیں۔ اور آپؓ نبی کریمؐ کے دودھ شریک بھائی بھی تھے اس طرح آپؓ کے حضورؐ سے تین رشتے ہوتے ہیں۔ ایک آپؐ کے چچا ہیں دوسرے ننھیال کی طرف سے بھائی ہوتے ہیں اور رضاعی بھائی ہونے کا تیسرا رشتہ بھی ہے۔ اس پر صحابیؓ ہونے کا مزید شرف و اعزاز حاصل ہے۔

آپؓ صرف دس سال کے تھے کہ آپؓ کے والد حضرت عبد المطلب انتقال کر گئے۔ اس کے بعد آپؓ کی پرورش ننھیال میں ہوئی۔ آپؓ بچپن ہی سے شہہ زور اور بہادر تھے۔ شجاعت و دلیری، مہم جوئی میں آپؓ کا ثانی نہ تھا۔ تیر کمان، نیزہ بازی گھڑ سواری (شہسواری) میں آپؓ اپنی مثال آپ تھے۔ بنو ہاشم میں ایسے جوان چند ایک ہی ملتے ہیں۔ اسلام لانے سے پہلے بھی آپؓ کو نبی کریمؐ سے بہت محبت تھی۔ اس محبت کا نتیجہ ہے کہ ابھی آپؓ باقاعدہ اسلام بھی نہ لائے تھے کہ داعی اسلام کی حمایت پر ابو الحکم کو لہو لہان کر دیا۔ یہ ابو الحکم کون ہے۔ جی ہاں یہ وہی ہے جس کو آپ ابو جہل کے نام سے جانتے ہیں۔

اس لئے نبی کریمؐ بھی آپ سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے اور آپ کو بہت عزیز رکھتے تھے اکثر جہاد کے مواقع پر آپؐ کو بھیجتے رہے ۳ھ میں غزوۂ احد کے موقع پر آپؓ کی شمشیر آبدار اپنے جوہر دکھا رہی تھی کہ ایک حبشی غلام نے آپؓ کو نیزہ مار کر شہید کر دیا۔ آپؓ کی شہادت کے بعد ایک عورت نے آپؓ کا کلیجہ نکال کر چبا لیا یوں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اور اس جہاد میں شہادت سے سرفراز ہونے والا۔ شیر جوان۔ سید الشہداء، سیدنا امیر حمزہؓ کے لقب سے سرفراز ہوا۔ آج ابو جہل کا نام لینے والا کوئی نہیں۔ لیکن حمزہؓ بن عبد المطلب ہر صاحب ایمان کے دل کی دھڑکنوں میں زندہ ہیں اور جب تک اس دنیا میں ایک بھی مسلمان زندہ ہے۔ ابو عمارہ زندہ رہیں گے زندہ رہیں گے۔

ٹرانزسٹر ٹارچ اور کھلونوں کیلئے بہترین

الہ دین بیٹری سیل



زیادہ قوت ۔ زیادہ دیرپا

مکمل طور پر قابلِ اعتماد - لیک پروف

086.MIL 5

PARAGON



لٹّو اپنا چلتا جائے

ابن آدم پسروری

بولو تم تو سنتا جائے
ہنسو اگر تو ہنستا جائے
محور خوب بدلتا جائے
لٹّو اپنا چلتا جائے

دیکھو! اِس کے کتنے رنگ
دیکھو! اِس کے کتنے ڈھنگ
رنگوں میں یہ ڈھلتا جائے
لٹّو اپنا چلتا جائے

پہلے پڑھنا پھر یہ کھیل
کھیلوں سے ہو کم ہی میل
بچّوں کو یہ کہتا جائے
لٹّو اپنا چلتا جائے

PRESTO
FREEZER & BOTTLE COOLER

PRESTO

پریسٹو
فریزرز

جدید مشینری و انسولیشن کی بدولت
سب سے زیادہ ٹھنڈک اور 30% بجلی کی بچت

اس کے علاوہ مزید خصوصیات جو صرف پریسٹو فریزرز کو حاصل ہیں

- جدید انسولیشن
- پولی کوٹڈ باسکٹ
- پلاسٹک پارٹیشن
- فریزر کو صاف کرنے کیلئے ڈرین سسٹم
- ہائی وینائل کوٹڈ ڈھکن
- عمدہ کوالٹی کے مضبوط وھیل اور مناسب قیمت

نیا ماڈل
SD

قریبی ڈیلر سے پریسٹو فریزر ہی طلب کریں



سلیم سنز

لاہور فون: 854632/851371/858566
TELEGRAM: PRESTO TELEX: 44218 PRSTO PK
Z-68 کے۔سی۔ایچ۔ایس۔ڈاکٹر محمود حسین روڈ۔کراچی۔5 فون: 445290

چھوٹی عمر کے بچوں کے لئے

ایک خوبصورت چینی کہانی

محنت کا پھل

چھینگ شوئی ندی کے پاس ایک گاؤں میں ایک بوڑھا بڑھئی رہتا تھا۔ جس کا نام "لو" تھا۔ اُس کے تین بیٹے تھے۔

لو اپنے فن سے مطمئن نہ تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے بیٹوں کو بھی کچھ سکھایا تاہم اس نے کفایت سے کام لے کر تین سو اونس چاندی بچا رکھی تھی اور تین تیز



رفتار گھوڑے خرید لئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ تینوں بیٹے ایک کاریگر بڑھئی سے یہ فن سیکھیں۔

بڑا بیٹا لوشوان اور منجھلا بیٹا لوپین بڑے کاہل اور سست تھے۔ مگر چھوٹا بیٹا لوپان بچپن ہی سے محنتی اور علم کا شوقین تھا۔ وہ چھوٹے موٹے کاموں میں باپ کا ہاتھ بٹاتا اور خود ہی کام سیکھنے کی کوشش کرتا رہتا تھا۔

دس سال کی عمر میں اسے تقریباً سارے اوزار چلانے آ گئے۔ وہ دن بھر کام میں لگا رہتا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس نے بہت ساری الماریاں، اسٹول اور چھوٹی چھوٹی گاڑیاں بنا ڈالیں۔

ایک دن اس نے ماں کو چارپائی پر بیٹھ کر بڑی مشکل سے سوت کاتتے دیکھا تو بید کا درخت کاٹ لایا اور ایک کرسی بنا کر ماں سے کہا: "امی، اس کرسی پر بیٹھ کر سوت کاتیے تاکہ کمر میں درد نہ ہو۔"

پھر ایک دن اس نے دیکھا کہ بڑی بہن کے پاس سوئی دھاگہ رکھنے کو کچھ نہیں تو ایک اور درخت کاٹ لایا اور ایک صندوقچی بنا کر بہن سے کہا: "آپا، اپنا سوئی دھاگہ اس صندوقچی میں رکھئے تاکہ یہ چیزیں کھو نہ جائیں۔"

ایک روز بڑھئی نے بڑے بیٹے لوشوان سے کہا: "بیٹے تم اب جوان ہو گئے ہو۔ میرے سائے میں تو ساری زندگی نہیں گزار سکتے۔ یہ سو اونس چاندی لو اور گھوڑے پر سوار ہو کر جنوبی پہاڑ پر چلے جاؤ۔ وہاں ایک بزرگ بڑھئی رہتا ہے۔ اس سے جا کر کام سیکھو۔"

لوشوان نے دل میں سوچا: "جنوبی پہاڑ تو بہت دور ہے۔ بزرگ استاد پتہ نہیں کہاں ملے گا۔" وہ تین برس تک گھوڑے پر آوارہ گردی کرتا رہا اور ساری چاندی خرچ کر ڈالی۔

آخر میں اُس نے گھوڑا بھی بیچ دیا اور خالی ہاتھ گھر لوٹ آیا۔ یہ دیکھ کر بوڑھا بڑھئی آگ بگولا ہو گیا اور اسے گھر سے نکال دیا۔

اب اس نے منجھلے بیٹے لوپین کو چاندی اور گھوڑا دے کر اسی پہاڑ پر جانے کو کہا۔ منجھلا بیٹا بڑی بے دلی سے سفر پر روانہ ہو گیا۔

لوپین نے سن رکھا تھا کہ پہاڑ ہزاروں کوس دور ہے، چنانچہ چند روز بعد ہی حوصلہ ہار بیٹھا اور گھوڑے پر بے مقصد گھومتا رہا۔ ہوتے ہوتے ساری چاندی خرچ ہوگئی۔ اب وہ گھر کس منہ سے جاتا؟

آخر میں بڑھئی نے لوپان کو بلایا اور کہنے لگا: "اچھے بیٹے، تمہارے دونوں بھائی نکمّے نکلے۔ اب میری ساری امیدیں تم سے وابستہ ہیں۔" لوپان نے جواب دیا: "ابّا جان، اطمینان رکھئے۔ اگر مجھے بزرگ استاد نہ ملے اور میں کاریگر نہ بن سکا تو آپ کو منہ نہیں دکھاؤں گا۔"

اس نے ماں باپ سے رخصت لی۔ اور مغرب کی سمت روانہ ہوگیا ــــ چل، چلا چل! دس دن تک وہ مسلسل سفر کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک اونچا پہاڑ سامنے آگیا۔

آگے راستہ خطرناک اور دشوار تھا۔ وہ ابھی کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک بڈھا لکڑہارا آتا دکھائی دیا۔ لوپان نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس سے پوچھا: "دادا میاں، جنوبی پہاڑ یہاں سے کتنی دور ہے؟"

لکڑہارے نے جواب دیا: "بھئی، سیدھے راستے جاؤ تو دو ہزار کوس۔ چکر لگا کر جاؤ تو چار ہزار کوس۔ نوجوان، اگر مختصر راستہ اختیار کرنا ہے تو یہ پہاڑ عبور کرنا پڑے گا۔ سفر بڑا مشکل ہے!" لوپان نے پہاڑ سر کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تو لکڑہارا اس کی ہمت پر عش عش کر اٹھا اور اسے ایک درانتی دے دی۔

لوپان نے بوڑھے کا شکریہ ادا کیا اور پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ درانتی سے اس نے راہ میں آنے والی ساری خاردار جھاڑیاں کاٹ ڈالیں اور نوکیلے پتھر ہٹا دیئے اور آخر کار چوٹی پر جا پہنچا۔

پہاڑ عبور کرنے کے بعد وہ مسلسل دس دن تک مغرب کی جانب چلتا رہا اور ایک ہزار کوس کا فاصلہ طے کرلیا۔ اب ایک بہت بڑا دریا سامنے آگیا جس کا پانی گہرا کالا تھا۔ اور اونچی اونچی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ لوپان دریا پار کرنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ دوسرے کنارے سے ایک کشتی آتی دکھائی دی۔

لوپان نے ملّاح سے جنوبی پہاڑ کا راستہ پوچھا تو ملاح نے انگلیوں پر کچھ گنتے ہوئے بتایا: "ابھی بہت دور ہے۔ سیدھے جاؤ تو ایک ہزار کوس۔ چکر لگا کر جاؤ تو دو ہزار

کوس۔ سیدھے جانے کی صورت میں یہ دریا پار کرنا پڑے گا۔ مگر یہ بہت بھیانک دریا ہے اس میں اترنے والے جانے کتنے ہی مسافر موت کا شکار ہو چکے ہیں!"

لوپان نے جواب دیا: "نہ گہرائی مجھے خوفزدہ کر سکتی ہے اور نہ غضبناک موجیں ہی ڈرا سکتی ہیں۔ دریا عبور کئے بنا ہرگز واپس نہ جاؤں گا۔!" ملاح نے دیکھا کہ وہ دھن کا پکا ہے، تو کہنے لگا۔ "بھائی، تو پھر گھوڑا لے کر کشتی پر سوار ہو جاؤ! میں تمہیں اُس پار پہنچا دیتا ہوں۔"

دوسرے کنارے پر پہنچ کر اس نے ملاح کو خدا حافظ کہا اور پھر مسلسل دس دن تک سرپٹ گھوڑا دوڑاتا رہا اور ایک ہزار کوس کا سفر طے کر لیا۔ اب ایک اور پہاڑ سامنے آگیا۔ اس نے سوچا: "غالباً یہی جنوبی پہاڑ ہے۔"

پہاڑ کے دامن میں ایک جھونپڑا تھا اور باہر ایک بوڑھی عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑے ادب کے ساتھ بڑی بی سے پوچھا تو اس نے جواب دیا: "ہاں، یہی جنوبی پہاڑ ہے۔ اس پہاڑ پر چڑھنے کے لئے نو سو ننانوے پگ ڈنڈیاں ہیں۔"

لوپان فوراً ایک پگ ڈنڈی پر ہو لیا۔ چلتے چلتے وہ درختوں کے جھنڈ میں جا پہنچا جہاں ایک مکان بنا ہوا تھا۔

لوپان نے دروازہ کھٹکھٹایا تو کوئی جواب نہ ملا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو اِدھر اُدھر بڑھئی کے اوزار بکھرے پڑے تھے اور ایک چارپائی پر ایک سفید ریش بوڑھا زور زور سے خراٹے لے رہا تھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ وہ وہی بزرگ بڑھئی تھا۔ تو خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

اس نے کوئی آہٹ کئے بغیر سارے اوزار لکڑی کے ایک صندوق میں رکھے اور پھر بڑے ادب سے اسٹول پر بیٹھ کر بوڑھے کے جاگنے کا انتظار کرنے لگا۔

بوڑھے نے کئی بار کروٹ بدلی اور آخر غروب آفتاب کے وقت اٹھ بیٹھا۔ لوپان نے دوزانو ہو کر کہا: "میں ہزاروں کوس کا سفر کر کے یہاں آیا ہوں، مجھے اپنی شاگردی میں لے لیجئے۔"

بوڑھے نے کچھ سوچنے کے بعد جواب دیا: "اچھا! میں تمہارا امتحان لوں گا۔ اگر کامیاب رہے تو شاگرد بنا لوں گا، ورنہ جس طرح آئے ہو اسی طرح واپس لوٹ جانا۔" یہ کہہ کر وہ

لوپان کو کمرے سے باہر لے گیا اور پوچھا: "تین کمروں کا عام مکان بنانے کے لئے کتنی لکڑی درکار ہوتی ہے؟"

لوپان نے صحیح صحیح جواب دیا۔ اس پر بزرگ نے دوسرا سوال کیا: "ایک آدمی ایک کام تین ماہ میں سیکھ لیتا ہے اور دوسرا تین برس لگا دیتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟" لوپان نے جواب دیا: "اگر محض آنکھ سے دیکھ کر سیکھا جائے تو تین ماہ کافی ہوتے ہیں، اور اگر دل سے سیکھا جائے تو تین برس لگتے ہیں۔"

بوڑھے نے سر ہلاتے ہوئے تیسرا سوال پوچھا: "ایک استاد نے دو شاگردوں کو تربیت دی۔ ایک نے اپنے اوزاروں سے سونے کا پہاڑ کمایا اور دوسرے نے لوگوں کے دلوں پر اپنا نام ثبت کیا۔ تم کس کے نقش قدم پر چلو گے؟" لوپان نے بلا جھجک کہا: "میں دوسرے کے نقش قدم پر چلوں گا۔"

بوڑھا بے حد خوش ہوا اور لوپان سے کہا: "تمہیں اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے لئے میرے اوزار استعمال کرنے ہوں گے۔ مگر میں نے ان چیزوں کو پورے پانچ سو سال نہیں چھوا!" لوپان نے اوزار نکال کر دیکھے تو کلہاڑی کی دھار کند ہو چکی تھی، آری کے دندانے بالکل غائب تھے اور دو چھینیاں تڑمڑ چکی تھیں۔ سارے اوزار زنگ آلود تھے۔

اس نے آستین چڑھائی اور اوزار تیز کرنے لگا۔ وہ سات دن اور سات راتیں لگاتار کام کرتا رہا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سارے اوزار چمک اٹھے۔

لوپان نے اوزار بوڑھے کو دکھائے تو اس نے تعریف کے طور پر سر ہلا دیا اور تھوڑی دیر بعد کہا: "اب اس آری سے دروازے کے سامنے والا پانچ سو سال پرانا درخت کاٹو۔"

لوپان کام میں مشغول ہو گیا۔ درخت اتنا بڑا تھا کہ اسے کاٹنے میں پورے بارہ دن اور بارہ راتیں لگ گئیں۔

درخت کٹ کر گرا تو بوڑھے نے حکم دیا: "کلہاڑی سے اس درخت کو ایسے شہتیر میں بدل دو جو بالکل چکنا اور چودھویں کے چاند کی طرح گول ہو۔"

لوپان نے یہ مہم بھی سر کر لی تو بوڑھا کہنے لگا: "بھئی، کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس

شتہیر میں دو ہزار چار سو سوراخ بناؤ جن میں سے چھ سو سوراخ چوکور، چھ سو گول چھ سو مستطیل اور چھ سو معین شکل کے ہوں۔" لوپان نے بارہ دن اور بارہ راتوں میں یہ کام بھی پورا کرلیا۔

بوڑھا بے حد خوش ہوا۔ اور کہنے لگا: "شاباش، اچھے بیٹے! اب کوئی بھی مشکل تمہیں پریشان نہیں کرسکتی۔ میں اپنا سارا ہنر تمہیں سکھاؤں گا۔" یہ کہہ کر وہ اسے مغربی کمرے میں لے گیا۔

کمرہ مکانوں کے نفیس نمونوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوپان یہ نمونے دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ بوڑھا کہنے لگا: "یہ نمونے ایک ایک کر کے الگ کرو اور پھر جوڑو۔ یوں تم سارا ہنر سیکھ جاؤ گے۔"

لوپان کو نمونے بہت پسند آئے تھے اور انہیں چھوڑنے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ استاد نے ہر نمونہ صرف ایک بار الگ کرنے اور جوڑنے کی اجازت دی تھی مگر اس نے ہر نمونہ تین تین بار الگ کیا اور جوڑا۔ وہ اس قدر یکسوئی سے کام کرتا کہ کھانا پینا تک بھول جاتا اور بازو شل ہو جاتے۔

اس طرح جفا کشی سے کام کرتے کرتے تین سال بیت گئے اور وہ اپنے فن میں طاق ہوگیا۔ بوڑھے نے سارے نمونے جلادیئے تو لوپان نے اپنے حافظے کی مدد سے تمام نمونے پھر بنا دیئے۔ بوڑھا جونہی کوئی نیا ڈیزائن اُسے دیتا وہ جھٹ سے نمونہ تیار کردیتا۔

ایک دن بوڑھے نے لوپان سے کہا: "بیٹے تین سال بیت چکے ہیں اور تم پورے کاریگر بن چکے ہو۔ اب تمہارے لئے پہاڑ سے اترنے کا وقت آگیا ہے۔" لوپان وہاں سے جانے پر آمادہ نہ ہوا تو بوڑھا اسے سمجھانے لگا: "تمہاری مزید ترقی کا انحصار تمہارے مطالعے اور تحقیق پر ہے۔ اب تمہیں یہاں سے جانا ہی ہوگا۔"

لوپان کو رخصت کرتے وقت بوڑھے نے کہا: "یہ کلہاڑی، آری اور چھینی میری نشانی کے طور پر لے جاؤ۔"

لوپان جذبات سے مغلوب ہوگیا اور روتے ہوئے بولا: "غریب شاگرد کے پاس اپنے استاد کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں!" بوڑھے نے ہنس کر جواب دیا: "مجھے کسی چیز کی ضرورت

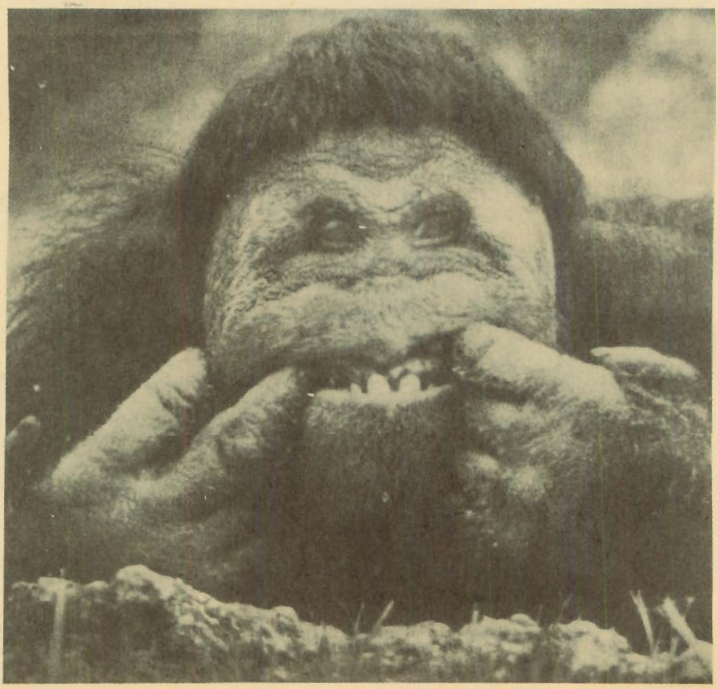
نہیں۔ بس ایک بات یاد رکھنا اپنے استاد کو رسوا نہ کرنا۔" لوپان نے بڑے ادب سے بوڑھے کو خدا حافظ کہا اور واپسی کے سفر پر روانہ ہوگیا۔

پہاڑ کے دامن میں اسے وہ بوڑھی عورت کہیں دکھائی نہ دی جس نے راستہ بتایا تھا۔ بوڑھی عورت کے احسان کا بدلہ چکانے کی خاطر اس نے پہاڑ کے دامن میں ایک عبادت گاہ تعمیر کی۔

دریا پر وہ ملاح بھی نظر نہ آیا جس نے اپنی کشتی میں اسے دریا پار کرایا تھا۔ اس نے دریا پر ایک بڑا پل تعمیر کردیا۔

جس نیک دل لکڑہارے نے اسے دانتی دی تھی، وہ بھی نہ ملا تو اس نے لکڑہارے کے احسان کا بدلہ چکانے کے لئے پہاڑ پر ایک بڑا پگوڈا تعمیر کردیا۔

گاؤں پہنچ کر لوپان ماں باپ سے ملا اور پھر استاد کی ہدایت کے مطابق لوگوں کے لئے مفید کام کرتا رہا۔ اور جلد ہی اس کے بارے میں بہت سی داستانیں عام ہوگئیں۔



دودھ اور مکھن کا شیریں احساس

Royal

بٹر ٹافی

Butter Toffee



Royal

چاکلیٹ ٹافی

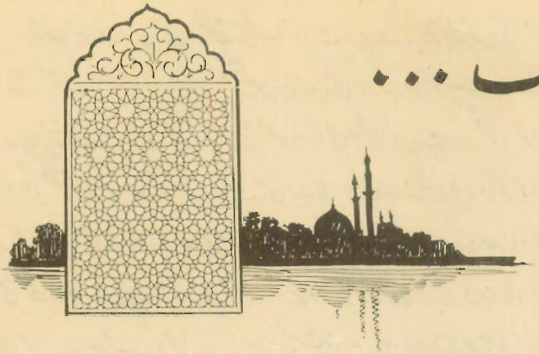
Chocolate Toffee



Royal رائل کنفیکشنری انڈسٹریز 22/24 - سی - ایس - آئی - ای - گوجرانوالہ

فائزہ صباحت

سحر ہونے تک ...



ایک تو سخت گرمی کا موسم۔ اوپر سے بڑھاپے کا عالم۔ پھر سامان کا گٹھر۔ بے چاری بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اور کہاں جائے۔ گھر سے تو جیسے تیسے سامان سنبھال کر نکل ہی آئی تھی۔ مگر نہ تو کوئی سواری مل رہی تھی نہ کوئی خدا کا بندہ نظر آرہا تھا۔ جو اس کا سامان اٹھا کر منزل تک پہنچا سکتا۔ پھر غربت کی مار الگ تھی، پیسے ہوتے تو کسی سواری کو کرائے پر لے ہی لیتی۔ مگر اتنا بھی نہیں تھا۔!

اسے دھوپ میں کھڑے کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ گرمی مسلسل بڑھتی چلی جارہی تھی۔ بڑھیا نے چہرے پر بہتا ہوا پسینہ بار بار پونچھا، لیکن گرمی کے ساتھ پسینے کا بہاؤ بھی بڑھتا جارہا تھا، آس پاس کوئی سایہ دار جگہ بھی نہیں تھی۔ وہ جہاں کھڑی تھی وہ عام لوگوں کا راستہ تھا، وہ اس آسرے پر کھڑی تھی کہ کوئی آنکلے تو اس سے مدد مانگے۔ مگر ایسے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ بہت دیر ہوگئی۔

کئی لوگ اس کے نزدیک سے گزر گئے کچھ پیدل کچھ سوار۔ اس نے سواروں سے بھی مدد مانگی پیدل چلنے والوں سے بھی۔ پیدل لوگ تو اس کی طرف دیکھے بغیر ہی آگے چلتے چلے گئے کہ کون اس سٹھیائی ہوئی بڑھیا کا سامان لے کر پھرے اور مفت میں اپنا تماشا بنوائے۔ بڑھیا بھی پاگل معلوم ہوتی ہے۔ اس گرمی میں کہاں جارہی ہے وہ بھی سامان سمیت۔ رہ گئے سوار۔ تو کسی نے تو اس کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اور کسی نے اپنی سواری کی رفتار تیز کردی۔ اور کسی نے مذاق اڑاتے ہوئے آگے کا رخ کیا۔ ایک ایک کر کے بہت سارے لوگ گزر گئے۔ سڑک پھر اکیلی رہ گئی۔ بے چاری بڑھیا روہانسی ہوگئی۔ ہائے کیا کروں۔ کسی کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ مجھ بڑھیا کا یہ گٹھر اٹھالے۔ اب تو گھر واپس بھی نہیں جاسکتی۔! جاؤں تو وہی مصیبت۔!

اس نے آہ بھری اور اِدھر اُدھر امید بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

تبھی ۔۔ ایک شخص راستے پر نمودار ہوا۔ اور اس کی طرف بڑھا۔!

بڑھیا حیرت سے اُسے دیکھنے لگی۔ قامت نہ بہت زیادہ بلند کہ بدنما معلوم ہو۔ نہ بہت کم کہ پستہ قد لگے۔ شانے مضبوط اور ہموار۔ آنکھیں بڑی بڑی اور بے حد خوبصورت ۔۔ روشن روشن سا چمکتا ہوا چہرہ بلند و بالا پیشانی، جو بتاتی تھی کہ یہ کوئی معمولی آدمی ہرگز نہیں ہے ۔۔ گھنی خوبصورت داڑھی، چال ایسی جیسے دو جہاں کی عظمتیں اس کے قدموں سے لپٹی چلی جا رہی ہوں ۔۔ لیکن غرور و تکبر کا دُور دُور نشان نہیں ۔۔ نہایت پروقار انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے ۔۔ نہایت وجیہہ اور خوبصورت۔ اور بے حد باوقار ۔۔ بڑھیا جیسے سحر زدہ سی ہوگئی تھی۔ پھر جیسے اپنے آپ میں آگئی۔ اتنے لوگ گزر گئے کسی نے مدد نہ کی۔ تو یہ کیا کرے گا؟ لیکن اتنا شاندار آدمی میں نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ جیسے روشنی اس کا دامن تھامے چلتی چلی جا رہی ہو۔

"اماں۔ آپ کہاں جا رہی ہیں؟"

بڑھیا چونک پڑی۔ وہی شخص اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے حیرت سے اُس شخص کو دیکھا۔ اُس نے اتنے لوگوں سے مدد کے لئے کہا، کسی نے مدد نہیں کی۔ مگر یہ شخص کسی درخواست کے بغیر اس کی مدد کرنا چاہتا ہے۔ ناقابلِ یقین سی بات۔

"ہاں ہاں بیٹا ۔۔ مجھے یہ سامان لے کر جانا ہے ۔۔ مگر میں بڑھیا۔ اتنا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ تم پہنچا دو گے"؟

اس نے امید بھری نظروں سے اس شخص کو دیکھتے ہوئے پوچھا ۔۔ دل ہی دل میں وہ اس سے متاثر ہو چکی تھی۔ یقیناً یہ کوئی عام سا آدمی نہیں ہے۔ اس نے سوچا۔

اجنبی نے نہایت خاموشی سے اس کا بوجھ اٹھا لیا اور بڑھیا کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا۔ بڑھیا حیرت زدہ سی اس کے ساتھ چلتی چلی جا رہی تھی۔!

چلتے چلتے اس شخص نے پوچھا۔ "اماں۔ آپ اپنا شہر چھوڑ کر کیوں جا رہی ہو"؟

بڑھیا نے اسے غور سے دیکھا۔ "کیا بتاؤں بیٹا۔ اس بڑھاپے میں کون اپنا گھر چھوڑتا ہے ۔۔ مگر مجبور ہوں اپنے باپ دادا کی زمین چھوڑ رہی ہوں۔"!

"آخر کوئی تو وجہ ہوگی۔" اجنبی نے بدستور تیز سے تیز ہوتی ہوئی دھوپ میں چلتے چلتے ۔۔ پیشانی پر کوئی بل لائے بغیر نہایت نرمی اور وقار سے پوچھا۔

بڑھیا نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"ارے بیٹا۔ کیا کروں۔ اس شہر میں ایک شخص پیدا ہوا ہے، جو اپنے آپ کو خدا کا رسول کہتا ہے اور ہمارے دیوتاؤں کو برا بھلا کہتا ہے۔ گھر بیٹھے اس نے کئی گھروں میں باپ بیٹے میں۔ ماں بچوں میں میاں بیوی میں لڑائی کروا رکھی ہے۔ کہتا ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے مذہب کو چھوڑ دیں اپنے بتوں کی پوجا چھوڑ دیں۔ بے دین ہو جائیں۔ اور اس کا لایا ہوا دین قبول کریں۔ بڑھیا غصے میں کہتی چلی گئی۔

اجنبی کے لبوں پر بہت پیاری سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"اچھا تو آپ اس لئے اپنا شہر چھوڑ رہی ہیں"۔

"ہاں۔ اور نہیں تو کیا۔ اب یا تو اس شہر میں رہوں اور اپنے باپ دادا کے مذہب سے پھر جاؤں یا پھر شہر ہی چھوڑ دوں۔ سو اس بڑھاپے اور بیماری میں گھر سے نکلی ہوں"۔ اجنبی مسکرایا۔ اور چلتا رہا۔

دھوپ میں انتہائی تیزی آچکی تھی۔ اجنبی کا پورا جسم پسینے میں نہا چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ناگواری کا ہلکا سا بھی اثر نہیں تھا وہ بدستور بوجھ اٹھائے۔ اس رفتار سے چلتا رہا تھا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس مفلس اور بدحال بڑھیا سے اُسے ایک دھیلا بھی نہیں ملے گا اور بڑھیا حیران تھی کہ اس کے جسم سے پسینے کی بدبو کے بجائے مسحور کن خوشبو آرہی ہے۔ آخر بڑھیا کی منزل آگئی۔ اجنبی نے سامان کندھوں سے اتار کر رکھا اور سیدھا کھڑا ہو گیا۔ بڑھیا اسے دیوتاؤں کے نام لے لے کر دعائیں دینے لگی۔ اجنبی خاموش کھڑا رہا۔ جب بڑھیا چپ ہوئی تو اس نے پوچھا۔

"اچھا اماں۔ اس شخص کا نام تو بتایئے؟" "محمدؐ بن عبداللہ"! بڑھیا نے بے ساختہ جواب دیا۔

پھر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ "ارے بیٹا تم نے اپنا نام تو بتایا نہیں"!

"محمدؐ بن عبداللہ"! فضا میں ایک مقدس آواز ابھری۔ اور زمین و آسمان خاموش ہو گئے۔

بڑھیا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس اجنبی کو دیکھ رہی تھی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب جاری ہو گیا اور اجنبی نے سنا۔ زمین اور آسمانوں نے سنا۔

وہی بڑھیا جو تھوڑی دیر پہلے اس شخص کو گالیاں دے رہی تھی۔

اب۔ پگھل چکی تھی اور آنسوؤں کے سیل رواں میں۔ اس کے لبوں سے کلمۂ شہادت جاری ہو گیا تھا۔

اجنبی مسکرایا۔ اور اس کے ساتھ کائنات بھی مسکرا اٹھی تھی۔ اس لمحے یقیناً بڑھیا نے۔ خود اپنی قسمت پر رشک کیا ہو گا۔ اور آج وہ لمحہ اس بڑھیا پر رشک کرتا ہے۔

سلام اُس پر کہ جس نے بے کسوں کی دستگیری کی۔ سلام اس پر کہ جس نے بادشاہی میں فقیری کی۔

خبردار

تمباکو نوشی صحت کے لئے مُضر ہے

وزارتِ صحت۔ حکومت پاکستان



یہ اشتہار صرف سگریٹ پینے والوں کے لئے ہی نہیں ہے بلکہ سگریٹ نہ پینے والوں کے لئے بھی پیشگی ہدایت ہے کہ وہ اس خطرے سے دُور رہیں جس کا انجام بیماری اور بربادی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یاد رکھیئے سگریٹ کا دھواں بھی سگریٹ نوشی کی طرح مضر ہے۔

اپنی صحت کا خیال رکھیئے

سگریٹ نوشی سے خود بچیئے۔ دوسروں کو بچایئے!

ماہنامہ آنکھ مچولی سگریٹ کے اشتہار شائع نہیں کرتا۔ مشتہرین زحمت نہ کریں (ادارہ)

سالارِ آزادی



آپ انیسویں صدی میں تحریک اسلامی ،جہاد آزادی اور دین کی اصلاح کے علمبردار تھے آپ کے جہاد نے برصغیر کے مسلمانوں کو زندگی بخشی اور آپ کی شہادت نے خون میں حرارت اور دین سے وابستگی کا ولولہ پیدا کیا جو آج بھی جاری ہے۔آپ ۶ صفر ۱۲۰۱ھجری/۲۹ نومبر ۱۷۸۶ء کو رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ بچپن سے ہی سپاہیانہ کھیلوں اور فنِ حرب پر عبور حاصل کرنے کا بڑا شوق تھا۔ والد کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد سترہ سال کی عمر میں تلاشِ روزگار کے لیے دہلی آئے اور شاہ عبدالعزیزؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے انہوں نے آپ کو شاہ عبدالقادر کے پاس اکبرآبادی مسجد میں بھیج دیا جہاں آپ نے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں۔ چند برس بعد آپ وطن لوٹ آئے اور تقریباً دو برس وہیں رہے۔ دوسری مرتبہ ۱۸۰۹ء میں وطن کو خیرباد کہا اور دہلی ہوتے ہوئے ۱۸۱۰ء میں نواب امیر خاں کے پاس چلے گئے۔ جب نواب نے انگریزوں سے صلح کرلی تو سیّد صاحب نواب سے علیحدہ ہوکر دہلی چلے آئے اور مُسلمانوں کی اصلاح اور انگریزوں کے خلاف جہاد کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ مولانا اسمٰعیل اوران جیسے بہت سے بزرگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرلی۔ انہی دِنوں پنجاب میں

رنجیت سنگھ کی قیادت میں سکھوں نے مسلمانوں پر بڑا ظلم وستم شروع کر دیا جب اس کی خبر سیّد احمد کو ملی تو انہوں نے پہلے سکھوں کے خلاف جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن اس سے پہلے آپ حج کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۲۳۶ھ میں چار سو ساتھیوں کے ساتھ کلکتہ کے راستے حج کے لئے روانہ ہوئے۔ حج بیت اللہ اور زیارت مدینہ سے فارغ ہو کر تین سال بعد آپ اپنی منزل پر پہنچا۔ جہاد کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ۱۲۴۱ھ ہجری (۱۸۲۶ء) میں مجاہدین کی جماعت کے ساتھ جہاد کے لئے روانہ ہوئے اور راجپوتانہ (راجستھان)، سندھ، بلوچستان، قندھار اور کابل سے ہوتے ہوئے یوسف زئی کے علاقہ میں پہنچے۔ شروع شروع میں مجاہدین کو بڑی کامیابی ہوئی۔ اکوڑہ کے میدان میں انہوں نے سکھوں کو شکست دی اور پشاور پر قبضہ کر لیا۔ لیکن رنجیت سنگھ برابر فوجیں بھیجتا رہا اور اپنے جاسوسوں کے ذریعہ اس نے بعض افغان قبیلوں کے سرداروں کو رشوت دے کر مجاہدین کے مقابلہ پر کھڑا کر دیا۔ سیّد احمدؒ نے افغان سرداروں کی غداری سے تنگ آ کر کشمیر کو جہاد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کیا اور جب آپ کے مجاہدین کشمیر جا رہے تھے تو افغان سرداروں نے ان کی روانگی اور بالاکوٹ میں ان کی موجودگی کی اطلاع دے دی۔ بالاکوٹ شمال مغربی سرحدوں پر وادی کاغان کے جنوبی سرے پر واقع ہے۔ سکھ افواج نے اچانک بے خبری کے عالم میں مسلمانوں کو گھیر لیا۔ سکھوں کی فوج مسلمانوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اور وہ پوری تیاری کے ساتھ آتے تھے ادھر مسلمانوں کو ایک تو اس حملہ کی خبر نہ تھی، دوسرے یہ کہ راستے بڑے دشوار اور تکلیف دہ تھے، موسم انتہائی سرد جبکہ مجاہدین کا تعلق گرم موسمی علاقوں سے تھا۔

اس کے باوجود ہر مسلم مجاہد آخر دم تک لڑتا رہا۔

سیّد احمدؒ نے اپنے جانباز اور محبوب ساتھیوں سمیت ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ یوم جمعہ (۶ مئی ۱۸۳۱ء) کو بالاکوٹ میں جام شہادت نوش کیا۔ اور اللہ کے پیارے اور سرخرو بندے بن کر جنت کے مستحق ہوئے۔ ان کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ کفر کے آگے کبھی نہیں جھکنا چاہیئے۔ اور جہاں بھی ظلم اور ناانصافی ہو رہی ہو، اللہ کے بندوں کے حقوق غصب کئے جا رہے ہوں، مسلمانوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ جہاد کے لئے تیار ہو جائیں۔ کیونکہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن۔

کہتے ہیں کہ ایک بادشاہ نے ایک دن شاہی باورچی کو طلب کیا اور کہا کہ آج مجھے دنیا کی سب سے خراب چیز پکا کر کھلاؤ۔ جب دسترخوان سامنے آیا تو بادشاہ نے دیکھا کہ باورچی نے زبان پکائی ہوئی ہے۔ اگلے روز بادشاہ نے پھر شاہی باورچی کو طلب کیا اور کہا کہ مجھے دنیا کی سب سے اچھی چیز پکا کر کھلاؤ۔ جب بادشاہ کے سامنے کھانا پیش کیا گیا تو اس نے دیکھا کہ شاہی باورچی نے آج پھر زبان پکائی تھی۔

بادشاہ نے باورچی کو بلایا اور اس کی ذہانت پر اسے انعام دیا۔ خیر یہ تو کہانی ہوئی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ گوشت کا یہ چھوٹا سا لوتھڑا جو ہمارے منہ میں بتیس دانتوں کے درمیان گھرا ہوا ہے صرف ہمیں نئے نئے ذائقوں اور لذیذ کھانوں کی لذتوں سے ہی روشناس نہیں کراتا بلکہ اپنے گھر دوستوں رشتہ داروں اور معاشرے میں ہماری شخصیت اور کردار کو بنانے اور بگاڑنے کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔

آپ نے بھی سمجھ لیا ہوگا کہ زبان کے دو کام ہوتے ہیں۔ یعنی بولنا اور ذائقہ محسوس کرنا۔ زبان گوشت کے بہت سارے ریشوں سے مل کر بنی ہوتی ہے جن کو مسلز (MUSCLES) کہتے ہیں یہ مسلز زبان کو حرکت

زبان

جسم و جان

ابنِ نظام

کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ ہمارے منہ سے جو آواز نکلتی ہے وہ زبان کی حرکت کا ہی نتیجہ ہے۔ انسان کے حلق میں ایک گول سا عضو ہوتا ہے جسے ساؤنڈ بکس یا لیرنکس LARYNX کہتے ہیں۔ اس کا کام آواز پیدا کرنا ہے۔ زبان کی حرکت ان آوازوں کو الفاظ میں تبدیل کرتی ہے اس عمل کو آرٹی کولیشن (ARTICULATION) کہتے ہیں۔ مثلاً جب زبان کا اگلا حصہ منہ کی چھت سے جا لگتا ہے تو "ق" کی آواز نکلتی ہے۔ اس طرح جب زبان کا نچلا حصہ منہ کے فرش سے ٹکراتا ہے تو "ل" کی آواز نکلتی ہے۔ اس طرح زبان کی حرکت سینکڑوں قسم کی ہوتی ہے۔ جس سے ہمارے منہ سے مختلف الفاظ نکلتے ہیں۔ زبان کی یہ حرکت باریک باریک ریشوں کے ذریعے سے کنٹرول ہوتی ہے جو نرو NERVE کہلاتے ہیں۔ یہ ریشے دماغ سے نکلتے ہیں اور زبان کے تمام مسلز تک آتے ہیں۔ دماغ میں ایک بڑا سا حصہ صرف اس کام کے لئے مخصوص ہوتا ہے اسے "بولنے کا مرکز" کہتے ہیں۔ جب

ہمارا ذہن یہ سوچتا ہے کہ ہمیں یہ بات بولنی چاہیئے تو سوچنے والے مرکز سے یہ پیغام "بولنے والے مرکز" تک پہنچ جاتا ہے۔ "بولنے والا مرکز" نرو کے ذریعے سے زبان کے مسلز کو حرکت دیتا ہے جس کے نتیجے میں کوئی بات ہماری زبان سے نکلتی ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ زبان انسان کے قابو میں رہنی والی چیز ہے اور انسان اپنی مرضی سے ہی اسے ہلا جلا سکتا ہے۔ لیکن ہم نے اپنے بڑوں کی زبانی کبھی کبھی سنا ہوگا کہ "اسکی زبان قابو سے باہر ہے" "اسکی زبان بہت تیز ہے" یا "کسی کی زبان بہت گندی ہے"۔ یہ باتیں ان بچوں کے لئے کہی جاتی ہیں جو اپنی زبان کو جھوٹ بولنے، گالیاں بکنے، غیبت کرنے، دوسروں کی شکایتیں کرنے اور لڑائی جھگڑا وغیرہ کرنے میں استعمال کرتے ہیں جو اپنی گفتگو سے اپنے استادوں سے بدتمیزی کرتے ہیں اور والدین کی نافرمانی کرتے ہیں۔ جب ہم اپنی زبان کو ایسے کاموں میں استعمال کریں گے تو نہ صرف ہمارے والدین، رشتہ دار اور استاد وغیرہ ہم سے ناراض ہوں گے بلکہ ہمارے دوست، ساتھی، کلاس فیلوز بھی ہمیں ناپسند کریں گے اور پھر ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ تلوار کا زخم تو بھر جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے لیکن زبان کا زخم نہیں بھرتا ہے۔ یعنی ہم اپنی زبان سے کسی کو تکلیف پہنچائیں گے۔ تو اس کا اثر بہت دیر تک رہے گا۔

زبان کا دوسرا کام ذائقہ محسوس کرنا ہے۔ ذائقہ کی ہمارے لئے بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر ایک دن ہمارے کھانے میں نمک مرچ نہ ہو تو ہمیں کھانا بالکل بے مزہ معلوم ہوتا ہے اور ایسے کھانے کو کھانے کا دل بھی نہیں چاہتا یا بیماری وغیرہ کے دنوں میں جب ہمیں "پرہیزی کھانا" دیا جاتا ہے تو ہمیں بہت مشکل ہوتی ہے اور یہ جو چٹ پٹی چیزیں، آلو چھولے، چاٹ، دہی بڑے وغیرہ ہمیں بہت اچھے لگتے ہیں اس کی وجہ ہماری زبان کی وہ صلاحیت ہے جس سے وہ ذائقہ محسوس کرتی ہے۔ زبان کی اوپری سطح پر اور اطراف میں باریک باریک، گول گول اور ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے چھوٹے اعضاء پائے جاتے ہیں ان کو ٹیسٹ بڈز TASTEBUDS کہتے ہیں یہ ٹیسٹ بڈز ہی دراصل ذائقہ کو محسوس کرتے ہیں۔ ہماری زبان چار قسم کے ذائقے محسوس کر سکتی ہے۔ یعنی میٹھا، نمکین، کھٹا اور کڑوا۔ اس لحاظ سے ٹیسٹ بڈز بھی چار قسم کے ہوتے ہیں یوں تو یہ ٹیسٹ بڈز پوری زبان پر بکھرے ہوتے ہیں لیکن زبان کے اگلے حصے میں جو ٹیسٹ بڈز ہوتے ہیں وہ کڑوا ذائقہ، درمیانی حصے کے ٹیسٹ بڈز نمکین اور کھٹا ذائقہ اور پچھلے حصے کے ٹیسٹ بڈز میٹھا ذائقہ محسوس کرتے ہیں۔

ان ٹیسٹ بڈز سے باریک باریک ریشے نکلتے ہیں جو نرو NERVE کہلاتے ہیں۔ یہ ریشے دماغ تک جاتے ہیں اور ذائقے کا احساس دماغ تک پہنچاتے ہیں۔ مثلاً اگر کوئی زیادہ کڑوی چیز ہمارے منہ میں چلی جائے تو ہم

فوراً اسے تھوک دیتے ہیں یہ دماغ ہی کی وجہ سے ہوتا ہے نرو کے ذریعے کڑوے ذائقے کا احساس دماغ تک پہنچتا ہے اور دماغ کے حکم کے نتیجے میں زبان ایسی کڑوی چیز کو باہر تھوک دیتی ہے۔

چونکہ زبان بہت زیادہ استعمال ہونے والا عضو ہے۔ لہٰذا ہمیں اس کی حفاظت بھی اچھی طرح کرنی چاہیئے۔ زبان کی ایک حفاظت تو یہ ہے کہ ہم اپنی زبان کو برائیوں سے آلودہ نہ کریں۔ جو بولیں سوچ کر بولیں اور کبھی غلط بات اپنی زبان سے نہ نکالیں۔

دوسرے یہ کہ دن میں کئی مرتبہ کلی کریں اور خصوصاً کھانے کے بعد اور جب بھی کچھ کھائیں تو اس کے فوراً بعد کلی ضرور کریں اور رات کو سونے سے پہلے لازماً کلی کر کے سوئیں اور صبح اٹھنے کے بعد سب سے پہلے ٹوتھ پیسٹ کریں اور اپنی زبان اور دانتوں کو صاف ستھرا رکھیں۔ اگر ہم ایسا نہ کریں تو ہمارے دانتوں اور زبان کو مختلف جراثیم بیماریوں میں مبتلا کریں گے۔ اسی لئے ہمیں چاہیئے کہ دانتوں اور زبان کو مختلف بیماریوں سے بچائیں۔

دانتوں کی ایک بیماری جو بہت عام ہے وہ زبان پہ چھالے نکل آنا ہے۔ جو لوگ اپنے دانتوں اور زبان کو صاف نہیں رکھتے ان کی زبان میں چھالے نکل آتے ہیں اور دانتوں میں کیڑا لگ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ گلا بیٹھ جانا، کھانسی، زکام، ٹانسلز وغیرہ بھی زبان کی حفاظت نہ کرنے سے ہی ہو جاتا ہے۔

ہمیں بہت زیادہ کھٹی اور کڑوی چیزوں، بازار میں بکنے والے گلے سڑے سے پھلوں، مٹھائیوں، کھٹ میٹھی ٹافیوں، مختلف قسم کی سپاریوں وغیرہ کو کھانے میں احتیاط کرنی چاہیئے۔ صاف ستھری، حفظانِ صحت کے اصولوں کے مطابق تیار شدہ اور احتیاط سے ڈھانپ کر رکھی ہوئی اشیاء کو ہی کھانا چاہیئے اور کھانے کے بعد ہمیشہ کلی کے ذریعے اپنی زبان اور دانتوں کو صاف کر لینا چاہیئے۔

اگر ہم اپنی زبان کی ہر طرح سے حفاظت کریں گے نہ صرف دنیا میں جسمانی طور پر خوش و خرم ہوں گے اور سب ہم سے محبت کریں گے بلکہ آخرت میں بھی زبان کی برائیوں سے بچنے کا بدلہ۔ جنت کی صورت میں ہمیں ملے گا۔

سورج

سورج حقیقت میں جلتی ہوئی گیسوں کا ایک بہت بڑا گولا ہے، سورج اتنا گرم ہے کہ وہاں دھاتیں نہ تو ٹھوس شکل میں ہیں اور نہ مائع کی شکل میں، یہ دھاتیں وہاں گیس کی صورت میں پائی جاتی ہیں۔

استاد: "وہ کونسی غذا ہے جو لذّت اور توانائی کے لحاظ سے سب سے آگے ہے اور جس میں ملاوٹ نہیں کی جا سکتی"

شاگرد: "انڈا" بشرطیکہ امتحان میں نہ ملے"

انڈے کے غذائی اجزاء

پروٹین	۶-۷۰ گرام
کیلوریز	۷۰ گرام
کیلشیم	۰۳-۰ گرام
فاسفورس	۱۱-۰ گرام
فولاد	۵۵-۱ گرام
وٹامن اے	۵۰۰ آئی۔یو
وٹامن ڈی	۳۰ آئی۔یو
وٹامن بی	۱۱۴۰ مائیکروگرام

دو انڈے روزانہ - تندرست و توانا

olympia POULTRY FARMS

OLYMPIA CHICKS

124-A, 4th Floor, Cotton Exchange Building, I. I. Chundrigar Road, Karachi-Pakistan
Phones: 221120, 235546 Cable: Khudadost Telex: 24564 Feeds (Pk)
Lahore Office:- 23, Davis Road Ph. 301979, 301980 Cable: KHUDADOST

حکایت سعدی

آغا سہراب جنگ

سنو پیارے بچو تم اک داستاں — کریں شیخ سعدی حکایت بیاں

کسی ایک جنگل میں تھا جا رہا — کہ اک شخص چیتے پہ تھا آ رہا

اسے دیکھ کر مجھ کو حیرت ہوئی — بھلا کیسے چیتے پہ بیٹھے کوئی

جو حیرت سے دانتوں میں انگلی دبائی — مجھے دور سے ایک آواز آئی

نہ گھبراؤ سعدی تم اس بات سے — ڈرو تم خداوند کی ذات سے

خدا کا اگر حکم مانو گے تم — تو جا کر درندوں کو جانو گے تم

ڈرو گر تو بس تم خدا سے ڈرو
اسی کی ہمیشہ غلامی کرو

ایف ملک سلیم

افغانستان کے پس منظر میں لکھا ہوا سلسلہ وار ناول

قسط نمبر ۱

پاسبان

ہر سمت رات کی گہری تاریکی کا راج تھا خاموشی اس گہری تاریکی میں ڈیرہ جمائے ہوئے تھی۔

اچانک راہداری میں کسی کے چلنے کی آواز نے ہلچل مچا دی۔ خاموشی رخصت ہوئی اور شور اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگا۔

آنے والا بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھا جس کی وجہ سے پکّے فرش پر اس کے قدم پڑتے ہی زلزلہ سا محسوس ہونے لگتا زندگی سے مایوس افراد لیٹے لیٹے کروٹ بدل کر اس کو جاتا دیکھ رہے تھے۔

آخر وہ رُک گیا..... میں نے زخموں کی پرواہ کئے بغیر کروٹ لی اور بڑی مشکل سے کھڑا ہوا لوہے کی سلاخوں کے پیچھے مجھے فوجی لباس میں ملبوس ایک قد آور اور خونخوار چہرے والا آدمی گھور رہا تھا... میرے ہاتھ پیچھے کی طرف کر کے باندھ دیئے گئے تھے انہیں اس کا ذرہ برابر بھی احساس نہیں تھا کہ میرا بازو ایک گولی کا بوجھ سنبھالے سخت اذیت کا احساس دلا رہا ہے۔

اس نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھولنے لگا..... آخر وہ کامیاب ہو گیا پھر اس نے تالا نکال کر کنڈی پہ زور دیا۔ کنڈی کے کھُلنے سے عجیب سی آواز پیدا ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں اس پہ لگی ہوئی تھیں اچانک پیچھے سے دو آدمی اور آتے نظر آئے..... اور جلد ہی مجھ تک پہنچ گئے۔

"مسٹر..... جورگن آپ کو..... اسی شخص کے بارے میں بتایا گیا تھا" دو میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے کہا

"میں جانتا ہوں" اس کی رعب دار آواز کمرے میں گونجی اور پھر وہ دھیرے دھیرے میری طرف بڑھنے لگا اچانک اس نے مجھے پیچھے دھکیلا میں اپنے آپ پر قابو نہ کر پایا اور کرسی پہ جا گرا..... میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو وہ سانپ کی طرح پھنکارا "بیٹھے رہو"

اچانک دو طاقتور سرچ لائٹس جل گئیں اور مجھے اپنی آنکھیں جلتی محسوس ہوئیں شاید یہ بلب ہزار وولٹ سے زیادہ کے تھے۔

ایک آدمی آگے بڑھا اور میرے ہاتھ کرسی کے پیچھے کر کے میرے بالوں کو اپنی مٹھی میں مضبوطی سے لیا۔

جورگن آگے بڑھا اور ایک بھرپور مکا میرے منہ پر جڑ دیا.....

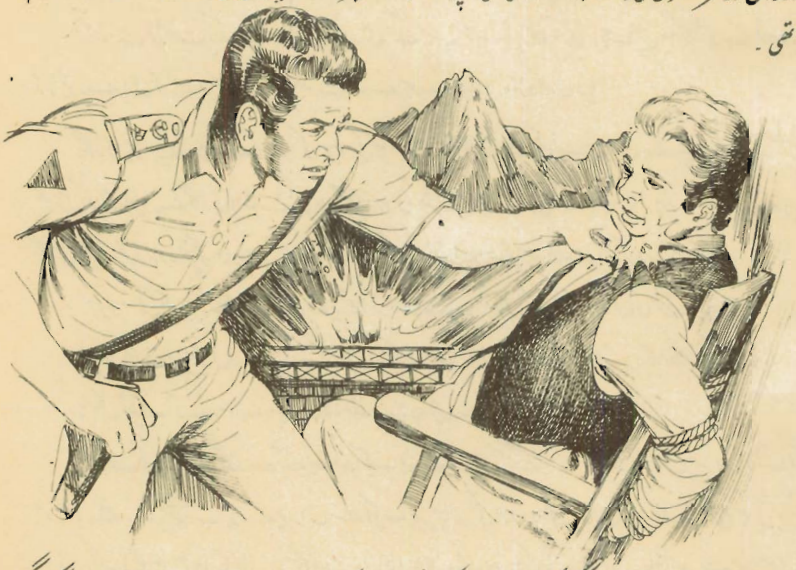
میرے منہ میں جمع شدہ تھوک دور جا گرا اور ہونٹ خون اگلنے لگے۔

شاید تمہیں احساس ہو ہی گیا ہوگا کہ یہ ہاتھ لوہے سے کم نہیں۔ اس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

لیکن جب یہ لوہا آگ پہ آتا ہے تو پگھل جاتا ہے" میں نے اتفاقی کہا تھا کہ ایک اور مکا میرے چہرہ کو بگاڑنے کا ذمہ دار ٹھہرا۔

میں نے آنکھیں بند کر لیں کیونکہ ہاتھ کا درد حد درجے بڑھ گیا تھا۔ "جلال آباد کا وہ پل جس پر سے آدمی جا رہے تھے۔ تم ہی نے تباہ کیا تھا نہ" جورگن کی آواز مجھے سرد ہوتی محسوس ہوئی

مجھ پہ بے ہوشی غالب ہو رہی تھی مجھ میں بولنے کی ہمت جواب دے گئی تھی کیونکہ میں کل صبح سے بھوکا تھا اور آج دوسرے دن کی رات ہونے کو آئی تھی اوپر سے جو گولی میرے بازو میں لگی تھی مسلسل درد میں اضافہ کر رہی تھی۔



"بتاؤ جواب دو....." جورگن کی آواز دہشت ناک تھی اور پھر گھونسے میرے منہ، پیٹ اور سر پہ پڑنے لگے جورگن حد درجہ خوفناک ثابت ہو رہا تھا۔ مجھ پر غنودگی طاری ہوتی جا رہی تھی اور یوں میرا ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

محترم خواتین و حضرات

چند لمحوں بعد طیارہ قندھار ائیرپورٹ پہ لینڈ کرے گا ہمیں امید ہے کہ ہماری میزبانی سے آپ لطف اندوز

ہوئے ہوں گے۔ ہم یہ بھی اُمید کرتے ہیں کہ قندھار میں قیام کے دِن آپ کو نئی دعنائی بخشیں گے۔ شکریہ

راک آرکنڈ نے سگریٹ کا گہرا کش لگایا اور اسے ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے حفاظتی بیلٹ باندھ لیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ ہی راک کو احساس ہوا کہ جہاز زمین پر قدم جما چکا ہے .... اس نے کھڑکی سے جھانکا۔

ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا زمین پر لگی لائٹیں دور تک قطار کی صورت میں پھیلی ہوئی تھیں دور کافی فاصلہ پہ ایک بوئنگ پرواز کے لئے تیار تھا.....

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور مسافر نیچے اترنے لگے ..... راک نے جیسے ہی پہلی سیڑھی پہ قدم رکھا تیز اور ٹھنڈی ہوا نے اس کے قدم روک دیئے.....

لمحہ بھر کے لئے اس کے بدن میں کپکپاہٹ کی کیفیت ہوئی۔

"یہاں ماسکو کے مقابلے میں زیادہ سردی ہے" راک نے اوور کوٹ کے کالر چڑھاتے ہوئے سوچا۔

کسٹم سے فراغت پاکر وہ باہر نکل آیا دور ہی اُسے سفید مرسیڈیز نظر آگئی۔ جیسے ہی وہ گاڑی کے قریب پہنچا ڈرائیور نے اس کو بغور دیکھا اور پھر سلیوٹ مارتے ہوئے پچھلا دروازہ کھول دیا۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی راک کو ہیٹر کی موجودگی کا احساس ہوا... پہلے کی نسبت اس نے اپنے آپ کو مطمئن محسوس کیا ڈرائیور نے گاڑی اسٹارٹ کی اور چمکتی ہوئی سڑک پر تیز رفتاری سے چل دیا۔ پندرہ منٹ کے بعد گاڑی ایک بڑی اور اونچی عمارت کے سامنے آکر رُک گئی ڈرائیور نے جلدی سے اتر کر دروازہ کھولا.....

ہیلو مسٹر راک آرکنڈ" جیسے ہی وہ نیچے اُترا سوٹ میں ملبوس ایک آدمی اس کی طرف بڑھا۔

"جہاں تک میرا خیال ہے آپ گورگ ہیں" راک نے ہاتھ ملاتے ہوئے خوش دلی کا مظاہرہ کیا۔

بالکل ٹھیک آئیے سب آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔

مختلف کمروں سے گذرنے کے بعد وہ ایک بڑے ہال میں آگئے ..... جہاں مختلف چہروں والے لوگ موجود تھے .... مگر سب ہی کے چہروں سے ایک چیز عیاں تھی اور وہ تھی چہروں پہ صاف جھلکتی ہوئی پریشانی راک اچھی طرح جانتا تھا .... حکومت اس کا استعمال اسی وقت کرتی ہے جب پانی سر سے بلند ہو جائے

ہیلو!!

مسٹر راک میرا نام جو ورج ہے اس ورکنگ کمیٹی کا چیئرمین" ایک ادھیڑ عمر مگر چالاک اور چست نظر آنیوالے شخص نے کہا۔

راک نے سگریٹ بجھائی اور ایک خالی کرسی پہ بیٹھ گیا۔

ایک بات تو میں اچھی طرح جانتا ہوں..... مجھے بلانے کا مقصد تو صاف ظاہر ہے..... اور وہ یہ کہ اب آپ کوئی ایسا کام میرے سپرد کرنا چاہتے ہیں جس میں آپ ناکامی سے دوچار ہو گئے ہیں۔

تم کافی عقلمند ہو..... اور تمہاری سوچ بھی صحیح دائرے میں گردش کر رہی ہے..... جگہ جس کام میں ہم نے ہاتھ ڈالا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے ہاتھ ہی کٹ گئے" یہ سب بتانے کا مقصد یہ ہے کہ جو کام تم سے کرایا جانا ہے وہ کوئی معمولی نہیں" جورج نے کہا میں جانتا ہوں!

پہلے میں اپنے ساتھ موجود ساتھیوں کا تعارف کروا دوں! اتنا کہنے کے بعد جورج ایک ایک آدمی کا تعارف کرانے لگا۔ راک سب کو بغور دیکھ رہا تھا۔

اب میں اصل مسئلہ کی طرف آتا ہوں۔

دراصل کچھ عرصہ سے ہمیں افغانوں کے ساتھ ہونے والی جنگ میں مسلسل ناکامیوں کا سامنا ہے پہلے ہم ان پہ حاوی تھے مگر ان کے پاس موجود مٹھی بھر جانبازوں نے ہمارے اسلحہ خانے بم سے اڑا دیئے..... اور شاید تمہیں یاد ہو..... چار دن پہلے ایک ہولناک واقعہ جلال آباد میں پیش آیا تھا..... ہمارے ملک کے اہم وزراء.....

سیاست دان اور دیگر اہم شخصیات جلال آباد کے نواحی علاقے کے پل سے گذر رہے تھے جسے چار جانبازوں نے بم سے اڑا دیا..... ان میں سے ایک تو پکڑا گیا ہے لیکن تین نوجوان لڑکے فرار ہو گئے ہیں دراصل آزادی ان کی ضرورت ہے اور ان کے لئے غلامی ہمارا خواب جو ہم حقیقت بنانے پہ تلے ہوئے ہیں ہمیں ان تین کے بارے میں کچھ معلومات پہنچیں ہیں جو ہم آپ کو بتا دیتے ہیں۔

یہ کہہ کر جورج نے ایک تصویر راک کی طرف بڑھا دی۔

راک نے دیکھا یہ ایک خوبرو اور طاقت ور نوجوان کی تصویر تھی جس کی عمر زیادہ سے زیادہ بیس سال کے لگ بھگ تھی۔

اس کا نام ابلال خان ہے..... زمانہ طالب علمی میں ایک پسندیدہ سبجیکٹ سائنس ہوتا تھا۔

اور اس چھوٹی عمر میں ہی اس نے ایک دو ایسی چیزیں بھی ایجاد کر لیں تھیں جو ہمارے لئے نقصان دے ہیں ان میں بوتل بم اور ایک ایسی دوا جو اگر سنگھا دی جائے تو موت کی وادی اس آدمی کا نصیب ہو جاتا ہے۔ اس کا بڑا بھائی جلال آباد میں مقیم ہے..... ماں باپ جنگ میں مارے جا چکے ہیں۔

یہ لمبے قد والا "ارفع" ہے ایک بوڑھا باپ اس کی کل جائیداد ہے..... اور یہ تیسری تصویر ارمغان خان کی ہے

بے پناہ طاقت اس کے جسم میں موجود ہے.... مگر عقل کی کمی ہے۔

ہوں! میں سمجھ گیا ان کو ہینڈل کرنے والا کون ہے۔

ان کا بڑا بھائی "شیر زمان"

قندھار کو مشرقی سمت پھیلی ہوئی پہاڑیاں رات کی نیم تاریکی میں پہلے کی نسبت اور بھی ہولناک لگ رہی تھی ایسے میں ایک سایہ بڑی تیزی کے ساتھ اونچی نیچی ناہموار جگہوں سے گذرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ یہاں آنا جانا اس کا روز کا معمول ہے کچھ ہی دیر بعد وہ ایک غار کے نزدیک آن کھڑا ہوا..... اور ادھر ادھر دیکھ کر اندر چلا گیا اندر گھپ اندھیرا تھا مگر وہ تاریکی میں آنکھیں پھاڑے آگے بڑھ رہا تھا پھر وہ سیدھے ہاتھ پہ مڑ گیا تیل کی لالٹین اس کا انتظار کر رہی تھیں۔

آؤ..... آؤ..... ارمغان خان بہت دیر کر دی آنے میں" جیسے ہی وہ اندر پہنچا ایک نوعمر آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی....

ارمغان نے سامنے بیٹھے اپنے ہم عمر دو لڑکوں کی طرف دیکھا اور بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ابلال کچھ دنوں کے لئے ہمیں اپنی کارروائی بند کرنی پڑے گی۔"

کیوں! ارفع چونکا۔

حالات فی الوقت ہمارے حق میں نہیں ہیں.... ہم مسلسل دو مہینوں سے ان روسیوں پہ حملہ آور ہو رہے ہیں اور ہمارا آخری حملہ تو حد درجے افسوسناک تھا۔ اب انہوں نے اپنے دفاع کے لئے ایک بہت ہی خاص آدمی ماسکو سے قندھار بلایا ہے۔"

اوہ تو یہ بات تمہیں عمر نے بتائی ہے۔

"ہاں وہ بھی روسی ایڈورک جو مسلمان ہو گیا مگر اب بھی روسی بن کر ان کے گروہ میں موجود ہے۔"

ارمغان نے کہا۔

"لیکن ہم اتنے دن بے کار کیسے بیٹھ سکتے ہیں اور ابھی تو ہمیں شیر زمان کو بھی رہا کرانے کی کوشش کرنی ہے" ارفع نے ایکدم کہا۔

ہر کام طریقے سے حکمت عملی اور کافی سوچ بچار کے بعد ہی کرنا چاہیئے اگر ہم اس آدمی کو پکڑنے کے لئے بھاگے یا اپنے ساتھی کو رہا کرانے کی کوششیں کی تو ہمارا انجام اچھا نہیں ہو گا" ابلال نے سمجھایا۔

ارمغان وہاں سے اٹھا اور کونے میں رکھے برتنوں میں جھانکنے لگا شاید اس کو شدید بھوک لگ رہی تھی۔

صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا راک بڑی سی حویلی میں گھاس پر جوگنگ میں مصروف تھا کچھ ہی دیر وہ آرام دہ کرسی پہ جا بیٹھا اور اورنج اسکوائش سے اپنی پیاس بجھانے لگا تازہ اخبار اس کا انتظار کر رہے تھے ..... راک نے اخبار اٹھایا اور ورق گردانی کرنے لگا ..... خبروں کی یکسانیت نے اسے جلد ہی بور کر دیا اور فلمی صفحے کا مطالعہ کرنے لگا۔

اچانک میز پہ موجود فون کی گھنٹی اپنی موجودگی کا احساس دلانے لگی .....

ہیلو! راک آرکنڈ ہیئر

اوھو ..... اچھا تو ایک آدمی فائل لے کر میرے پاس پہنچ رہا ہے ..... کیا نام ہے ....." ایڈرک" ٹھیک ہے میں اس کا انتظار کر رہا ہوں ..... ریسیور رکھ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا اور ٹہلنے لگا اُسے اپنا گذرا ہوا وقت یاد آنے لگا جب وہ چھوٹا سا تھا ماں باپ نے اُسے بوجھ سمجھ کر کچرے خانے میں پھینک دیا ..... وہیں سے اس کی زندگی کا وہ باب کھلا جس نے اُسے ایسے ستم گر لوگوں کے حوالے کر دیا جن کی زندگی غنڈہ گردی اور آوارگی میں گذرتی تھی ..... وقت گذرتا رہا وہ جوان ہو گیا اور دنیا کا ہر فساد اس کے ہاتھ میں کھلونا لگنے لگا پھر وہ کرائے کا قاتل بن گیا دھیرے دھیرے اس کی شہرت ملک گیر ہو گئی ہر بڑا کام اس کے اشارے سے ہوتا وہ لوگوں کو بے بس دیکھ کر خوش ہوتا اور آج وہ پھر ایک مشن پر روانہ ہو رہا تھا۔

ہیلو سر مجھے ایڈرک کہتے ہیں" اچانک ایک نرم آواز نے اسے چونکا دیا ..... وہ حیرت سے سامنے کھڑے نوجوان کو دیکھنے لگا جو روسی سول وردی میں ملبوس چہرے پہ مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔

ہوں ..... ہاں میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا فائل لے آئے" راک چونکا

جی ہاں ..... سر یہ مکمل فائل ان تینوں کے بارے میں کہ انہوں نے کہاں ..... کہاں کس طرح اور کس موقعہ پہ حملہ کیا؟

ہوں۔

اچھا سر میں چلوں ....." ایڈرک مڑنے لگا۔

ہاں تم ..... یہیں ٹھہرو کافی آنے والی ہے پی کر جانا ....." راک نے کہا اور پھر اس کے قریب آکر بولا۔

تم نے کبھی ان کو دیکھا ہے"

ایڈرک ایکدم چونک اٹھا۔

"جی میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا" ایڈرک کی آنکھیں خوف سے بھر گئیں۔

"ارے بھئی اس میں گھبرانے کی کیا بات تھی" راک نے ملازم سے پُرے لیتے ہوئے کہا۔

"نہیں .... نہیں سر میں گھبرا نہیں رہا" ایڈرک نے ماتھے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

کتنی چینی ....

دو چمچے

اوہ اتنی چینی شوگر ہو جائے گا میری طرح آدھا چمچ پیا کرو" راک نے کافی پیش کرتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر میں کافی ختم ہو چکی تھی۔

اچھا سر میں چلوں آپ فائل پڑھ لیں تو مجھے آگاہ کر دیجئے گا۔

ہاں بھئی تم جاؤ۔ "خدا حافظ" راک نے مسکرا کر کہا۔

اچھا جی "خدا حافظ" اچانک ایڈرک چونکا اور راک کو مڑ کر دیکھنے لگا جس کے چہرے پہ مسکراہٹ تھی مجھے پہلے ہی شبہ ہو گیا تھا کہ تم مسلمان ہو .... تم نے کافی اٹھا کر بسم اللہ پڑھی تھی .... اور تمہاری گھبراہٹ اس بات کا ثبوت ہے کہ تم افغانوں کے لئے جاسوسی کرتے ہو اسی لئے میں نے اچانک "خدا حافظ" کہا۔

ایڈرک گھبرا گیا اور ٹھوکر کھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگا اچانک راک کی آواز نے اس کے پاؤں جکڑ لئے۔

ٹھہرو تمہاری آخری گھڑی آن پہنچی ہے۔

۱: کیا ایڈرک مارا جائے گا؟

۲: شیر زماں کیا فرار ہو سکے گا؟

۳: راک کا اگلا منصوبہ کیا ہے؟

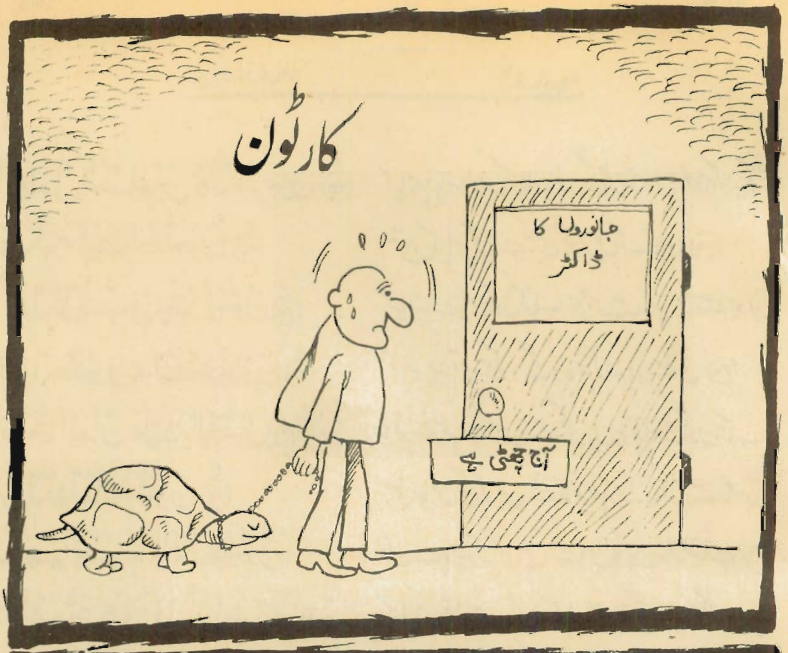
۴: کیا تینوں جانباز راک کی موجودگی میں آگے بڑھ سکیں گے؟

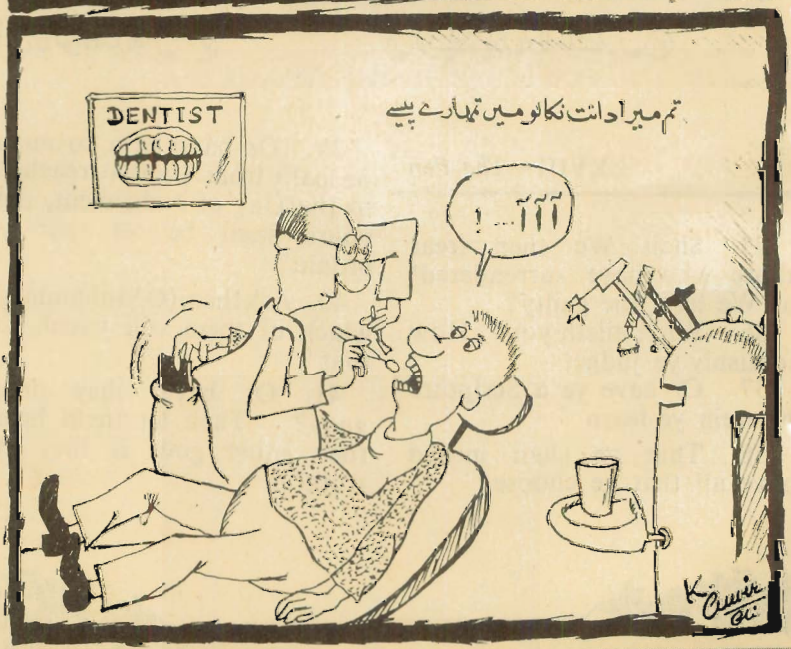
ان سب سوالوں کے جواب کے لئے تجسس ہنگاموں اور جذبہ حب الوطنی سے بھرپور "پاسبان" کی دوسری قسط کا انتظار کیجئے۔

وفاداری

ایک مترجمہ خانہ جنگی کے دوران ابراہم لنکن کی طرف سے ملک کے تمام جرنیلوں کو حکم ملا کہ ہر کارروائی کی رپورٹ مجھے روانہ کی جائے، ایک دن لنکن کو تار ملا۔ لکھا تھا "جناب عالی۔ چھ گائیں ہاتھ لگی ہیں، ان کا کیا کیا جائے" ابراہم نے جواب میں لکھا "ان کا دودھ نکال لیجئے"۔

کارٹون


جانوروں کا
ڈاکٹر
آج چھٹی ہے


DENTIST
تم میرا دانت نکالو میں تمہارے پیسے
آآآ...!

أَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِينَ كَالْمُجْرِمِينَ ﴿٣٥﴾
کیا ہم فرمانبرداروں کو نافرمانوں کی طرح (نعمتوں سے محروم) کردینگے ﴿٣٥﴾

مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ﴿٣٦﴾
تمہیں کیا ہوگیا ہے کیسی تجویزیں کرتے ہو؟ ﴿٣٦﴾

أَمْ لَكُمْ كِتَابٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ﴿٣٧﴾
کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں (یہ) پڑھتے ہو ﴿٣٧﴾

إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ﴿٣٨﴾
کہ جو چیز تم پسند کرو گے وہ تم کو ضرور ملے گی ﴿٣٨﴾

أَمْ لَكُمْ أَيْمَانٌ عَلَيْنَا بَالِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۙ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ﴿٣٩﴾
یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو قیامت کے دن تک چلی جائیں گی کہ جس شے کا تم حکم کرو گے وہ تمہارے لئے حاضر ہوگی ﴿٣٩﴾

سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ﴿٤٠﴾
اُن سے پوچھو کہ ان میں سے اس کا کون ذمہ لیتا ہے؟ ﴿٤٠﴾

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ ۖ فَلْيَأْتُوا بِشُرَكَائِهِمْ إِن كَانُوا صَادِقِينَ ﴿٤١﴾
کیا (اس قول میں) اُن کے اور بھی شریک ہیں؟ اگر یہ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو لا سامنے کریں ﴿٤١﴾

LXVIII—*The Pen*

35. Shall We then treat those who have surrendered[4] as We treat the guilty?

36. What aileth you? How foolishly ye judge!

37. Or have ye a Scripture wherein ye learn

38. That ye shall indeed have all that ye choose?

39. Or have ye a covenant on oath from Us that reacheth to the Day of Judgement, that yours shall be all that ye ordain?

40. Ask them (O Muhammad) which of them will vouch for that?

41. Or have they other gods? Then let them bring their other gods if they are truthful.



واپسی

سیّد عبدالودود شاہ
انعام یافتہ کہانی

آج پھر اسکول کھل رہے تھے۔ ہر طرف سڑکوں پر، گلیوں میں، بس اسٹاپوں پر بچے نظر آ رہے تھے۔ یونیفارم پہنے ہوئے، اُجلے اُجلے یونیفارم، نئے نئے بستے اور کتابیں، ہنستے مسکراتے چہرے۔ گاڑیاں بچوں سے بھری ہوئی تھیں اسکول کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے نوید نے سوچا۔ آج سارے دوستوں سے ملاقات ہوگی چھٹیاں تو ساری ہری، ابو بیہ اور سوات کی سیر میں نکل گئیں کتنے دِن بعد سارے دوست اکٹھے ہوں گے گیٹ پر مڑتے مڑتے اچانک ہی اس کا پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ اگر اس نے فوراً ہی قریب کے کھمبے کو نہ پکڑ لیا ہوتا تو بُری طرح گرتا۔ اس نے گھبرا کر نیچے دیکھا تو کیلے کا چھلکا تھا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ورنہ پکے فٹ پاتھ پر گر کر ایک آدھ ہڈی ضرور چٹخ جاتی۔ معلوم نہیں کس بے وقوف نے پھینکا ہے۔ وہ بھی اسکول کے گیٹ پر۔ اس نے سنبھلتے سنبھلتے جیسے خود سے ہی کہا۔ پھر جھک کر چھلکا اٹھایا اور ایک کونے میں ڈال دیا۔ اندر ہر طرف بچے پھیلے ہوئے تھے۔ پھر اسے شوکت نظر آ گیا جو کیلا کھا رہا تھا۔ بلکہ تقریباً کھا ہی چکا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے بقیہ کیلا کھا کر چھلکا ایک طرف پھینکا۔ اور خود پتلون سے ہاتھ رگڑتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ ابھی اسمبلی شروع نہیں ہوئی تھی لیکن اسکول کھلنے کی وجہ سے بچے آج جلدی ہی آ گئے تھے۔ اور اِدھر اُدھر گھوم کر اپنے اپنے دوستوں سے مل رہے تھے۔

"اچھا تو یہ حرکت شوکت صاحب کی ہے" نوید نے سوچا۔ "ابھی میں گرتے گرتے بچا ہوں اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو . . ." اس نے قدم آگے بڑھائے "اب یہ چھلکا بھی اٹھانا پڑے گا" اس نے اس طرف قدم بڑھائے جدھر شوکت چھلکا پھینک کر گیا تھا۔ یہاں سے بہت لوگ گزرتے رہتے تھے۔ دوسری طرف مس شہناز آتی دکھائی دیں، وہ جلدی جلدی آ رہی تھیں، انہوں نے شاید راستے میں پڑا چھلکا نہیں دیکھا تھا۔ نوید نے چلا کر کہا ٹھہریئے مس شہناز"۔ وہ گھبرا کر رک گئیں۔ کیا ہو گیا؟

"وہ کیلے کا چھلکا راستے میں پڑا ہے . . ." نوید نے توجہ دلائی۔ مس شہناز نے غور سے ادھر دیکھا پھر ناراض ہو کر بولیں: "یہ کس نے پھینکا ہے۔ جب کہ آپ لوگوں کو سمجھایا ہے کہ کچرا ادھر اُدھر نہیں ڈالا کریں" نوید نے ایک لمحے کو تو سوچا کہ بتا دے کہ یہ شوکت میاں کا کارنامہ ہے، لیکن پھر ابّو کا کہنا یاد آ گیا۔ انہوں نے حدیث سنائی تھی کہ کسی کی غیبت کرنا بُری بات ہے۔

اس نے سر جھکا۔ کچھ سوچا . . . اور پھر کہا "جی چھوڑیئے۔ میں اٹھائے دیتا ہوں۔

اچھا . . تم اچھے بچے ہو . . . سب کو ایسا ہی کرنا چاہیئے" مس شہناز احتیاط سے آگے نکل گئیں نوید نے دوسرا چھلکا اٹھا کر کچرے کے ڈبے میں ڈال دیا۔ اور خود کچھ سوچتا ہوا اسمبلی کے لئے چل دیا گھنٹی بج رہی تھی

اسمبلی کے بعد سب کلاس میں آ گئے۔ نئی کلاس، نئی چیزیں، نیا سامان، نئی کتابیں اور کچھ نئے چہرے۔ باقی سب جانے پہچانے تھے۔ نوید نے پچھلی نشست کی طرف دیکھا۔ جہاں شوکت بیٹھا منہ چلا رہا تھا۔ اسے کچھ نہ کچھ کھاتے رہنے کی عادت تھی۔ پھر اس نے دیکھ لیا کہ شوکت مونگ پھلی کھا رہا ہے۔ اور اس کے ساتھ بیٹھا ہوا اصغر بھی اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ "اب ساری کلاس میں مونگ پھلی کے چھلکے پھیلیں گے" نوید نے پریشان ہو کر سوچا۔ "ان کو کون سمیٹتا پھرے گا"؟

اس نے کچھ کہنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ مس تنویر کلاس میں آ گئیں سب ان کو سلام کرنے اور احترام میں کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے مسکرا کر ان کے سلام کا جواب دیا۔ اور انہیں نئی کلاس کے بارے میں کچھ ہدایات دینے لگیں۔ تبھی ان کی نظر شوکت اور اصغر کے چلتے منہ پر پڑ گئی "آپ لوگ کیا کھا رہے ہیں"۔

"کچھ نہیں مس" اصغر نے جلدی سے کہا۔ مس تنویر نے اسے گھور کر دیکھا۔

آپ کچھ بھی کھا رہے ہیں وہ آپ کے منہ میں اتنا بھرا ہوا ہے کہ آپ ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتے پھر کہتے ہیں کچھ نہیں کھا رہے ہیں"۔ کلاس پر قہقہے بھر گئے "ہنسنے کی بات نہیں۔ افسوس کی بات ہے" انہوں نے

پھر کہا۔ کلاس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ مس تنویر اصغر اور شوکت کی طرف گئیں پھر انہوں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "خدایا اتنے سارے مونگ پھلی کے چھلکے۔" انہوں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا۔ "آپ لوگ کلاس میں کیوں کھاتے ہیں؟" شوکت اور اصغر دم سادھے بیٹھے رہے۔

آپ نے کلاس میں کچرا بھی کر دیا۔ اسے فوراً صاف کریں اور منہ صاف کر کے آئیں۔ آئندہ کلاس میں کسی کو کھانے پینے کی اجازت نہیں ہو گی" انہوں نے حکم دیا۔ اصغر اور شوکت منہ بسورتے اٹھے اور جلدی جلدی صفائی کرنے لگے۔ کچھ بچے مسکرا رہے تھے۔ کچھ افسوس کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کلاس شروع ہو گئی وقفے میں اصغر اور شوکت ایک طرف کھڑے تھے۔ اور کئی بچے انہیں گھیرے ہوئے مذاق اڑا رہے تھے۔ نوید آہستہ آہستہ چلتا ان کے پاس جا پہنچا "شوکت! ذرا یہاں آؤ!"

"ہاں، ہاں۔ تم بھی مذاق اڑا لو" شوکت نے تیوریاں چڑھائیں۔

"یہ بات نہیں۔ نوید نے سنجیدگی سے کہا "ذرا آؤ تو۔!" شوکت بھیڑ سے نکل کر اس کے ساتھ چل پڑا۔ بھائی شوکت دیکھو بُرا مت ماننا۔ اس صورت حال میں تمہاری لاپرواہی کو دخل ہے صبح تم نے ایک کیلے کا چھلکا اسکول کے گیٹ پر پھینکا جس سے میں پھسلتے پھسلتے بچا۔ دوسرا تم نے احاطے کے اندر ایک راستے پر پھینکا۔ اگر میں مس شہناز کو خبردار نہ کرتا تو شاید وہ گر کر ہاتھ پاؤں تڑا لیتیں اوپر سے تم نے اپنی پتلون پر ہاتھ رگڑ لیے۔ پھر تیسری غلطی یہ کی کہ کلاس میں بیٹھ کر کھانا شروع کر دیا کچرا بھی اور تماشا بھی بنا۔ تم یہ مت سمجھنا کہ مجھے اس سے کوئی خوشی ہو سکتی ہے بلکہ بہت افسوس ہوا ہے تم ذرا احتیاط اور کچھ صفائی کا خیال رکھو تو یقیناً کسی کو تم سے شکایت نہیں ہو سکتی۔ "بس یہی وعظ کرنا تھا تمہیں"۔

"یہ وعظ نہیں ایک دوستانہ مشورہ ہے اس میں تمہارا ہی بھلا ہے"

"مجھے تمہارے وعظ کی ضرورت نہیں"

"اپنی غلطی کو محسوس کر لینا کوئی برائی نہیں بلکہ اس سے انسان کی عظمت بڑھتی ہے اور آئندہ غلطیوں کا امکان کم ہو جاتا ہے اور ہم تو آٹھویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ کوئی پہلی دوسری کے بچے تو نہیں ہیں اتنا تو سمجھنا چاہیئے کیا تم نے یہ حدیث نہیں سنی کہ پاکی اور صفائی آدھا ایمان ہے"۔ گویا ہم صرف پاکی اختیار کر کے آدھا ایمان محفوظ کر لیتے ہیں۔ کیا اتنا نہیں کر سکتے"؟

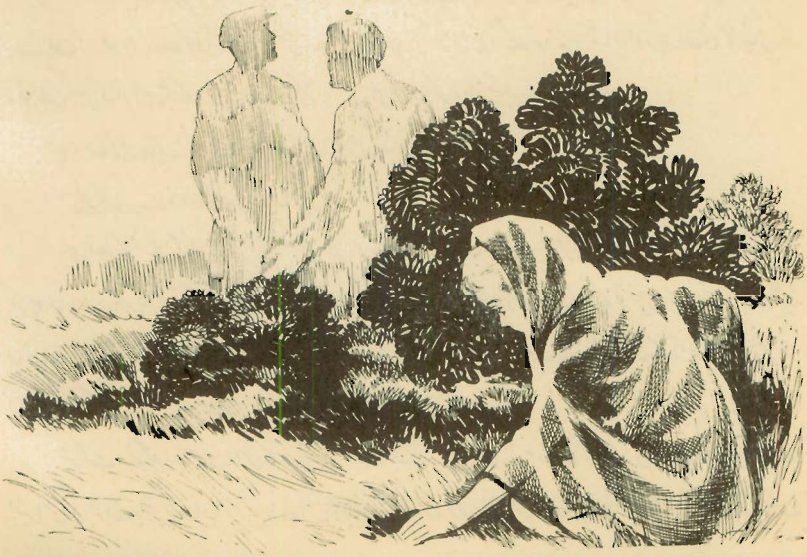
شوکت نے گہرا سانس لیا اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتا گیا پھر اس نے سر اُٹھا کر نوید کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ نوید نے اس کا ہاتھ تھام لیا دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیئے واپس کلاس کی طرف چل پڑے

کلثوم واحد

انعام یافتہ کہانی

فرض شناس

دلاور صاحب ایک معزز اور خدا ترس انسان تھے جو اپنے نوکروں کے ساتھ مشفقانہ انداز سے پیش آتے تھے۔ سلیم کا شمار بھی ان نوکروں میں تھا جنہیں صرف پرورش کی خاطر دلاور صاحب کی کوٹھی میں جگہ ملی ہوئی تھی اس کے باپ نے برسوں اس کوٹھی کے مکینوں کی خدمت کی تھی اور چاہتا تھا کہ اس کا اکلوتا بیٹا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے مگر تقدیر کو یہ منظور نہ ہوا۔ اور وہ اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنے سے پہلے ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت سلیم چوتھی کلاس کا طالب علم تھا۔ باپ کا سایہ سر سے اٹھنے کے بعد وہ بالکل اکیلا رہ گیا۔ جہاں اسے اپنے پیارے والد کی وفات کا غم تھا۔ وہیں یہ دکھ بھی تھا۔ کہ اب اس کی تعلیم جاری نہیں رہ سکے گی۔ کیوں کہ زندہ رہنے کے لئے سب سے پہلے اُسے نوکری کی ضرورت تھی۔ گو اس کے والد کے ساتھی رحمو چاچا نے اسے بہت تسلی دی۔ خود اس کی پرورش کا ذمہ لینا چاہا اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ دلاور صاحب جیسے ہمدرد مالک کے ہوتے



ہوئے اسے روٹی کپڑے کی فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ مگر سلیم کی خوددار طبیعت نے اسے گوارہ نہ کیا کہ وہ کسی پر بوجھ بنے یا خیرات پر اپنی زندگی گذارے اس نے بغیر کہے سنے خود ہی کوٹھی کے کئی کام سنبھال لئے۔ فرنیچر اور گاڑی صاف کرنا، جوتے پالش کرنا اس کے لئے آسان تھا لیکن اس کے علاوہ بھی وہ کوشش کرتا کہ زیادہ سے زیادہ ذمے داریاں اٹھائے۔ اُسے محنت کر کے کھانے میں مزہ آتا تھا۔ دوسرے نوکروں نے پہلے پہل تو اس سے بہت ہمدردی کی پھر رفتہ رفتہ وہ جیسے ہر ایک کا ماتحت بن کر رہ گیا۔ پہلے خانساماں نے اس سے چھوٹے موٹے کام لینا شروع کر دیئے۔ پھر مالی کرمیاں اکثر اسے جھاڑو پونچے کا کام سونپ کر خود کرسیدھی کرنے بیٹھ جاتی، اور تو اور مالی بھی آتے ہی اسے آواز دیتا۔ بیٹا۔ ذرا پودوں کو پانی تو لگا دے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سلیم کا کمزور سا وجود دن بھر کی محنت سے نڈھال ہو جاتا مگر جب وہ سونے کے لئے اپنے بستر پر لیٹتا تو اسے یہ سوچ کر بڑی پُرسکون نیند آتی کہ باپ کے نہ ہونے سے وہ کسی کا محتاج نہیں بنا اور خود اپنی محنت سے پیٹ بھرتا ہے۔ یہ سوچ کر وہ اللہ کا شکر ادا کرتا۔

دلاور صاحب محکمۂ خارجہ میں سیکرٹری تھے اس لئے وہ بے حد مصروف رہتے۔ کبھی کبھار ہی ایسا ہوتا کہ وہ کچھ دیر آرام و تنہائی کی خاطر لان میں آ بیٹھتے۔ ایسا ہی ایک دن تھا جب سلیم مالی کی ہدایت پر کیاریوں میں سے سوکھے پتے جمع کر رہا تھا تو ان کی نظر اس پر پڑی، چھوٹے سے بچے کو اس لگن سے کام کرتا دیکھ کر انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ سلیم کو اپنے پاس بلا کر جب انہوں نے پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ یہ کام اس نے خود سنبھالا ہوا ہے۔ پھر اس سوال پر کہ کیا وہ اسکول نہیں جاتا۔ سلیم کا دل بھر آیا۔ دلاور صاحب سمجھ گئے کہ اسے پڑھنے کا شوق ہے لیکن اپنی مجبوری کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اسی وقت بیٹھے بیٹھے انہوں نے فیصلہ کر لیا۔ کہ وہ اس غیرت مند بچے کو خود تعلیم دلائیں گے اس کے ساتھ ہی سب نوکروں کو جمع کر کے حکم دیا۔ کہ آئندہ اس سے کوئی کام نہ لیا جائے۔ مگر اس موقعہ پر سلیم نے ہمت کر کے پوچھا۔ "جناب آپ مجھ پر اتنی مہربانی کیوں فرما رہے ہیں"؟

دلاور صاحب نے جواب دیا "مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی ہے کہ تم محنتی اور غیرت مند ہو ورنہ اگر تم چاہتے تو ساری عمر بیٹھ کر کھا سکتے تھے، کوئی تم سے کچھ نہ کہتا"

سلیم نے ادب سے کہا۔ "پھر آپ مجھ سے میری یہ خوبی کیوں چھین لینا چاہتے ہیں، بغیر محنت کئے میں جو بھی حاصل کروں گا اس سے مجھے سچی خوشی نہیں ہوگی اور نہ میرے دل کو تسکین ہوگی"

دلاور صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔ "پھر تم کیا چاہتے ہو"

"سلیم نے جواب دیا۔ "میری خواہش ہے کہ اسکول کے بعد بدستور میں گھر کے کام کاج میں بھی حصہ لیتا رہوں آپ مجھے اس سے مت روکیں۔"

دلاور صاحب نے اسے تعریفی نظروں سے دیکھتے ہوئے اس بات کی اجازت دے دی۔

اب سلیم بے حد خوش تھا وہ پابندی سے اسکول جاتا اور واپسی کے بعد کوٹھی کی صفائی ستھرائی اور دیگر کام سرانجام دیتا۔ پھر رات کو دیر تک پڑھتا رہتا۔ اسی طرح وقت گذرتا رہا اور وہ چھٹی جماعت میں پہنچ گیا۔ استاد بھی اس کی ذہانت کی وجہ سے اسے بہت پسند کرتے تھے۔

ایک دن ماسٹر صاحب نے جماعت کو میجر عزیز بھٹی شہید کا سبق پڑھایا۔ بہادری کا یہ واقعہ اور ان کے پڑھانے کا انداز اتنا اچھا تھا کہ سلیم بہت متاثر ہوا۔ اس کے دل میں اس خواہش نے جنم لیا کہ کاش وہ بھی اپنے وطن کے لئے جان دے دے۔ اس نے ماسٹر صاحب سے سوال کیا۔

"سر! آپ نے بتایا ہے کہ شہادت مسلمان کے لئے بہت بڑا رتبہ ہے اور بڑی خوش نصیبی کا مقام ہے ....

لیکن سر! جہاد بار بار تو نہیں ہوتے، ہو سکتا ہے میری ساری عمر گذر جائے اور کفر و اسلام کی جنگ ہی نہ چھڑے، پھر میری یہ تمنا کیوں کر پوری ہوگی؟"

ماسٹر صاحب مسکرائے اور بولے "مجھے تمہارا جذبہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے لیکن بیٹے جہاد صرف ہتھیاروں سے لڑنے یا کافروں کو مارنے ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو زندگی کے ہر شعبہ میں رہتے ہوئے خالی ہاتھوں سے بھی لڑا جا سکتا ہے، ہر عمر اور ہر حیثیت کے لوگ اس میں شریک ہو سکتے ہیں۔

"وہ کیسے جناب؟" کئی بچے تعجب سے ایک ساتھ بول پڑے۔

"اس طرح میرے بچو! کہ برائیاں ہر جگہ موجود ہیں۔ ملک اور قوم کو نقصان پہنچانے والے ہر شخص سے لڑنا جہاد ہے۔ اگر تم کسی کو ٹریفک کا قانون توڑنے سے روکتے ہو، اگر تم بجلی یا پانی کی چوری، سڑک کے بلب توڑنے مہنگا بیچنے، ملاوٹ کرنے، انسانوں یا جانوروں پر ظلم کرنے سے روکتے ہو تو یہ بھی جہاد ہے، اس طرح ممکن ہے تمہیں خود نقصان اٹھانا پڑے تم زخمی ہو جاؤ یا تمہاری جان چلی جائے تو بھی تم شہید کہلاؤ گے ہمارا ملک اسلام کے نام پر بنا ہے، اسے ہر طرح کا نقصان پہنچانے والا بھی مجرم ہے۔ اسے پکڑوانے یا سزا دلوانے والا ہر شخص خواہ وہ تم جتنا چھوٹا بچہ ہی کیوں نہ ہو۔ اسلام کا سپاہی ہے"

یوں تو سبھی بچوں پر ان باتوں کا اثر ہوا لیکن سلیم تو ابھی سے اپنے چاروں طرف گہری نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ تاکہ وہ ابھی سے ہی ملک دشمن لوگوں سے جہاد شروع کر دے۔ دن بھر کی مصروفیات کے بعد جب وہ آرام

کے لئے لیٹا تو اس کا دماغ مستقبل کا پروگرام طے کر چکا تھا اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر حالات نے اجازت دی تو وہ ڈاکٹر بن کر بیماریوں کے خلاف جہاد کرے گا جو انسان کی سب سے بڑی دشمن ہیں اور جن کا نشانہ زیادہ تر غریب لوگ ہی بنتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی ایسے لوگوں کی بہتری کے لئے وقف کر دے گا جو پیسہ نہ ہونے کے سبب ڈاکٹر کے پاس نہیں جا سکتے اور دوائیاں نہ ملنے کی وجہ سے اپنے پیاروں کے سامنے دم توڑ دیتے ہیں سلیم نے تصور میں خود کو سفید کوٹ پہنے اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے مریضوں کی خدمت میں مصروف دیکھا۔ پھر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا کیونکہ انہی سوچوں میں الجھ کر وہ دلاور صاحب کے جوتے پالش کرنا بھول گیا تھا۔ ہلکی ہلکی سردیاں شروع ہو چکی تھیں اس نے اپنے بابا کی کالی چادر اوڑھی اور آہستہ سے کوارٹر کا دروازہ کھول کر باہر نکلا تاکہ کوٹھی کی روشنیاں دیکھ کر اندازہ لگا سکے، اگر وہاں ابھی لوگ جاگ رہے ہوں تو اسی وقت جوتے پالش کر کے دکھ دے ورنہ پھر صبح پر یہ کام چھوڑ دے۔ ابھی اس نے چند ہی قدم بڑھائے تھے کہ اسے قریبی جھاڑیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔ جیسے وہاں کوئی چھپا ہوا ہو۔ سلیم اپنی جگہ ٹھٹھک کر رہ گیا اس کے ذہن میں چوری اور ڈکیتیوں کی وہ وارداتیں گھومنے لگیں جو ان دنوں شہر میں جا بجا ہو رہی تھیں اندھیرے اور کالی چادر کی وجہ سے اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ مگر اپنی جگہ کھڑے کھڑے اس نے جھاڑیوں کی طرف غور سے دیکھا تاکہ آہٹ کا سبب جان سکے۔ اسے وہاں کوئی نظر تو نہ آیا لیکن ہلکی ہلکی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ احتیاط سے کھسکتا ہوا آگے بڑھا تو ایک مانوس سی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی وہ پہچان گیا یہ دلاور صاحب کی آواز تھی۔ سلیم حیران رہ گیا کہ اتنی رات گئے وہ ان جھاڑیوں میں کیا کر رہے ہیں کہیں وہ کسی مشکل میں تو نہیں پھنس گئے۔ وہ ان کی مدد کے لئے آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ ایک اور آواز نے اس کے قدم روک دیئے یہ کوئی غیر ملکی تھا جو بڑے اکھڑپن سے کہہ رہا تھا۔ تم نے ہم کو بولا تھا کہ آج کا غذات دے دے گا۔ پھر خالی ہاتھ ادھر کیوں آیا؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" غیر ملکی نے بے صبری سے کہا "پر وہ چیز لئے بغیر ہم مال تم کو نہیں دے سکتا" "یہی تو میں بھی کہتا ہوں کہ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو" میں تمہارا بھروسہ کیوں کر کروں؟ غیر ملکی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر دلاور صاحب کی آواز آئی "ہمارا سودا ایسا ہے کہ ہم ایک دوسرے پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ لہٰذا یوں کرو کل تم رقم لے کر آجاؤ۔ میں اسے دیکھنے کے بعد کاغذات تمہارے حوالے کر دوں گا" غیر ملکی نے لمبی سانس لی "تم بہت چالاک ہے، پر ٹھیک ہے، ہم کل رات بارہ بجے ادھر آئے گا رقم دے گا اور اپنا مال اٹھالے گا۔ بولو منظور ہے؟"

"مجھے منظور ہے لیکن دیکھو کل ضرور آجانا۔ میں ان کاغذات کو زیادہ دیر اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔"

"ہم جانتا ہے" تم بے فکر رہو۔ کل رقم ضرور آجائے گا۔" پھر دو سائے مخالف سمتوں میں چلے گئے۔

سلیم لرزتے قدموں سے اپنے کوارٹر کی طرف بڑھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ پراسرار سودا کیسا ہے جس کے لئے دلاور صاحب کو رازداری سے اس اندھیرے مقام پر آنا پڑا۔ پھر وہ غیر ملکی کون تھا جو صرف کاغذات کے بدلے آٹھ لاکھ روپے جیسی بڑی رقم دینے پر تیار تھا۔ بستر پر لیٹا تو نیند آنکھوں سے غائب تھی۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار تھا۔ اس نے ایسی بہت سی کہانیاں پڑھی تھیں جن کی مدد سے اسے صورت حال سمجھنے میں دیر نہ لگی۔ یقیناً وہ کاغذات بے حد اہم ہوں گے۔ جو آٹھ لاکھ روپے میں بیچے جا رہے ہیں۔ پھر اگر خرید و فروخت قانونی ہوتی تو اس کے لئے آدھی رات کا وقت اور سنسان جگہ کیوں منتخب کی گئی۔ تو دلاور صاحب کوئی ایسا کام کر رہے ہیں جو غیر قانونی ہے یا پھر کوئی ایسی چیز بیچ رہے ہیں جسے بیچنے کا حق انہیں حاصل نہیں ہے۔ اس نے سوچا انہیں ضرور روکنا چاہیے۔ مجھ اکیلے میں تو ان کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں..... تو پھر کیا اس کی اطلاع پولیس کو دے دوں؟

اور اگر پولیس نے دلاور صاحب کو گرفتار کر لیا تو پھر.....؟ وہ یہ سوچ کر ہی لرز گیا۔ باپ کے بعد اس بھری پُری دنیا میں خدا نے انہی کو سلیم کا سہارا بنایا تھا۔ انہی کی وجہ سے تعلیم جاری رہ سکی تھی۔ اگر وہ نہ رہے تو یہ آسرا بھی چھن جائے گا۔ جہالت، بھوک اور در بدری اسکا مقدر ہوں گے۔ ڈاکٹر بننے اور بیماریوں کے خلاف جہاد کرنے کا خواب ٹوٹ جائے گا۔ اس کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔ تو پھر کیا وہ خاموش بیٹھا سب کچھ دیکھتا رہے، جو ہو رہا ہے اسے ہونے دے؟

دماغ کی اس تجویز کو ضمیر نے سختی سے ٹھکرا دیا۔ "تم صرف اپنے بارے میں کیوں سوچتے ہو! یاد نہیں ماسٹر صاحب نے کیا کہا تھا؟ برائی کے خلاف جہاد کرتا ہوا کوئی مارا بھی جائے تو وہ شہید ہے۔ تم اگر بھوک سے مر گئے تو کیا۔ ڈاکٹر نہ بن سکے تو بھی کیا..... پاکستان سلامت رہے۔ یہ قوم سلامت رہے۔ ہماری آزادی برقرار رہے یہ سب سے اہم بات ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ سب ہمیں غلام بنانے کی سازش ہے ورنہ کوئی غیر ملکی کسی معمولی کاغذ کے لئے اتنی بڑی رقم نہیں دے سکتا۔ اسے دلاور صاحب سے اس وقت شدید نفرت محسوس ہوئی جب وہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے ملک اور قوم کا سودا کر رہے تھے۔ اسی لمحے اس نے فیصلہ کر لیا کہ جو ہو سو ہو وہ اس بارے میں پولیس کو ضرور بتائے گا۔

اگلی صبح اس کے قدم اسکول کے بجائے پولیس اسٹیشن کی عمارت کی طرف اُٹھ رہے تھے۔ اُس نے انسپکٹر صاحب

کو ساری بات بتادی۔ وہ شاید اتنے چھوٹے سے لڑکے کی بات پر یقین نہ کرتے۔ مگر دلاور صاحب کے نام نے معاملے کی اہمیت بڑھادی تھی۔

انہوں نے سلیم کو ہدایت کی کہ وہ اس بارے میں ایک لفظ بھی کسی کو نہ بتائے اور نہ رات کو اپنے کوارٹر سے باہر قدم نکالے انسپکٹر صاحب نے اس سلسلے میں یہ احتیاط بھی برتی کہ عام قسم کے کپڑے بدل کر سلیم کی مدد سے وہ مقام بھی دیکھ آئے جہاں پر سودا طے پایا تھا۔

سلیم پورے دن بے چین رہا۔ آنے والے وقت کے خیال سے اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ لیکن اپنے فیصلے پر اسے کوئی پچھتاوا نہیں تھا۔ وہ مسلسل جاگتا رہا۔ پھر دُور کہیں بجتے ہوئے گھنٹہ گھر کی ٹن ٹن اسے یوں لگی جیسے بم کے دھماکے ہو رہے ہوں۔

گہرے سناٹے کے چند لمحے گذرنے کے بعد اچانک اسے باہر شور سنائی دیا۔ دوڑتے قدموں کی آوازوں کے ساتھ اس نے پولیس کی سیٹیاں بھی سنیں۔ تھوڑی دیر کے جان لیوا انتظار کے بعد اس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ انسپکٹر صاحب نے کہا۔ "سلیم بیٹے باہر آجاؤ"

جوں ہی اس نے قدم باہر نکالا اس کی نظر ایک سفید فام اور دلاور صاحب پر پڑی جن کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگ چکی تھیں۔ ایک سیکنڈ کے لئے اس کے پاؤں لڑکھڑائے پھر وہ ثابت قدمی کے ساتھ سینہ تانے سیدھا کھڑا ہو گیا۔

"شاباش سلیم تمہاری فرض شناسی کی وجہ سے ملک ایک بڑے خطرے سے بچ گیا ہے۔ وہ نہایت اہم کاغذات تھے جو دشمن کے ہاتھ لگ جاتے تو قوم کی آزادی چھن جاتی۔ مجھے تم پر فخر ہے۔ کاش کہ تم میرے بیٹے ہوتے۔" انسپکٹر صاحب نے محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔

دلاور صاحب نے اسے گھور کر دیکھا اور بولے "مجھے تجھ سے ایسی اُمید نہ تھی نمک حرام لڑکے میری نیکیوں کا یہ صلہ دیا ہے تو نے؟"

سلیم نے مضبوط آواز میں جواب دیا۔ آپ کو یاد ہے جناب کہ آپ نے کہا تھا میری غیرت مندی وہ خوبی ہے جو آپ کو بے حد پسند آتی ہے۔ پھر میں یہ کیوں کر برداشت کر سکتا تھا کہ کسی غیر کی ناپاک نظریں میرے پاک وطن کی جانب اٹھیں یا اس کی آزادی خریدیں!"

دلاور نے کوئی جواب نہ دیا۔ پولیس نے دھکیل کر اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔

اگلے کئی ہفتے سلیم پر بڑے سخت گذرے۔ اپنا کوارٹر اس نے اسی وقت چھوڑ دیا تھا۔ کیوں کہ ظاہر ہے اب

اسے وہاں رہنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ وہ خانہ بدوشوں جیسی زندگی گزار رہا تھا۔ چھوٹا موٹا جو کام ملتا کر لیتا۔ کم عمری کی وجہ سے کوئی اسے زیادہ پیسے بھی نہ دیتا۔ کئی وقت تو فاقے میں گذر جاتے۔ رات ہوتی تو کسی باغ کے کونے یا فٹ پاتھ پر گذار لیتا۔ جہاں مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے بے دردی سے اس کا خون چوستے۔ کپڑے پھٹ گئے تھے چپل ٹوٹ چکی تھی کیونکہ سلیم ہر چیز جو دلاور کی عطا کی ہوئی تھی وہ اسی کو اٹر میں چھوڑ آیا تھا۔

ایک دن وہ حسرت بھری نظروں سے اسکول کے قریب کھڑا گذرتے ہوئے بچوں کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ماسٹر صاحب کی نظر اس پر پڑ گئی۔ انہوں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھاما اور اپنے آفس میں لے آئے گو کہ اخبارات کے ذریعے انہیں تمام خبریں مل چکی تھیں پھر بھی ایک ہونہار طالب علم کو یوں برباد ہوتا دیکھ کر انہیں بے حد افسوس ہوا۔ ہمدردی سے پوچھا۔

"اپنی تعلیم کے بارے میں تم نے کیا سوچا ہے۔ آئندہ کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

سلیم کی آنکھیں بھر آئیں اس نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ "آپ نے کہا تھا نا سر! کہ ملک اور قوم کی خاطر اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچے یا تم مارے جاؤ تو یہ قربانی نہیں شہادت کا درجہ دلائے گی۔ تو پھر سمجھ لیجئے سر! کہ وہ سلیم مر گیا جو بڑا آدمی بننا چاہتا تھا۔ وہ ڈاکٹر مر گیا جس کا مشن بیماریوں سے جنگ کرنا تھا۔ اپنے وطن کی خاطر میں نے اپنا مستقبل اپنی زندگی سب کچھ داؤ پر لگا دیا اور خدا کا شکر ہے کہ اسے بچانے میں کامیاب ہو گیا۔"

کون کہتا ہے کہ سلیم مر گیا؟ وہ زندہ ہے اور اپنی قوم کے آگے سرخرو ہے" انسپکٹر صاحب نے آفس میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ "کیا تم نے یہ نہیں سنا کہ جہاد میں جو فتح حاصل کرے وہ غازی ہوتا ہے خدا نے تمہیں یہی مرتبہ عنایت کیا ہے تاکہ تم مسلمان قوم کے لئے اس سے بھی بڑھ کر کارنامے انجام دے سکو۔ عزت دولت اور شہرت تمہارے قدم چومنے کی منتظر ہیں۔"

"آپ کیا کہنا چاہتے ہیں جناب؟" ماسٹر صاحب نے حیرت سے سوال کیا۔

"یہی کہ سلیم کی اس بیش بہا خدمت کے صلے میں حکومت نے اسے ایک بڑا انعام دینے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے ساتھ میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سلیم میرے گھر رہے گا۔ میرا بیٹا بن کر۔ اس سلسلے کی تمام قانونی کارروائیاں ہم آج ہی پوری کریں لیں گے۔" "کیا سچ؟" سلیم کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

بالکل سچ؟" انسپکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "کیوں کہ مجھے ایک غیرت مند بیٹے کی اور اس ملک کو ایک فرض شناس شہری کی اور قوم کو اس ڈاکٹر کی ضرورت ہے جو پاکستانی معاشرے کو ہر قسم کی بیماریوں سے نجات دلا سکے۔"



شام ڈھلے

ایم اِفضل
انعام یافتہ کہانی

کاشف دیکھنے میں تو عام لڑکوں ہی کی طرح تھا مگر اپنی عادات اور مزاج کے لحاظ سے وہ عام لڑکوں سے بہت مختلف تھا بہت حد تک نڈر اور صاف ستھرا رہنے والا کاشف اپنے محلے دوستوں میں اپنی اچھی عادات کی وجہ سے بہت مقبول تھا۔ وہ اگرچہ زیادہ توجہ پڑھائی کی طرف ہی رکھتا پھر بھی جب کبھی فارغ ہوتا تو ماں باپ کی اجازت سے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ قریبی بیری والی گراؤنڈ میں جا کر کرکٹ وغیرہ کھیل لیتا یوں تو دوسرے لڑکے ایک دوسرے کو چھیڑ کر اور تنگ کر کے خوش ہوتے تھے مگر وہ کاشف کے ساتھ ایسا نہیں کرتے تھے کیوں کہ نہ تو کاشف کسی کو ناجائز تنگ کرتا تھا اور نہ ہی کسی پر بے معنی آوازیں کستا اور اگر کسی دوست وغیرہ کو وہ ایسے کرتے ہوئے دیکھتا تو نہایت نرمی سے اُسے سمجھاتے ہوئے ایسا کرنے سے منع کر دیتا۔ یہ پنجیدہ طبیعت شاید کاشف نے اپنے والد کی طرف سے پائی تھی جو فوج میں تھے اور دو جنگیں لڑ چکے تھے۔ وہ اکثر اپنے بچوں کو جنگ کے واقعات سناتے انہوں نے اندھیری راتوں میں جنگلوں میں تنہا آگے جا کر کئی مرتبہ دشمن سے دو دو ہاتھ کئے تھے اور یہ ان کا کہنا تھا کہ انہیں گھنے جنگلوں میں رات کے اندھیرے میں چڑیلیں، بھوت اور دوسری غائب ہو جانے والی چیزیں کبھی دکھائی نہیں دیں۔ اور عمر اور تجربے سے بتاتے تھے کہ وہ ایسی چیزوں پر ایمان نہیں رکھتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آدمی دبلی اور ڈرپوک ہو تو اپنے سائے سے بھی ڈر جاتا ہے بالکل اسی طرح کاشف بھی کبھی رات کے اندھیرے سے نہیں ڈرا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ سٹریٹ لائٹ کے خراب ہونے کے باوجود وہ کبھی بھی اندھیرے میں اکیلے

جانے سے نہ ہچکچایا۔

ایک روز وہ کسی کام کی غرض سے گلی میں آیا تو تمام لڑکے گلی میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اُسے بڑی حیرانی ہوئی کیوں کہ کچھ ہی فاصلے پر ایک چھوٹا سا کھیل کا میدان تھا جسے سب بڑے چھوٹے بیری والی گراؤنڈ کہتے تھے۔

جب کاشف نے اُن سے گلی میں کھیلنے کی وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ کل شام فیاض گراؤنڈ میں بیری کے درخت سے نیچے کسی سائے کی وجہ سے بے ہوش ہو گیا تھا وہاں کسی بھوت وغیرہ کا بسیرا ہے اس لئے وہ اب وہاں کھیلنے نہیں جائیں گے۔ یہ سن کر کاشف ہنس دیا اور کہنے لگا۔ "یہ سب تمہارا وہم ہے۔ فیاض یرقان کی وجہ سے کمزور ہے وہ تھک کر وہاں بے ہوش ہو گیا ہو گا۔" مگر تمام لڑکوں نے کاشف سے اتفاق نہ کیا اس پر کاشف نے کہا وہ گہری شام کے وقت اکیلا وہاں درخت کے نیچے جا کر دکھائے گا کیوں کہ دن کے وقت اکثر لوگ اس کے سائے میں بیٹھتے تھے اور ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ لوگوں کو سایہ دینے والی بیری پر کسی بھوت وغیرہ کا سایہ ہو۔

اُس روز جب شام گہری ہوئی تو بہت زور سے ہوا چلنے لگی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک زبردست آندھی چلی بے شمار چیزیں ہوا میں اُڑ گئیں اور جب آندھی تھمی تو رات کی تاریکی پھیل چکی تھی رات کے کھانے سے فارغ ہو کر کاشف کو یاد آیا کہ اس نے دوستوں کو رات کے وقت بیری والے درخت کے پاس جا کر دکھانے کا کہا تھا۔ چنانچہ وہ چہل قدمی کا کہہ کر گھر سے نکلا۔ باہر گلی کے موڑ پر اسلم، گڈو جیرا، نوید ثاقب اور دوسرے لڑکے کھڑے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔ کاشف جب ان کے قریب گیا تو وہ جیسے سہمے کھڑے تھے۔ وہ چھوٹتے ہی کہنے لگے تم بیری والے درخت کے پاس نہ جانا۔ وہاں آج کوئی چڑیل قبضہ کیئے بیٹھی ہے اور گاہے بگاہے ملتی بھی ہے۔

وہ دور سے خود دیکھ کر آرہے ہیں۔ یہ سن کر کاشف ہنس دیا اور بولا "آؤ میرے ساتھ میں دیکھتا ہوں وہاں کونسی چڑیل بیٹھی ہے۔" ڈرے ہوئے لڑکوں نے اسے ہتیارا دکا مگر کاشف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے بعد مشکل لڑکوں کو ساتھ چل کر دُور سے بیری کے درخت پر کوئی چیز بیٹھی دکھانے کو کہا۔ چنانچہ سب لڑکے اس کے ساتھ گلی کے اُس آخری حصے تک آئے جہاں مکانوں کی ایک قطار کے بعد بیری والی گراؤنڈ شروع ہوتی تھی اور بیری والا درخت گراؤنڈ کے دوسرے سرے پر باغ کے کنارے تھا۔

جب وہاں پہنچے تو ایک لڑکے نے پھر کہا کہ وہ جا کر کاشف کے گھر والوں کو بتاتا ہے کہ کاشف ایک خطرہ مول لے رہا ہے۔ مگر اس کا کاشف پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کاشف نے جب دُور سے پہلی نظر بیری کے درخت پر ڈالی تو ایک لمحے کے لئے وہ بھی سہم گیا واقعی ملگجے اندھیرے میں دُور درخت پر جیسے کوئی سیاہ رنگ کی

دو ٹانگوں والی چیز بیٹھی ہو۔ لیکن جلد ہی کاشف نے حواس پر قابو پایا اور دماغ پر زور دینے لگا کہ یہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ کیونکہ اُسے اپنے والد کی باتوں سے پکا یقین تھا کہ بھوت چڑیل وغیرہ نہیں ہوتے۔ غور کرتے ہوئے اس کے ذہن میں ایک بات آئی۔

اور وہ پھر درخت کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ اور پھر تمام لڑکوں سے بولا "تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آیا۔ اس پر ایک لڑکا بولا "بہانہ بنا کر نہ بھاگو۔ مان جاؤ کہ وہ درخت پر چڑیل بیٹھی ہے اور ہمیں دیکھ کر دانت نکال رہی ہے۔ کاشف کو یہ سن کر غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے بولا "دوستو تم جانتے ہو میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا اور میں وعدے کا بھی پکا ہوں۔ تم صرف تھوڑی دیر میرا انتظار کرو میں ابھی آیا اور پھر تیز تیز چلتا ہوا گلی میں غائب ہو گیا اس کے جاتے ہی لڑکے قیاس آرائیاں کرنے لگے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے والد کی بندوق لائے گا۔ بے شک رائفل توپ بھی لے آئے یہ چڑیل کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا بلکہ چڑیل اُسے توپ کے گولے کی طرح پھینک دے گی۔ ایک اور بولا "ہو سکتا ہے رحم کھا کر چڑیل اس کی رانی ہی بن جائے۔

غرض جتنے مُنہ اتنی باتیں۔ قریب تھا کہ ڈر کے مارے تمام لڑکے وہاں سے بھاگ جاتے کہ کاشف تیزی سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کافی لمبا بانس تھا جس کے ایک سرے پر مڑا ہوا چاقو لگا ہوا تھا جیسے بکریاں چرانے والوں کے پاس ہوتا ہے۔ اور پھر بغیر کچھ کہے وہ تیزی سے چلتا ہوا بیری کے درخت کے پاس گیا اور بانس کو اوپر درخت کی طرف کر کے کچھ کرنے لگا سہمے ہوئے لڑکے اُسے دور سے ایسا کرتے دیکھ رہے تھے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آخر تھوڑی دیر بعد واقعی وہ چڑیل نما چیز درخت سے غائب تھی اور کاشف بھی بانس سنبھالے واپس آ رہا تھا۔ تمام لڑکے کہنے لگے چونکہ ہم بھی قریب تھے اس لئے وہ چڑیل غائب ہو گئی ہے۔

مگر جب کاشف قریب آیا تو اس کے ہاتھوں میں بانس کے علاوہ ایک اور سیاہ رنگ کی چیز تھی جسے اس نے لڑکوں کے آگے پھینک دیا۔ اور بولا "یہ لو یہ رہی چڑیل جس سے تم ڈر رہے تھے۔ ایک لڑکے نے لالٹین جلا کر دیکھا تو یہ ایک بڑی سی شلوار تھی جو شام کے وقت آندھی میں اُڑ کر اس بیری والے درخت پر آ رہی تھی اور کچھ اس طرح ٹہنیوں میں اٹک گئی تھی جیسے کوئی انسان نما چیز اوپر بیٹھی ہل رہی ہے شلوار کو دیکھ کر سب ہنسنے لگے اور مان گئے کہ کاشف ٹھیک کہتا ہے کہ کوئی چڑیل بھوت نہیں ہوتے۔ یہ صرف وہمی لوگوں کے خیالات ہوتے ہیں جن سے وہ اندھیرے وغیرہ میں یا اُجاڑ جگہوں پر ڈر جاتے ہیں کاشف نے دوستوں کو بتایا کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ جن اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں مگر جنوں کے متعلق جس طرح کہانیاں گھڑی گئیں ہیں وہ درست نہیں ہیں۔ اس واقعہ کے بعد دوستوں کے دلوں سے وہم اور خوف کسی حد تک کم ہو گیا۔

ماہنامہ

آنکھ مچولی

اچھا پڑھیے

آگے بڑھیے

آپ کی علمی ضرورت بھی ہے اور آپ کے ادبی
اسے باقاعدگی سے پڑھنے کے لئے اور اس کے حصول کو آسان بنانے کے لئے
ہماری خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہو جائیے

اس میں مالی منفعت بھی ہے اور علمی فائدہ بھی
اسے حاصل کرنے کی ذمہ داری ہم پر ڈال دیجئے

ماہنامہ آنکھ مچولی (خصوصی بچت اسکیم) گرین گائیڈ اکیڈمی ڈی۔ ۱۱۲ سائٹ کراچی نمبر ۱۶

خصوصی بچت اسکیم

۱۲ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے $\frac{۱۲۰}{۹۰}$ روپے

۲۴ شماروں کی قیمت (مع خصوصی شمارے) رجسٹرڈ ڈاک سے $\frac{۲۴۰}{۱۸۰}$ روپے

مالی فائدے کے علاوہ زحمت سے نجات رسالے کی بحفاظت ترسیل اور ۲ سالہ ممبر شپ پر قیمتی کتب بلا معاوضہ

میں ماہنامہ "آنکھ مچولی" کی خصوصی بچت اسکیم میں شامل ہونا چاہتا/ چاہتی ہوں
اس کوپن کے ساتھ $\frac{۱۲}{۲۴}$ شماروں کی قیمت مبلغ..... روپے کا بینک ڈرافٹ/پوسٹل آرڈر
منی آرڈر کی رسید منسلک ہے ـــــ میرے نام حسب ذیل پتے پر ماہ ..... سے ماہنامہ
جاری کر دیا جائے۔

نام _____

مکمل پتہ _____

کوئی ضروری ہدایت _____

فون نمبر _____ دستخط _____

دو گندے گندے بچے

احمد حاطب صدیقی

"چچی کی بچی"

"چچی کی بچی"

بے چاری نئی نویلی دلہن چچی اپنے خوشبوؤں سے مہکتے ہوئے سجے سجائے کمرے میں سمٹی ہوئی بیٹھی تھیں۔ عمیر



اور حمنیٰ دروازے کے پردے میں سے منہ ڈال ڈال کر ایک ساتھ چلّا رہے تھے۔

"چچی کی بچی"

"دال دال کچی"

"دال میں مسالا"

"چچی کا میاں کالا"

اتنے میں دادی اماں آتی نظر آئیں۔

"ارے کمبختو! اپنے چچا ہی کو کالا کہہ رہے ہو؟ بھاگو یہاں سے!"

اور وہ دونوں بھاگے۔ اب ذرا دلہن چچی کو سکون ملا اور انہوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ورنہ گھنٹہ بھر سے دونوں بدتمیز بچے ان کے کان کھا گئے تھے اور شور مچا مچا کے ایک آفت اٹھا رکھی تھی۔

دلہن چچی تو خیر اس گھر میں ابھی تھیں ہی دو تین دن کی۔ اس لئے بظاہر مسکرا مسکرا کر اور شرما شرما کر رہ جاتیں ورنہ اندر سے تو وہ بھی کھول رہی ہوں گی اور ان کا جی بھی چاہتا ہو گا کہ دونوں کو ایک ایک ایسا زوردار جھانپڑ رسید کیا جائے کہ منہ ہی ٹیڑھا ہو جائے۔ مگر وہ بے چاری تو دلہن تھیں۔

آپ خود ہی سوچئے کہ بھلا کوئی بچہ نئی نئی دلہن سے یوں پیش آتا ہے؟ بچوں کو تو دلہن کا کمرہ بہت اچھا لگتا ہے اور خود دلہن بھی بہت پسند آتی ہے اور دوسرے بچوں کو تو دلہن چچی پسند بھی بہت تھیں وہ ہر وقت انہیں گھورے رہتے۔ بس عمیر اور حمنیٰ کے آتے ہی سارے بچے کھسک لیتے اور ادھر اُدھر ہو جاتے۔ دونوں بدتمیز جو تھے۔

انتہائی گندے بچے۔ چھوہڑ، بدزبان اور شیطان۔ ہر بچہ ان سے پناہ مانگتا تھا۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے کہ بچے بس دو ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ یا تو وہ اچھے بچے ہوتے ہیں یا گندے بچے۔

اچھے بچوں کی عادتیں اچھی ہوتی ہیں۔

اور گندے بچوں کی گندی گندی عادتیں ہوتی ہیں۔

عمیر اور حمنیٰ دونوں ہی گندے بچے تھے۔ اور کوئی بچہ ان کو پسند نہیں کرتا تھا۔

عمیر صاحب کا حال یہ تھا کہ جب بھی بچوں کے پاس سے گذرتے۔ یا تو انہیں اس زور کا دھپ رسید کرتے کہ وہ بچارے گرتے گرتے بچتے۔ یا کسی کی پیٹھ پر سوار ہونے کی کوشش کرتے یا کسی کے چٹکی نوچ لیتے اور خدا کی پناہ! عمیر کی انگلیاں تھیں یا سیخ کباب میں لگنے والی سلاخیں۔ بچوں کے پیٹ میں تو عمیر کی انگلیاں بس

اندر گھستے گھستے رہ جاتیں۔

اور حمنیٰ صاحبہ بھی کچھ کم نہ تھیں۔ کسی بچے کو دھکا دے دیا۔ کسی کے بال نوچ لئے۔ کسی کی ٹانگ میں اڑنگا لگا کر اس کو گرا دیا اور کبھی کسی کو اس طرح نوچ کھسوٹ ڈالا کہ بے چارے کے آنسو ہی نکل آئے۔ حمنا کے ناخن بھی گندے اور بڑھے ہوئے رہتے تھے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر دوسرے بچوں نے ان دونوں شیطانوں کو مار مار کے اُلو کیوں نہیں بنا دیا۔ ہو سکتا ہے کہ آپ یہ کہہ رہے ہوں کہ:

"اگر ہم ہوتے تو ایک منٹ میں دونوں کا بھرکس نکال دیتے"

تو بات اصل میں یہ تھی کہ یہ دونوں صرف اپنے سے چھوٹے بچوں کے ساتھ شیطانیاں کرتے تھے ورنہ تو دوسرے بچے بھی ان کو جھانپڑ رسید کرتے، دھکے مار کر گرا دیتے۔

چٹکی بھی نہیں "پٹکا" نوچ لیتے۔ اور ان کے پیٹ میں بھی اپنی انگلیاں گھونپ دیتے۔ لیکن وہ بچے اتنے چھوٹے تھے کہ ان کی شکل دیکھ کے ڈرتے تھے اور ان کی پوری پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ کس طرح عمیر اور حمنیٰ کے سائے سے بچتے رہیں اور ظاہر ہے کہ آپ بھی یہی کہیں گے کہ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں دوسروں کو تنگ کرنا کون سی اچھی بات ہے۔

دلہن چچی بے چاری نئی نئی آئی تھیں اور ان دونوں نے اپنی بدتمیزیاں ان کے سامنے بھی شروع کر دیں مگر دلہن چچی تھیں بہت اچھی۔ ان بدتمیزیوں کے باوجود ان سے پیار کرتیں انہیں کہانی بھی سناتی تھیں اور ان کو اچھا بچہ بننے کے طریقے بھی سکھاتی تھیں۔ مگر کہیں لاتوں کے بھوت بھی باتوں سے مانتے ہیں؟ ان کے تھپڑ مکے، لات دیسے ہی چلتے رہے اور چھوٹے بچے ان سے تنگ آتے رہے۔

ایک روز تو انہوں نے دن بھر وہ اُدھم مچایا وہ شیطانیاں کیں کہ ابو کو بھی غصہ آ گیا اور انہوں نے اُس ان کی ایسی اعلیٰ پٹائی کی کہ انہیں تو خیر دن میں تارے نظر آ گئے لیکن سارے بچوں کا دل خوش ہو گیا بلکہ ننھی عفت نے تو خوش ہو کر بچوں میں ببل گم بھی بانٹی۔

اُس روز بھی دلہن چچی ہی ان کے کام آئیں۔ ان دونوں کو اپنے کمرے میں لے گئیں اور وہیں ان کو سلا لیا

اس زبردست پٹائی کے باوجود انہوں نے شرارتوں سے باز آنے کا فیصلہ نہیں کیا۔

چچی تو انہیں لٹا کر کہانی بھی سنانے لگیں، مگر عمیر کو اچانک محسوس ہوا کہ کسی نے اسے ایک لفافہ تھمایا ہے۔

اس نے چپکے سے حمنیٰ کو ساتھ لیا اور باہر چاندنی میں آ کر لفافہ کھولا۔

"نٹ کھٹ بونوں اور ملکہ عالیہ پری نیلوفر کی جانب سے کل چورنگی والے پارک میں رات بارہ بجے ایک پارٹی ہو رہی ہے۔ آپ ضرور تشریف لائیے۔"

عمیر اور حمنیٰ دونوں حیران رہ گئے۔ "نٹ کھٹ بونوں اور نیلوفر پری کی طرف سے پارٹی؟

یقیناً نٹ کھٹ بونے بہت سارے کھیل بھی کھیلیں گے اور .... ہاں ..... اُفوہ !!!!!

ہم پریوں کی ملکہ، عالیہ نیلوفر اور شاہ دان کے بادشاہ سے بھی مل سکیں۔ بھئی واہ اور مزے مزے کی ٹافیاں حلوے مٹھائیاں، پلاؤ کباب اور پھل ..... کتنی ساری چیزیں ہوں گی"

"میرا خیال ہے کہ اس پارٹی میں دوسرے بچّوں کو بھی بلایا گیا ہوگا"

عمیر نے حمنیٰ سے دعوت نامہ واپس لیتے ہوئے کہا۔

مگر جب انہوں نے دوسرے بچّوں سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ان کے علاوہ کسی کو دعوت ملی ہی نہیں۔

حمنیٰ تو اس بات پر اتنی خوش ہوئی کہ فوراً ہی قریب کھڑی ہوئی عائشہ کو ایک زوردار دھپ رسید کیا اور اس کی ٹانگ میں اڑنگا لگا کر اُسے ڈھیر کر دیا۔

دونوں بہت خوش تھے اور بہت ہی زیادہ اِترا رہے تھے کہ

"صرف ہم دونوں کو بونوں اور پریوں نے دعوت میں بلایا ہے"

"اے امی! تم کو جلن نہیں ہو رہی ہے کہ بونوں اور پریوں نے تم کو دعوت میں نہیں بلایا"

عمیر نے شمیل سے پوچھا اور پوچھتے پوچھتے اس کے اس زور کی چٹکی نوچی کہ بے چارا بلبلا کر دور گیا۔

اصل میں ان دونوں کے ہاتھ اپنے قابو میں رہتے ہی نہیں تھے۔

اگلی رات بھی ایک دم آگئی۔ عمیر اور حمنیٰ جھوٹ موٹ میں سوئے ہوئے تھے۔ بارہ بجے کے قریب وہ اُٹھے حمنیٰ نے اپنا گلابی رنگ کا بہترین فراک پہنا، جو وہ ہمیشہ دعوتوں میں شرکت کے موقع ہی پر پہنا کرتی تھی عمیر نے بھی اپنا سب سے اچھا کپڑا نکال کر پہن لیا۔ چپکے سے باہر نکلے اور چورنگی والے پارک کی طرف روانہ ہو گئے۔

ہر طرف ہُو کا عالم تھا۔ مینڈک ٹرا رہے تھے۔ جھینگروں نے زُوں زوں کی گھومتی ہوئی آواز نکال نکال کر رات کو اور خوفناک بنا رکھا تھا۔ دور سے صرف چوکیدار کی سیٹی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ ڈر تو لگ رہا تھا مگر پریوں کی پارٹی کے شوق میں دونوں چورنگی والے پارک کی طرف بڑھے جا رہے تھے۔

"بسم اللہ۔ کتنا مزہ آئے گا۔"

حمنیٰ کی تو باقاعدہ رال ٹپک رہی تھی۔

"ہو سکتا ہے کہ وہاں مزے مزے کے کھیل بھی ہوں" عمیر نے رائے دی۔

جیسے ہی وہ پارک کے قریب پہنچے ان کو اُچھل کود اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔

"ای ای ای ی ی ی !!!!"

"بام ... بام .... بم بم بم"

"ٹوٹی ٹوٹ۔ ٹوٹی ٹوٹ ....."

غرض یہ کہ طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اندر پہنچ گئے۔

جیسے ہی وہ پارک کے قریب پہنچے ان کو اُچھل کود اور شور مچانے کی آوازیں آئیں۔

"ای ای ای ی ی ی !!!!"

"بام۔ بام۔ بم بم بم"

"ٹوٹی ٹوٹ۔ ٹوٹی ٹوٹ۔۔۔۔"

غرض یہ کہ طرح طرح کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ جلدی سے اندر پہنچ گئے۔

جیسے ہی وہ اندر داخل ہوئے انہوں نے دیکھا کہ سینکڑوں ننھ کھٹ بونے جن کے قد بچوں ہی کے برابر تھے۔ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ دوڑ کر رہے ہیں۔ اُچھل رہے، جمپ لگا رہے ہیں خوشی میں چیخ چلّا رہے ہیں۔

اچانک انہوں نے دونوں بچوں کو دیکھ لیا اور دوڑتے ہوئے ان کی طرف آئے۔

"ادھر عمیر اور حمنیٰ! آؤ بھئی آؤ۔ ہمیں پوری امید تھی کہ تم لوگ ضرور آؤ گے۔

ہم نے صرف تمہی دونوں بچوں کو بلایا تھا۔ ہمیں کسی اور کو بلانے کی اجازت ہی نہیں ملی تھی"

بونے ان دونوں کو کھینچ کر اپنے ساتھ لے گئے۔

"آؤ میرے ساتھ کھیلو!" ایک خوب موٹے تازے بونے نے حمنیٰ کو پکڑا اور اُس کے بازو تھام کر اُسے بہت ہی زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔

عمیر کو تین بونوں نے پکڑ لیا اور تینوں نے مل کر اُسے نچانا شروع کر دیا۔

یہ انتہائی خطرناک کھیل تھا، کیوں کہ جب ایک بونا انہیں گھما گھما کر اور نچا نچا کر بدحواس کر دیتا تو فوراً ہی دوسرا انہیں پکڑ لیتا اور پہلے سے زیادہ زور زور سے نچانا شروع کر دیتا تو فوراً ہی دوسرا انہیں پکڑ لیتا اور پہلے سے

بھی زیادہ زور زور سے نچانا شروع کر دیتا تو فوراً ذرا دیر کو اگر انہیں چھوڑا بھی جاتا تو مارے چکروں کے دونوں لڑکھڑا لڑکھڑا کر گرنے لگتے۔ کوئی چالیس پچاس بونے ان دونوں سے کھیل رہے تھے اور باقی تماشا دیکھ رہے تھے بچاروں پر بڑا برا وقت پڑ گیا تھا۔ آخر میں تو حمنیٰ بے چاری گر ہی گئی اور عمیر کے اوپر تین بونے ڈھے گئے۔

حمنیٰ کی خوبصورت فراک تار تار ہو گئی تھی اور جگہ جگہ سے دھاگوں کے گچھے لٹک گئے تھے۔

"امی تو برا حشر کر دیں گی" حمنیٰ نے فکرمندی سے اپنی نچی اور پھٹی ہوئی فراک کو دیکھا۔ اتنے میں ایک بونا دوڑتا ہوا آیا اور حمنیٰ کے کان میں چلایا۔ "ہوں۔ ہوں اوں اوں اوں" پھر کہنے لگا کہ۔

"میں ریل کا انجن ہوں اور سرنگ میں سے گذر رہا ہوں" اس کے ساتھ ہی اس نے عمیر کے کان میں اپنا منہ گھسیڑ دیا۔

"ژوں اوں اوں اوں ..... چھکا چھک چھکا چھک، چھکا چھک"

یہی حرکت عمیر اور حمنیٰ بھی دوسرے بچوں کے ساتھ کیا کرتے تھے مگر اس وقت تو ان کو بڑی خوشی ہوتی تھی اب کوفت کے مارے برا حال تھا۔ بلکہ حمنیٰ تو ہاتھ چھڑا کر بھاگنے بھی لگی تھی۔ لیکن بونوں نے اُسے پھر پکڑ لیا اور پتہ ہے۔ پکڑا بھی اس کے ربن سے اس کی تو چیخ ہی نکل گئی۔

اتنے میں کسی نے آواز لگائی کہ "آؤ آرم پارم کھیلتے ہیں"

سب بونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر ایک دائرہ بنا لیا اور گانے لگے۔

آرم پارم چھما چھم جیل سے نکلے جیسے ہم"

اور ..... گر پڑے ہم" کہنے کے ساتھ ساتھ سب کے سب عمیر اور حمنیٰ پر گرنے کی کوشش کرتے۔ دونوں کا بھاگ بھاگ کر اور جان بچا بچا کر برا حال ہو گیا۔

اس کھیل سے نجات ملی تو ..... "ادھر کا تالا توڑوں گا" ..... شروع ہوا۔

بونوں نے دائرہ بنایا اور حمنیٰ اور عمیر کو دائرے کے اندر کر لیا۔ ان دونوں سے کہا کہ تم اس دائرے سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ اور کہو۔ "ادھر کا تالا توڑوں گا"

چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ جب بھی وہ کسی دو بونوں کے درمیان سے نکلنے کی کوشش کرتے اور کہتے کہ۔

"ادھر کا تالا توڑوں گا"

یا حمنیٰ کہتی کہ "ادھر کا تالا توڑوں گی"

تو وہ بونے چلاتے کہ "سپاہی کو بلاؤں گا"

اور ان کو لاتوں سے مار مار کے دور گرا دیتے۔ حمنیٰ بچاری تو ایک بار اس زور سے گری کہ اس کو ایسا

محسوس ہوا کہ جیسے کمر کی ہڈی ہی ٹوٹ گئی ہو۔

"دوڑو عمیر۔ دوڑو حمنیٰ اور باہر نکلو" ان کے گرنے کے بعد بونے چلانے لگتے اور وہ جب بھی باہر نکلنے کی کوشش کرتے ان کا یہی حشر ہوتا۔ اس کے بعد چٹکیاں نوچنے کا مقابلہ ہوا اور اس بری طرح کے خدا کی پناہ۔۔ کسی طرح یہ کھیل بھی ختم ہوا۔

اتنے میں اچانک سارے بونے ہاتھ باندھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور دونوں کو ذرا سکون کا سانس لینے کا موقع ملا۔

اچانک وہ دونوں یہ دیکھتے ہیں کہ ایک انتہائی خوبصورت اور ہنس مکھ پری جس کے لمبے لمبے سنہرے پر اور سنہرے سنہرے بال تھے آسمان سے اڑتی ہوئی نیچے اتر آئی۔

"ملکہ عالیہ پری نیلوفر۔ ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں" تمام بونوں نے ایک ساتھ آواز میں آواز ملا کر کہا

"تمہارا کیا حال ہے اچھے بونو! پری نے مسکرا کر حال پوچھا اور حمنیٰ اور عمیر کی تو جان ہی جل گئی کہ یہ شیطان صفت بونے بھلا اچھے بونے کہے جا سکتے ہیں؟

"ہم بالکل ٹھیک ہیں" تمام بونوں نے جواب دیا۔

"مجھے امید ہے کہ تمہارے دونوں مہمانوں کو بھی تمہارے ساتھ ساتھ مزہ آ رہا ہو گا" پری نیلوفر نے دونوں بچوں کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

یہ سن کر عمیر اور حمنیٰ آنسوؤں سے رونے لگے۔ حمنیٰ سسکیاں بھر کر بولی۔

"ان کی پارٹی بہت گندی، خراب، بکواس اور مصیبت ہے" پھر اس نے نیلوفر پری کو اپنے کپڑوں کی طرف متوجہ کیا۔

"میرا اتنا پیارا فراک ان لوگوں نے پھاڑ ڈالا۔ مجھے لاتیں رسید کیں۔ بال پکڑ کر مجھ کو کھینچا۔ اور عمیر کا بھی یہی حال کیا۔ اور ہم دونوں کو ہاتھ پکڑ پکڑ کر اتنا گھمایا کہ مارے چکروں کے ہمارا برا حال ہو گیا۔ اور ہاں ہم دونوں کے موٹی موٹی چٹکیاں بھی نوچیں۔"

عمیر اور حمنیٰ دونوں کے چہرے لال ہو رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اور کیا کہیں۔ "لیکن تم دونوں تو یہی باتیں تو پسند کرتے تھے۔ کیوں ایسا نہیں ہے کیا؟" پری نیلوفر نے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" حمنیٰ نے روتے ہوئے کہا۔

"لیکن ہمیں دوسروں کے ساتھ ایسا کرنے میں مزا آتا تھا۔ جب خود ہمارے ساتھ یہی کچھ ہونے لگا تو ہم کو پتہ چل گیا۔ ہمیں بالکل بھی اچھا نہیں لگا۔ تکلیف کے مارے حال خراب ہو گیا" یہ سن کر سارے بونے ہنسنے لگے

"یہ کتنی غلط بات ہے..." پری نے غصّہ میں کہا "کیا جب دوسروں کے ساتھ تم یہ سلوک کرتے ہو تو ان کو اچھا لگتا ہوگا؟ ان کو تکلیف نہیں ہوتی ہوگی"

"ہوتی ہوگی" عمیر نے شرمندگی سے کہا۔ اور پھر بڑی لجاجت سے بولا کہ

"اچھی پری! ہم ایسے کام کرتے تھے جو دوسروں کو پسند نہیں آتے۔ اور اب یہ حرکتیں ہمیں بھی پسند نہیں، کیوں کہ ہمارے ساتھ بھی جب یہ سلوک کیا گیا تو ہم کو اچھی طرح پتہ چل گیا کہ دوسروں کو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ آپ پلیز! ہمیں گھر جانے دیں۔ ہمیں اچھی طرح سبق مل گیا ہے!"

"ٹھیک ہے! تم جا سکتے ہو!" ملکہ عالیہ پری نیلوفر نے شاہانہ انداز سے کہا۔

"لیکن ایک بات یاد رکھو۔ اگر تم آئندہ بھی ایسی حرکتیں کرتے رہے تو اگلی مرتبہ یہ نٹ کھٹ بونے تمہیں خود اٹھا کر لے آئیں گے۔ اس مرتبہ تو تمہاری لاپرواہی تمہیں یہاں کھینچ لائی تھی۔ جاؤ۔ اور اچھے بچّوں کی طرح رہو۔ شاباش"

پھر تو وہ دونوں سر پر پاؤں رکھ کر ایسے بھاگے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔

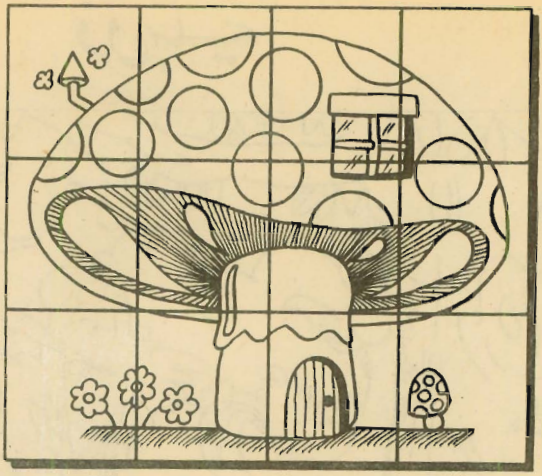
بونے ان کو بھاگتا دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ ان کو اب دعوت کا اور مزے مزے کے کھانوں کا ذرا بھی خیال نہیں آ رہا تھا۔ بس سر پٹ بھاگتے چلے جا رہے تھے۔

اگلے ہی لمحہ عمیر دنگ رہ گیا۔ دلہن چچی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھیں اس کو یاد آیا کہ رات کی زبردست پٹائی کے بعد... مگر کون سی پٹائی؟ بونوں والی نہیں.... جو پٹائی ابّو نے کی تھی... اس پٹائی کے بعد دلہن چچی انہیں پریوں اور بونوں کی کہانی سنا رہی تھیں کہ اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ پھر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ اُسے کسی نے لفافہ تھما دیا ہے..... اور باقی تو آپ کو پتہ ہی ہے..... مگر اس سے ایک فائدہ ضرور ہوا۔ وہ یہ کہ اپنا خواب عمیر نے حمنیٰ کو بھی سنایا اور دونوں نے پکا وعدہ کیا کہ اب وہ بچوں کو، خاص طور پر اپنے سے چھوٹے بچّوں کو تو بالکل ہی نہیں ستائیں گے۔ ان کو دھکّے دیں گے نہ لات رسید کریں گے۔ چٹکیاں نوچیں گے اور اور نہ اڑنگا لگائیں گے اور پھر ہوا بھی یہی۔ دونوں اچھے بچّے بن گئے۔ اور سارے بچوں سے ان کی دوستی ہو گئی۔ شام کو سب بچّے لان میں جمع ہو کر وہی کھیل کھیلتے جو بونوں نے عمیر اور حمنیٰ کے ساتھ کھیلے تھے وہ پٹائی والی حرکتیں کوئی نہیں کرتا تھا اور بڑا مزہ آتا تھا۔

فرق بتائیے



آئیے بنیں آرٹسٹ





اچھی بہن

محمد جاوید خالد

ابھی فاطمہ کی عمر ہی بھلا کیا تھی ؟ صرف دو سال جب اس کی ماں کا انتقال ہوگیا۔ کتنی بڑی قیامت تھی جو ننھے سے دل پر گزر گئی۔ بچوں کے لئے ماں سے زیادہ مخلص اور محبت کرنے والی ہستی اور کوئی نہیں ہوسکتی اور جو بچے بہت چھوٹے ہوتے ہیں ان کی تو ساری دلچسپیوں کا مرکز ہی ماں ہوتی ہے۔

فاطمہ کے ابّا ایک تاجر تھے ان کا اکثر وقت کاروبار کی نگرانی میں صرف ہوجاتا تھا۔ ایک اچھی بات البتہ یہ ضرور تھی کہ فاطمہ کے بہن بھائی ایک دوسرے کے ساتھ محبّت سے پیش آتے تھے۔ چنانچہ ننھی فاطمہ کا وقت اب اپنے دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ گزرتا اور وہ ان کی باتوں سے دل بہلایا کرتی۔ بچوں کی باتیں بھی خوب ہوتی ہیں۔ پڑوس کے بچوں کے بارے میں کسی نئے کھیل کی ایجاد پر، کسی شرارت کے موضوع پر، جماعت میں ماسٹر یا مس کی کسی بات پر غرضیکہ فاطمہ یہ ملی جُلی باتیں بڑے شوق سے سنتی اور اس ماحول میں بڑی ہوتی رہی۔

فاطمہ کا ایک بڑا بھائی محمد علی اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلینڈ گیا ہوا تھا۔ اس بھائی کی باتیں وہ سب سے زیادہ دلچسپی سے سُنتی اور خوش ہوتی۔ اس کے خط کا وہ بڑی شدّت سے انتظار کرتی اور پھر خط پر ہونے والی باتوں میں نہایت توجہ اور ذوق شوق سے حصّہ لیتی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود محمد علی کو بھی اپنی اس چھوٹی بہن سے بہت پیار تھا۔ اور جب جب اس کا اظہار ہوتا فاطمہ خوشی سے پھولے نہ سماتی۔

پرائے دیس میں نوجوان محمد علی نے سخت محنت کی اور اپنے وقت کو اِدھر اُدھر ضائع کرنے کے بجائے اپنے مقصد کو سامنے رکھا اور آخر کار اس نے وکالت کا امتحان پاس کرلیا۔ اب وہ ایک بہت بڑا وکیل

تھا۔ وطن واپس لوٹا تو اس کے پاس علم کا خزانہ تھا۔ اپنے دیس میں وہ ماں کو نہ پا کر اُداس تو ہوا لیکن بہن بھائیوں کی محبت نے اس کی اداسی کو بڑی حد تک کم کر دیا اور ننھی فاطمہ کی تو بات ہی الگ تھی۔ اس کی معصوم اور بھولی بھالی باتیں اسے بہت لطف دیتیں۔

محمد علی نے اپنی عملی زندگی کے لئے بمبئی کا انتخاب کیا جو ایک بڑا شہر تھا۔ بڑے شہروں میں کام کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں لیکن یہ بھی ہے کہ نئے آدمی کو پاؤں جمانے کے لئے سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔ محمد علی جوان تھا اور مضبوط حوصلے کا مالک، اپنی محنت سے اس نے اپنا مقام بنانا شروع کر دیا اور بہت جلد اس کا شمار شہر کے اچھے وکیلوں میں ہونے لگا۔ لیکن ایک حادثہ ابھی اور اس خاندان کے ساتھ ہونا تھا۔ محمد علی کے والد بھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔ فاطمہ کی عمر اس وقت سات سال تھی۔ موت برحق ہے محمد علی، فاطمہ اور ان کے دوسرے بہن بھائیوں کو بھی اللہ کے اس حکم کے آگے سر جھکانا پڑا۔

محمد علی آبائی شہر سے جب دوبارہ بمبئی لوٹے تو فاطمہ کو اپنے ساتھ لیتے آئے اور اسے یہاں کے بہترین اسکول میں داخل کرا دیا۔ اب فاطمہ نے علمی زندگی کے سفر کا آغاز کیا۔ محمد علی خود ایک اُصولی آدمی تھے۔ راست باز اور حق گو۔ وہ کوئی بات یا کام غیر اُصولی نہ کرتے تھے اور اُصولوں کے لئے بڑے سے بڑے طوفان سے ٹکرا جانے کی ہمت رکھتے تھے۔ فاطمہ کو اسکول میں اچھے اساتذہ اور پڑھائی ملی اور گھر میں بھائی کی بہترین تربیت، چنانچہ وہ ساری اچھی باتیں جن سے محمد علی کی زندگی جگمگ جگمگ کر رہی تھی، آہستہ آہستہ فاطمہ بھی سیکھتی جا رہی تھی۔

وقت گزرتا رہا یہاں تک کہ دو اہم واقعات ہوئے ایک تو یہ کہ محمد علی کو قدرت نے ایک اچھی شریکِ حیات بخشی۔ دوسرے یہ کہ فاطمہ نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کر کے دندان سازی کا کورس کرنا شروع کر دیا یوں بہن بھائی میں عارضی دُوری پیدا ہو گئی۔ لیکن فاطمہ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر اتوار کو دوپہر کا کھانا اپنے بھائی اور بھابھی کے ساتھ کھایا کرتی۔

محمد علی نے مُلکی سیاست میں بھی حصّہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اور اپنی خداداد صلاحیتوں اور محنت کی بنا پر وہ یہاں بھی کامیاب ہوئے اور گنتی کے چند ایسے سیاستدانوں میں گنے جانے لگے۔ یہ اس وقت کی بات ہے کہ جب پاکستان قائم نہیں ہوا تھا اور ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ محمد علی کی کوششیں تھیں کہ ہندو اور مُسلمان مل جل کر رہیں اور مُشترکہ طور پر آزادی کی جدوجہد کریں۔ اپنی ان کوششوں میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

اچانک ہی محمد علی کی اہلیہ بیمار ہوئیں اور یہ بیماری اتنی بڑھی کہ ان کی جان ہی لے کر چھوڑی۔ محمد علی کے لئے یہ صدمہ بڑا شدید تھا۔ ان کی ساری گھریلو زندگی برباد ہو کر رہ گئی۔ گھر تو بنتا ہی عورت سے ہے۔ گھر میں عورت کا نہ ہونا محمد علی کی زندگی کو بُری طرح متاثر کرنے لگا۔ فاطمہ سے بھائی کی تباہ حالی نہ دیکھی گئی۔ وہ اپنے سارے کام چھوڑ چھاڑ کر بھائی کے گھر آگئیں اور بھائی کے سکون و آرام کے لئے گھر کا سارا انتظام سنبھال لیا۔

ایک تو بیوی کی موت محمد علی کے لئے رنج کا باعث بنی۔ دوسرا بڑا صدمہ ان کے لئے ہندوؤں کا تعصب بنا۔ اس حقیقت نے انہیں افسردہ کر دیا کہ ہندو مسلمان کو برابر کا درجہ دینے کو تیار نہیں بلکہ انہیں اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ ذہنی سکون کے لئے انہوں نے بمبئی کو خیر آباد کہا اور ایک بار پھر انگلینڈ جا پہنچے۔ فاطمہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ یہاں فاطمہ کو آزاد معاشرے کے مطالعے کا موقع ملا اور یوں انکی صلاحیتیں مزید نکھر گئیں۔ انگلینڈ میں قیام کے دوران محمد علی سے مختلف مسلمان لیڈر آکر ملتے رہے اور انہیں اس بات پر مجبور کرتے رہے کہ اس طرح الگ تھلگ رہنے کے بجائے وہ ہندوستان میں آکر مسلمانوں کی قیادت کریں۔ یہ اصرار آخرکار محمد علی کو پانچ سال کے بعد پھر وطن واپس لے آیا۔ محمد علی اب محمد علی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے متفقہ رہنما محمد علی جناح تھے۔ جناح ان کا خاندانی نام تھا۔ اور کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ وہ محمد علی جناح سے "قائداعظم" ہو گئے۔ فاطمہ اب صرف فاطمہ نہ تھی۔ بلکہ محترمہ فاطمہ جناح ہو گئیں۔ سچ ہے کہ انسان کی محبت، خلوص، سچے جذبے اور لگن اسے وقار اور عزت عطا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کی سیاسی جماعت کا نام "مسلم لیگ" تھا۔ قائداعظم نے اسے منظم کیا۔ محترمہ فاطمہ جناح یہاں بھی ان کے ساتھ ساتھ تھیں۔ قائداعظم نے جو کام مردوں میں کیا محترمہ فاطمہ جناح نے وہی کام عورتوں میں کیا۔ انہوں نے گھر گھر جا کر عورتوں کو بیدار کیا۔ انہیں غلامی کی لعنت سے خبردار کیا اور آزادی کے لئے ہوشیار کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جب آزادی کی تحریک چلی تو مردوں کے ساتھ ساتھ ہزاروں، لاکھوں پردہ دار خواتین بھی شامل ہو گئیں۔ محمد علی کے خلوص کی اس شاہراہ پر بہن بھائی کے ساتھ ساتھ تھی۔ یہاں تک کہ قوم نے انہیں عزت کا سب سے اعلیٰ مقام دیا۔ وہ "مادرِ ملت" کہلائیں۔

مادرِ ملت کی یہ بڑی بہادری تھی کہ سیاسی سرگرمیوں نے انہیں گھر سے غافل نہیں ہونے دیا۔ وہ گھرداری بھی کرتیں۔ بھائی کی صحت کا خیال بھی رکھتیں، آزادی کے لئے خواتین کو بیدار بھی کرتیں۔ قائداعظم نے اپنی پیاری بہن کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

"میں جب بھی گھر واپس آتا ہوں میری بہن میرے لئے روشنی اور اُمید کی کرن بن جاتی۔ میں پریشانیوں میں ہجوم میں گھرا رہتا اور میری صحت بھی خراب ہوتی تو اس کے حسنِ سلوک سے ساری کلفتیں دور ہو جاتی تھیں۔ جب حالات کے طوفان مجھے گھیر لیتے تو میری بہن میری حوصلہ افزائی کرتی تھی۔ اگر یہ میری نگراں نہ ہوتی تو میرے تفکرات کہیں زیادہ ہوتے۔ میری صحت کہیں زیادہ خراب ہوتی۔"

ایک آواز میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مسلمان مرد و عورت سبھی ایک آواز بن گئی۔ آزادیِ پاکستان آخر کار بھائی بہن کی محنتیں اور لاکھوں مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ملک "پاکستان" کا نام چمک اٹھا۔

پاکستان بنتے ہی سب کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ مشرقی پنجاب اور ہندوستان کے دوسرے حصوں سے لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین چلے آرہے تھے۔ ہندوستان نے کشمیر پر قبضہ کیا تو وہاں سے بھی مہاجرین کی آمد شروع ہوگئی۔ یہ لُٹے پٹے مسلمان تھے۔ ان کے گھر بار چھُٹ گئے تھے۔ اور وطن تک پہنچتے پہنچتے بہت سوں کے پیارے عزیز ہندوؤں اور سکھوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ ان کی آبادکاری اور دل جوئی بہت بڑا مسئلہ تھا۔ مادرِ ملت کی کوششوں سے ۱،۳۴،۶۹۸ روپے جمع ہوئے جن سے کپڑے، لحاف، خوراک اور دواؤں وغیرہ کا بندوبست کیا گیا۔ گورنمنٹ ہاؤس کا منظر یہ تھا کہ ایک طرف قائداعظم سرکاری اُمور انجام دے رہے تھے۔ اور دوسری طرف وسیع لان میں مادرِ ملت رضاکار خواتین کے ساتھ مہاجرین کے لئے سوئیٹر بُننے اور لحاف ٹانکنے میں مصروف تھیں۔

۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ء وہ المناک دن تھا جب موت کے بے رحم پنجوں نے پوری قوم سے اس کا باپ اور مادرِ ملت سے ان کا چہیتا بھائی چھین لیا۔ وہ چیخ مار کر اوندھے منہ صوفے پر گر پڑیں۔ وہ بھائی جس کے لئے انہوں نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا تھا۔ ہر پاکستانی اپنے آپ کو بے بس اور بے سہارا محسوس کر رہا تھا۔ مادرِ ملت کو احساس تھا کہ اس کیفیت میں دشمن کا وار نہایت کارگر ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے غم کو چھپا کر قوم کا درد لئے سامنے آگئیں۔ ۲۷ ستمبر ۱۹۴۸ء کو انہوں نے ریڈیو پاکستان کراچی سے قوم کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

"خدا کو منظور نہ تھا کہ قائداعظم پاکستان کی خدمت کے لئے ایک برس سے زیادہ عرصہ زندہ رہ سکتے۔ پھر بھی اس قلیل مدت میں انہوں نے اس کی بنیادیں کافی حد تک مضبوطی

کے ساتھ رکھدی ہیں جن کو آسانی سے ہلایا نہیں جا سکتا۔ میں اس موقع پر قائداعظم کے آخری پیام کے چند الفاظ آپ کو یاد دلاؤں گی۔ خدا نے آپ کو ہر چیز عطا کی ہے۔ آپ کے وسائل لامحدود ہیں آپ کی مملکت کی بنیادیں رکھ دی گئیں ہیں۔ اب اس کی تعمیر آپ کے ذمے ہے۔ آپ کا کام ہے کہ جس قدر جلد اور جس قدر بہتر ہو سکے آپ اس کی تعمیر کریں۔ آئیے!! آگے بڑھیئے!! خدا آپ کا مددگار ہو۔"

بھائی کی وفات نے انہیں توڑ پھوڑ کر رکھدیا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنے بھائی کی نشانی ——— پاکستان۔ کی بہتری کے لئے کوشاں رہیں۔ بھائی کے مزار پر اہلِ وطن سے مخاطب ہوتے ہوئے انہوں نے کہا۔

اُٹھو!! اپنی قوتِ ارادی سے گرتوں کو تھام لو۔ خوابیدہ افراد کو جگا دو۔ یاد رکھو کہ پاکستان تمہارا قیمتی سرمایہ ہے جو لاکھوں قربانیوں کے بعد حاصل ہوا ہے۔ پاکستان کو اس کی عظمت اور وقار کو اغیار کے ہاتھوں میں کھلونا مت بننے دو۔ تمہاری رگوں میں غیرت وحمیت اور آزادی وخودداری کا خون موجزن ہونا چاہیئے۔"

صوبائی عصبیت نے ملک کی جڑوں کو کاٹنا چاہا تو وہ تڑپ کر سامنے آگئیں اور کہا۔

" ہمارے شہیدوں نے جان دیتے وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ کس وطن، صوبے یا ریاست کے رہنے والے ہیں۔ بلکہ انہوں نے صرف ایک مقصد یعنی اسلام اور پاکستان کے لئے اپنی جانیں قربان کی ہیں۔ آزاد مملکت کے آزاد مسلمانوں!! اگر تم ایک قوم کی حیثیت سے زندگی بسر کرنا چاہتے ہو تو اس تفریق اور کش مکش کو فوراً ختم کر دو۔"

۱۹۶۷ء جولائی کی تاریخ کو قائد کی بہن قوم کی ماں دل میں پاکستان اور مسلمانوں کا درد لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئیں لیکن اپنے خلوص اور کارناموں کی بدولت وہ آج بھی زندہ ہیں۔ پاکستان بھر میں کسی اور عورت کی اتنی عزت اور وقعت نہیں جتنی محترمہ فاطمہ جناح کی ہے۔ قوم انہیں " خاتونِ پاکستان" مادرِ ملت" کے ناموں سے یاد کرتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں صداقت کی چمک تھی۔ ان کے ارادے بلند تھے اور وہ عزم واستقلال کا پہاڑ تھیں۔ بھائی کی طرح سچ کو پسند اور خوشامد سے نفرت کرتی تھیں۔ زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گزارنے کے باوجود انہیں اپنی تہذیب پر فخر تھا۔ انہوں نے مغربی لباس کبھی نہیں پہنا۔ ان کے سر پر ہمیشہ دوپٹہ ہوتا تھا۔ وہ نوجوان لڑکیوں سے کہا کرتی تھیں۔ " مغربی تہذیب سے دور رہ کر اپنی مخصوص تہذیب کو اپنائیں۔ یہی زندہ قوموں کا شیوہ ہے۔"

ماہانہ مقابلۂ معلومات

اِم رباب جعفری



دائرۂ معلومات

آنکھ مچولی کے دوسرے سال کے آغاز اور پہلی سالگرہ پر ہم آپ کے لئے یہ نئے سلسلے دائرہ معلومات میں بھی ایک تبدیلی کر رہے ہیں۔ اب ہمارے سوال کا جواب آپ کو ۴ اشاروں کی مدد سے پوچھنا ہوگا۔ آپ کی سہولت کے لئے ہم نے ہر سوال کے صحیح جواب کو دائرہ میں کہیں لکھ دیا ہے اور کچھ اضافی نام بھی ساتھ ہی لکھ دیتے ہیں جن کا سوال سے تعلق ضروری نہیں۔ مقابلے میں شرکت کا طریقہ یہ ہے کہ آپ دائرے میں اپنے مطلوبہ جواب پر سوال نمبر لکھ دیں۔

گویا ۲۰ جوابات پر ایک سے ۲۰ تک کے متعلقہ سوال ڈال دیں اور دائرہ کاٹ کر ہمیں بھجوا دیں۔ دائرے کے بغیر مقابلے میں شرکت ممکن نہیں۔ جوابات بھجوانے کی آخری تاریخ ۲۰ جولائی ہے۔

① (ا) علی وردی خان (ب) پلاسی (ج) کلائیو (د) ۱۷۵۷ء

② (ا) فلسفی (ب) زہر (ج) ۳۹۹ ق۔م (د) افلاطون

③ (ا) افسانہ نگار (ب) جاڑے کی چاندنی (ج) کراچی (د) ۱۹۸۲ء

④ (ا) ۱۸۰۹ء (ب) نظریہ ارتقاء (ج) بحری جہاز "بیگل" (د) ۱۸۸۲ء

⑤ (ا) ڈرامہ نگار (ب) ۱۵۶۴ء (ج) ہیملٹ (د) ۱۶۱۶ء

⑥ (ا) شاعر (ب) ۱۸۳۹ء (ج) خطوط (د) الطاف حسین حالی

⑦ (ا) سعودی عرب (ب) اسلامی سربراہ کانفرنس (ج) ۱۹۷۵ء (د) فیصل آباد

⑧ (ا) باغ (ب) لاہور (ج) شاہجہان (د) علی مردان خان

⑨ (ا) نشانِ حیدر (ب) پاکستان فضائیہ (ج) مطیع الرحمٰن (د) کراچی

⑩ (ا) پشاور (ب) مزاح نگار (ج) زیڈ اے بخاری (د) نیویارک

⑪ (ا) پیغمبر (ب) حضرت یعقوب (ج) احسن القصص (د) زلیخا

⑫ (ا) ۱۹۶۰ء (ب) پہلوانی (ج) غلام محمد (د) زبسکو

⑬ (ا) ملک (ب) فرانک (ج) پیرس (د) ڈیگال

⑭ (ا) انجمن ترقی اردو (ب) پاپڑ (ج) اردو کالج (د) چند ہم عصر

⑮ (ا) شہر (ب) اسلامیہ کالج (ج) قصہ خوانی بازار (د) درۂ خیبر

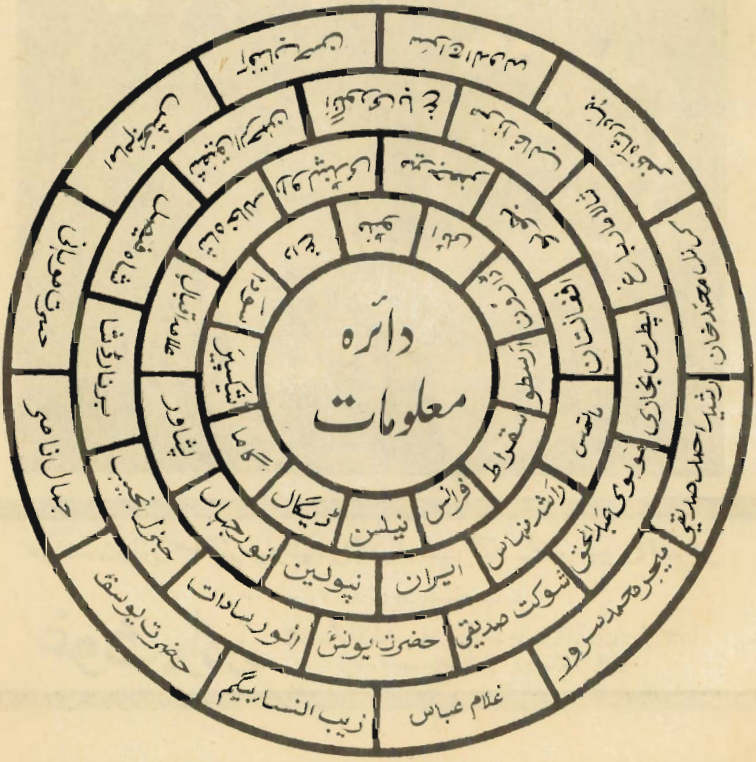
⑯ (ا) شاعر (ب) سیاسی رہنما (ج) سید فضل الرحمن (د) ۱۹۵۱ء

⑰ (ا) ۱۹۷۰ء (ب) مصر (ج) ۱۹۱۸ء (د) نہر سوئز

⑱ (ا) واٹرلو (ب) فرانس (ج) جوزیفائن (د) سینٹ ہیلینا

⑲ (ا) مہرالنساء (ب) مرزا غیاث (ج) شیرافگن (د) شاہدرہ

⑳ (ا) ملک (ب) ڈیورنڈ لائن (ج) روس (د) پاکستان



جہاں حیدری بام۔ وہاں درد کا کیا کام

حیدری پروڈکٹس کراچی کا تیار کردہ بین الاقوامی شہرت یافتہ

اپنی نوعیت کا واحد پاکستانی بام

HYDERY PAIN KILLER BALM

ہر گھر کی ضرورت۔ ہر موسم میں کارآمد

حیدری بام

نزلہ، زکام، کھانسی، بخار، سر درد، جوڑوں کا درد، اندرونی اور بیرونی چوٹ کے لئے موثر فارمولا

FULL SATISFACTION MONEY BACK GUARANTEE



خواہشمند اور مستحکم پارٹیاں ڈیلرشپ کے لئے رجوع کریں

سولے ڈسٹری بیوٹر برائے پاکستان:

غوث برادرز 38۔ گراؤنڈ فلور۔ الآمنہ پلازہ، بالمقابل کیپری سینما ایم۔ اے۔ جناح روڈ۔ کراچی

دائرۂ معلوماتی ۸۷ء کے دُرست جوابات

۱، قائداعظم	۲، منٹو	۳، وارث شاہ	۴، ہیگ
۵، گرل گائیڈز	۶، زرافہ	۷، ہیروڈوٹس	۸، سعودی عرب
۹، بارسلونا	۱۰، الجزائر	۱۱، رجب	۱۲، بیڈن پاول
۱۳، لیلۃ القدر	۱۴، رڈیارڈ کپلنگ	۱۵، گجرات	۱۶، تابعین
۱۷، نیدرلینڈ	۱۸، ڈیگال	۱۹، لاہور	۲۰، روح اللہ خمینی

خوش نصیب ساتھی جو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعام کے حقدار پائے

① ——— ماہ جبیں ناز، اقبال نگر، فیصل آباد

② ——— نیّر توحید، شاہ جمال روڈ، شیخوپورہ

③ ——— امتیاز احمد خان، ملیر، کراچی

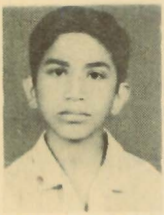
دُرست جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام اور تصاویر



محمد مسعود
ملیر ہالٹ، کراچی



راشد ندیم
ملیر ہالٹ، کراچی



رضی احمد صدیقی
ایف۔بی۔ ایریا، کراچی



محمد غلام حسین
کھائی روڈ، حیدرآباد



آصف النظر
لاڈہ، ضلع چکوال



محمد علی
گلستان کالونی، فیصل آباد



ٹیپو نوید
چشتیاں، بہاولنگر



لیاقت علیخاں
لاڈہ، ضلع چکوال

○ افتخار الحسن، پھالیہ، گجرات ○ نابغہ ناز، اقبال نگر، فیصل آباد، ○ عبدالقدیر، ملیر، کراچی

○ اصغر عباس، فیڈرل بی ایریا، کراچی ○ اکبر عباس، ایف بی ایریا، کراچی ○ رئیس احمد، سمن آباد فیصل آباد

○ شہزاد انور، ریلوے کالونی، راولپنڈی ○ اسمار خورشید، کراچی ○ نامعلوم، سول کوارٹرز، پشاور

○ سمیع الدین، محمود آباد، کراچی ○ عامر آفتاب احمد بلاک ۱۳ ہمرگودھا ○ فرزانہ ارم، کھائی روڈ، حیدرآباد

○ سارہ جاوید زبیری، نارتھ کراچی، ○ محمد بہرام خان، لالہ زار، راولپنڈی ○ عابدہ ملک، گل گشت کالونی، ملتان

○ فیصل احمد عباسی، جھنگ صدر ○ شفیق الرحمن، حالی نگر، حیدرآباد ○ یامین خان، مین بازار، بھکر

○ سلمان کنیل، ملتان روڈ، لاہور ○ نجیب الدین احمد، یونیورسٹی کیمپس پشاور ○ محمد سعید، ملیر، کراچی

○ ابراہیم کھتری، لی مارکیٹ، کراچی ○ عبدالرزاق، بغدادی، کراچی ○ فاروق احمد حبیب بنک، انڈی کوٹل

○ توصیف بیگ، شاہی بازار، حیدرآباد ○ مشتاق احمد اعوان، نیو کراچی ○ سکندر حیات، سول کوارٹرز، پشاور

○ سجاد حبیب، لیاقت آباد فیصل آباد ○ سید محمد علی، لطیف آباد، حیدرآباد ○ ثاقب امام، لوکوشیڈ، روہڑی

○ راجہ آصف علی، کرولی، ضلع چکوال ○ رؤف آرائیں، کنری تھرپارکر ○ عدیل رضا، ایف بی ایریا، کراچی

○ محمد نعیم چاند، لاہور ○ محمد افضل، دریا آباد، کراچی ○ رفیق زاہد، شاہی بازار، گوادر

○ عامر رضا، نیا محلہ، جہلم ○ شہباز حسین، شیر شاہ کالونی، کراچی ○ جاوید حیدر، سٹیلائیٹ ٹاؤن، راولپنڈی

○ محمد اسماعیل راحت، نوکوٹ سندھ ○ یونس شہزاد، رسول پارک، لاہور ○ محمد صابر، ابراہیم پان ہاؤس، گوادر

○ تصویر زہرا، لیاقت روڈ، راولپنڈی ○ بشریٰ بتول، اے بی بینیا، کراچی۔ ○ مزمل حسن محلہ رنجھتی، چنیوٹ

○ نوید اختر، گارڈن روڈ، کراچی ○ راجہ ناصر علی، نرسری، کراچی ○ نوید سعید، حاجی پارک، لاہور

○ شائستہ افسر، پشاور، صدر ○ صدف موسیٰ، میٹھادر، کراچی ○ صلاح الدین، جہلم، چھاؤنی

○ شرجیل محمود، ایف بی ایریا، کراچی ○ مقصود احمد، اورنگی ٹاؤن، کراچی ○ زرین فاطمہ، ایف ۲/۶ اسلام آباد

○ شہباز قمشاد، شومارکیٹ، کراچی ○ انیت صدف، شاہی بازار، حیدرآباد ○ برکت عزیز، گلبہار، کراچی،

○ سلمان ارشد، نارتھ ناظم آباد، کراچی ○ افتخار علی، شاہدرہ، لاہور ○ نجم فرحت، امرپورہ، راولپنڈی

ایک غلط جواب ارسال کرنے والے ساتھی: ○ محمد فیصل رحمن پورہ، لاہور ○ عاصمہ گل، جہانگیر پورہ، پشاور

○ تجمل الیاس، سمن آباد، لاہور ○ عبدالعزیز، کریانہ بازار، سکھر ○ رخشندہ بندہ ریاض، باغبانپورہ، لاہور

○ نذیر قریشی، ملیر، کراچی ○ مرینہ مقصود، جیکب لائن، کراچی ○ سعید احمد، شالیمار، اسلام آباد

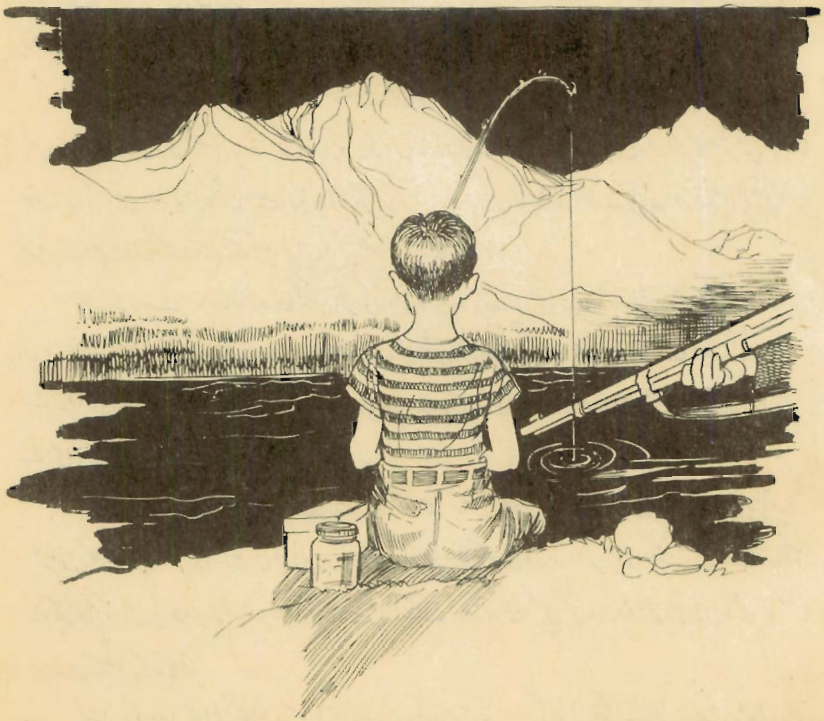
○ مہرین فاطمہ، نارتھ ناظم آباد ○ ملک سرفراز، گل گشت کالونی، ملتان ○ شجاع احمد، ایف بی ایریا، کراچی

○ عامر ایاز، لطیف آباد، حیدرآباد ○ شاہ کریم عطار، دستگیر، کراچی ○ فہیم عنایت، حسن اسکوائر، کراچی

کلیم چغتائی کا خوبصورت ناولٹ۔

وائے ڈبل اے

بس کی رفتار دھیمی ہوئی، پھر اس کے بریک چرچرائے اور وہ ایک ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ رک گئی۔ عظیم اور یاور سامان اٹھا کر بس سے اتر آئے ان کے اترتے ہی کنڈیکٹر نے مخصوص انداز میں بس پر دو ہاتھ مارے اور ہانک لگائی "ڈبل اے"۔ عظیم نے کلائی گھما کر وقت دیکھا "کمال ہے، نو بجنے کو ہیں" اس کے منہ سے نکلا۔ "ہم کتنے بجے چلے تھے؟ ساڑھے سات بجے؟"



نہیں!" اشرف نے جواب دیا "سوا سات بجے۔ تمہیں یاد نہیں، فجر کی نماز پڑھ کر ہم نے تیاری شروع کر دی تھی پھر یاور کے گھر ناشتہ کیا۔ بازار سے پھل خریدنے میں کچھ وقت لگا، تقریباً سوا سات بجے ہماری بس حرکت میں آچکی تھی"

اور آپ یہ بھول گئے کہ ہماری پیاری بس تھوڑی دور تک حرکت کرنے کے بعد ایک پٹرول پمپ پر کھڑی اپنا پیٹ بھرتی رہی تھی پھر آگے چل کر بڑے گیٹ کے اسٹاپ پر ڈرائیور صاحب اکیلے ہی اکیلے چائے پینے چل دیئے تھے" یاور نے ہنس کر کہا۔ "اکیلے کہاں بھئی کنڈکٹر صاحب بھی ان کے ساتھ تھے" اشرف نے ٹکڑا لگایا۔

تینوں دوست پکنک منانے کے لئے اس پہاڑی مقام پر چلے آئے تھے۔ یہاں تک شہر سے کوئی بس براہ راست نہیں آتی تھی بلکہ اس مقام سے تقریباً ڈیڑھ میل دور ایک سڑک پر چھوڑ دیتی تھی۔ سڑک کے ساتھ ہی اونچے نیچے گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو پہاڑوں کے دامن تک پھیلا ہوا تھا۔ پہاڑ زیادہ بلند نہ تھے اور ان کے دامن میں چھوٹے چھوٹے چشمے تھے۔ ہریالی تھی، خوبصورت آوازوں والے خوش رنگ پرندے تھے، غرض یہ کہ پکنک منانے کے لئے یہ ایک عمدہ جگہ تھی۔

وہ تینوں تقریباً ہم عمر تھے اور نویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ عظیم دبلا پتلا سا لڑکا تھا لیکن بلا کا ذہین یوں وہ دیکھنے میں کوئی فلسفی یا مفکر لگتا تھا کیوں کہ اس کے چہرے پر باریک کمانیوں والا نظر کا چشمہ بھی سجا رہتا تھا۔ اس کی باتیں سنو تو ایسا لگتا جیسے کوئی مقرر تقریر کر رہا ہو۔ اس کا حافظہ غضب کا تھا اور تمام اہم ٹیلی فون نمبر، پتے وغیرہ اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں ہمیشہ محفوظ رہتے تھے۔

یاور تندرست اور موٹا تازہ تھا لیکن اس کی آواز خاصی باریک سی تھی۔ اسے کشتی لڑنے کا بڑا شوق تھا۔ اور وہ تن سازی (باڈی بلڈنگ) اور ویٹ لفٹنگ کی مشق بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ اسے سبز رنگ بڑا پسند تھا اس لئے سبز رنگ کی شلوار قمیض کے کئی جوڑے بنوا رکھے تھے اس کی دیکھا دیکھی اشرف اور عظیم نے بھی شلوار قمیض سلوالی تھی۔

اشرف کا قد اپنے دونوں دوستوں سے ذرا نکلتا ہوا تھا۔ وہ چھریرے بدن کا گورا چٹا لڑکا تھا الیکٹرانک گھڑیوں کا شوقین۔ جس دوست کی کلائی پر الیکٹرانک گھڑی نظر آجاتی وہ کم از کم ایک سکینڈ کے لئے اس دوست کا ہاتھ تھام کر اس کی گھڑی کا معائنہ ضرور کرتا۔ اسے جمناسٹک سے گہری دلچسپی تھی اور وہ اس فن میں اچھی خاصی مہارت حاصل کر چکا تھا۔

تینوں دوستوں کا اپنی کلاس کے ذہین طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔ ان کی ٹولی جھگڑے نمٹانے میں کمال رکھتی

تھی ۔جہاں چند لڑکوں میں لڑائی جھگڑا شروع ہوا۔ یہ تینوں دوست پہنچ کر معاملہ رفع دفع کرا دیتے سب سے اچھی بات یہ تھی کہ تینوں دوست نماز کے پابند تھے اور اپنے والدین کا بے حد ادب کرتے تھے۔ ان کی انہی اچھی عادتوں کی وجہ سے اسکول کے اساتذہ اور محلے کے تمام لوگ انہیں پسند کرتے تھے ۔ کچھ لوگ انہیں پیار سے "وائی ڈبل اے" کہتے تھے یعنی YAA ۔ دراصل یہ یاور، اشرف اور عظیم کے ناموں کے پہلے حروف تھے۔

وہ اب اونچے نیچے گھنے درختوں کے بیچ چل رہے تھے بس نے انہیں جس سڑک پر اتارا تھا وہ نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی ۔کیوں کہ آسمان صاف تھا اور دھوپ نکلی ہوئی تھی لیکن گھنے درختوں کی وجہ سے اس جگہ مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی ۔خشک گھاس ان تینوں کے جوتوں تلے آکر چر... چوں کی آوازیں پیدا کر رہی تھی۔ ماحول بڑا پر سکون تھا۔کبھی کبھی کوئی فاختہ یا مینا چہچہا اٹھتی اور فضا میں اس کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ چند لمحوں کے لئے سنائی دیتی ۔کبھی کبھار کوئی ننھی سی گلہری کسی درخت کے پیچھے سے سر نکال کر اپنی گول گول آنکھوں سے انہیں حیرانی کے ساتھ دیکھتی اور پھر غڑاپ سے کہیں غائب ہو جاتی۔

عظیم نے ایک ٹوکری سنبھال رکھی تھی جس میں ٹفن تھا۔ایک چادر، چھری، گلاس اور چند دوائیں تھیں عظیم کی امی نے احتیاطاً چند دوائیں بھی سامان کے ساتھ رکھ دی تھیں یاور کے ہاتھ میں پھلوں کی ٹوکری جھول رہی تھی ۔اشرف کے کاندھے سے تھرماس لٹک رہا تھا جس میں گرما گرم چائے تھی دوسرے ہاتھ میں اس نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان تھام رکھا تھا

"یار جگہ تو بڑی اچھی ہے کیوں؟" عظیم نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی ہاں بہت اچھی ہے، یہ بتاؤ چشمہ کتنی دور ہے" یاور نے پوچھا۔

"بس یار ذرا سا فاصلہ اور ہے ذرا چلا پھرا کرو اسمارٹ ہو جاؤ گے" عظیم نے یاور کے تن و توش پر پھبتی کسی۔

"اور تم؟" یاور نے چڑ کر کہا "میں تو اسمارٹ ہو جاؤں گا اور تم دبلے ہو کر بالکل غائب ہو جاؤ گے۔

"اچھا حضرات مباحثہ ختم ہوتا ہے ۔قائد ایوان نے قرار داد واپس لے لی ہے کیوں کہ قافلہ منزل پر پہنچ چکا ہے" اشرف نے فٹ پاتھ پر انعامی ٹکٹ بیچنے والے کے سے انداز میں اعلان کیا۔

چند لمحوں بعد تینوں دوست چشمے کے کنارے چادر بچھائے ٹوکری میں سے پھل نکال نکال کر کھا رہے تھے ۔پھل کھانے کے بعد انہوں نے اللہ کا شکر ادا کیا اب اِدھر اُدھر کی سیر کا پروگرام تھا۔ یہ لوگ ٹوکریاں اٹھا کر سیر کرنے کے موڈ میں نہ تھے۔ اسی جگہ چھوڑ دیتے تو ہو سکتا ہے کوئی بندر یا کوئی دوسرا جانور ان کا

کھانا اٹھائے جاتا۔

تھوڑے سے بحث و مباحثہ کے بعد فیصلہ یہ ہوا کہ قرعہ اندازی کر لی جائے۔ نمبر ایک اور نمبر ۲ جن دو افراد کے نام نکل آئے وہ سیر کے لئے جائیں گے تیسرا اس دوران سامان کی نگرانی کے ساتھ ساتھ مچھلیوں کی ہنیوں پر نظر رکھے گا۔ ایک گھنٹے کے بعد ان کی واپسی پر نمبر ایک سامان کی دیکھ بھال کرے گا اور بقیہ دو کی سیر کی باری ہو گی۔

عظیم نے اپنی جیب سے کاغذ کا ایک پرزہ نکالا اس کے حصّے کئے اور قرعہ اندازی ہوئی۔ عظیم کی پرچی پر نمبر ایک اور اشرف کی پرچی پر نمبر دو لکھا ہوا تھا۔ یاور نمبر ۳، ٹھہرا اس لئے سامان کی نگرانی کی ذمہ داری سب سے پہلے اسی کے حصّے میں آئی۔ یاور نے مچھلیاں پکڑنے کا سامان نکالا اور کانٹوں میں کیچوے پھنسا کر ڈور پانی میں ڈال دی۔ کیچوے وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔

"اچھا یاور صاحب" عظیم نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا "اُمید ہے کہ ہماری واپسی پر تلی ہوئی مچھلیاں ہمارا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"جی ہاں، جی ہاں!" یاور نے بھنّا کر کہا "جیسے یہ پانی کا چشمہ نہیں۔ سرسوں کے تیل کا چشمہ ہے اور وہ بھی کھولتا ہوا۔"

"خیر خیر، ٹھنڈی ہوا میں مست ہو کر سو مت جانا، اس وقت دس بج کر دس منٹ ہوئے ہیں۔ ہم ٹھیک گیارہ بج کر دس منٹ پر لوٹ آئیں گے۔" اشرف نے چلتے چلتے تاکید کی اور عظیم کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر پہاڑ کی سمت چل دیا۔ تھوڑی دور جا کر دونوں پہاڑوں میں غائب ہو گئے۔

"ہاہ۔ ہا....." عظیم اور اشرف کے جانے کے بعد یاور نے منہ پر ہاتھ رکھ کر جمائی لی۔ پھر ٹوکری سے ایک سیب نکال کر اس میں اپنے دانت گڑو دیئے۔ سیب بہت اچھے تھے۔ یاور سیب کے ٹکڑوں کو آہستہ آہستہ منہ میں چبا رہا۔

اچانک اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے چھڑی سے اس کی پیٹھ کو چھوا ہے۔ اس نے یہ کہتے ہوئے کہ "ارے تم لوگ اتنی جلد واپس....." وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا کیونکہ اس کی پشت پر کوئی اجنبی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں چھڑی نہیں بلکہ رائفل تھی جس کی نال یاور کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔ اجنبی کی نوکیلی مونچھیں تھی وہ شلوار قمیض پہنے ہوئے تھا۔ پیروں میں پشاوری سینڈل تھی اور سر پر چارخانے والا ایک رومال بندھا ہوا تھا۔

"ہاتھ اٹھا اوپر" اجنبی نے اکھڑ لہجے میں یاور سے کہا اس کی آواز بڑی کرخت تھی۔

یاور اس صورت حال سے خاصا بوکھلا گیا تھا۔ اُس نے گھبرا کر ہاتھ اوپر اٹھائے۔ اجنبی نے اسے رائفل کے اشارے سے آگے چلنے کا حکم دیا۔ یاور ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے چل پڑا۔ اجنبی کبھی کبھار اسے ہاتھ کے اشارے سے زبانی بتا دیتا تھا کہ کس طرف مڑنا ہے۔ یاور نے محسوس کیا کہ اجنبی اسے بائیں طرف کے پہاڑوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کو یاد کر رہا تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ اس اجنبی سے دو دو ہاتھ کرے یا جھکائی دے کر بھاگ نکلے لیکن کچھ سوچ کر رک گیا۔ اجنبی نے ایک پہاڑی عبور کرنے کے بعد اسے نشیب میں اترنے کا حکم دیا۔ اترتے ہوئے ایک جگہ یاور کا پیر پھسلا اور وہ لڑھکتا ہوا کئی فٹ نیچے جا گرا۔ گرنے سے اس کی کہنیاں اور گھٹنے چھل گئے۔ اجنبی نے اسے ڈانٹ کر اٹھنے کے لئے کہا۔ ذرا سا آگے ایک پتھریلی چٹان باہر کو نکلی ہوئی تھی۔ اجنبی اس چٹان کے قریب جا کر ٹھہر گیا۔

یاور نے غور کیا کہ غالباً موسم کی شدت کی وجہ سے چٹان کچھ اس طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی کہ اس کو اچھی طرح دیکھنے پر اس پر کسی گھوڑے کے سر کا سا گماں ہوتا تھا۔

اجنبی شخص نے یاور کو رائفل کی زد میں رکھتے ہوئے اپنے ہونٹ سکیڑ کر خاص انداز سے سیٹی بجائی فوراً ہی چٹان کی دوسری طرف سے ویسی ہی سیٹی کی آواز سنائی دی اور ایک گھنی مونچھوں والا جوان کود کر یاور کے سر پر پہنچ گیا اس کے کندھے سے رائفل لٹک رہی تھی۔ اس نے یاور کو لانے والے شخص کو دیکھ کر کہا۔

"ارے، شہر نہیں گئے؟"

"بس جا رہا تھا کہ یہ مال مل گیا۔ دنیو استاد کے پاس لے جاؤ۔ میں جا رہا ہوں" اس شخص نے یاور کو گھنی مونچھوں والے کے حوالے کیا اور چلتا بنا۔

گھنی مونچھوں والے نے یاور کو بازوؤں سے پکڑا اور چٹان کی دوسری سمت لے گیا۔ یاور نے دیکھا کہ وہاں دور دور تک گھاس اُگی ہوئی تھی۔ گھنی مونچھوں والے نوجوان نے گھاس کے ایک ڈھیر کو بیرسے ٹھوکر مار کر ذرا پرے کیا اور یاور کو گھاس کے اس ڈھیر پر پھینک دیا۔ یاور لڑھکتا ہوا کسی گڑھے میں جا گرا۔

عظیم اور اشرف پہاڑوں کی سیر کر کے واپس لوٹے تو دیکھا کہ مچھلی پکڑنے کی بنسیاں اسی طرح چشمہ کے کنارے دھری ہوئی تھیں۔ چادر پر ٹوکریاں اور تھرماس رکھا ہوا تھا اور ایک بندر صاحب بڑے اطمینان کے ساتھ ٹوکری میں سے سیب نکال نکال کر کھا رہے تھے لیکن یاور کا کہیں پتہ نہ تھا۔

"ارے! اشرف کے منہ سے نکلا یاور کہاں ہے" اور یہ بندر۔ ٹھہر جا ابھی تجھے بتاتا ہوں۔ وہ بندر کی

طرف دوڑا لیکن بندر اس سے زیادہ پھرتیلا ثابت ہوا، وہ سیب سنبھال کر بڑی تیزی سے قریبی درخت پر جا چڑھا اور فاتحانہ انداز سے سیب کھانے لگا۔

"میں کہتا ہوں یاور صاحب کو کب عقل آئے گی؟" عظیم نے کہا "مانا کہ ہم پانچ منٹ تاخیر سے پہنچے ہیں لیکن اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ حضرت سامان چھوڑ کر منہ اٹھائے چل دیں۔"

"لیکن وہ گیا کہاں؟" اشرف نے چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔ "یار مجھے لگتا ہے کہ کوئی گڑبڑ ہے۔"

"ایک منٹ" عظیم بولا۔ یہاں مجھے کچھ قدموں کے نشان نظر آ رہے ہیں تم نے غور کیا؟"

"کہاں؟" اشرف بھنویں سکیڑ کر دیکھتا ہوا بولا۔

"یہ دیکھو" عظیم ایک درخت کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس جگہ کی زمین قدرے نرم اور بھربھری تھی اس لئے جوتوں کے نشان واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

"تم نے دیکھا یہ پشاوری سینڈل کا نشان لگتا ہے جب کہ یہ دوسرا نشان جوگر کا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا یاور نے جوگر پہنے ہوئے تھے۔"

"مگر اس سے کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا" اشرف نے کہا۔

"بھئی کم از کم یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ یاور کے جوگر کے نشان کس طرف جا رہے ہیں" عظیم بولا۔

"ہاں، ہاں دیکھو اشرف نے جلدی سے کہا۔

دونوں جوگر کے نشانات دیکھتے ہوئے چل پڑے۔ جوگر اور سینڈل کے نشانات میں تھوڑا سا فاصلہ تھا یہ نشانات پہاڑوں کی سمت جا رہے تھے۔

"ارے یہ سامان تو اٹھا لو۔" اشرف نے توجہ دلائی۔

دونوں نے جلدی جلدی سامان اٹھایا اور چل دیئے۔ کچھ دور جا کر قدموں کے نشان مدھم پڑ گئے تھے کیونکہ پہاڑ قریب آ گئے تھے اور پتھریلی زمین شروع ہو چکی تھی۔

ٹھہرو!" عظیم اچانک رک گیا "دیکھو یہ درختوں کی ٹہنیاں کچلی ہوئی پڑی ہیں، بالکل تازہ، جیسے ان پر سے کوئی ابھی گذرا ہے"

ہاں ٹھیک کہتے ہو" اشرف نے ٹہنیوں کو دیکھ کر سر ہلایا "دیکھا یہ کوئی جانور بھی تو ہو سکتا ہے"

"نہیں یار جانور کے چلنے کا انداز مختلف ہوتا ہے اور اس سے اگر کوئی ٹہنی کچلی جائے جائے تو اس کی حالت

مختلف ہوتی ہے" عظیم نے کہا"

دونوں پہاڑی راستوں میں آگے بڑھتے گئے۔ نہیں کئی جگہ کچلی ہوئی ٹہنیاں اور گھاس نظر آئی۔ ایک جگہ میں عظیم نے چاکلیٹی رنگ کی کوئی چیز پڑی ہوئی دیکھی۔ اس نے جلدی سے جھک کر اُسے اٹھا لیا وہ اس چیز کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔

یہ یاور کا پرس تھا۔ جس میں یاور کا اسکول کا شناختی کارڈ بھی موجود تھا۔

یاور کو گہرے گڈھے میں گرنے کے بعد احساس ہوا کہ وہ کسی گڑھے میں نہیں بلکہ ایک بڑے غار میں پھینک دیا گیا ہے۔ اس کے سر پر گٹھے ہوئے جسم کا ایک شخص کھڑا ہوا تھا۔ جس کی آنکھیں بڑی چمکیلی تھیں۔ چہرے پر گھنی داڑھی تھی اور سر پر پگڑی اس نے سیاہ رنگ کی شلوار قمیض پہن رکھی تھی پیروں میں فل بوٹ تھے۔

غار میں نیم تاریکی تھی۔ ذرا فاصلے پر ایک لیمپ روشن تھا جس کی پیلی پیلی روشنی میں غار کی اونچی نیچی ابھری ہوئی ناہموار دیواروں پر عجیب عجیب سے سائے لرز رہے تھے۔

"کھڑا ہو جا" یاور کے سر پر کھڑے ہوئے شخص نے رعب سے کہا۔ اس کی آواز بھاری تھی۔

وہی شاید دنیو استاد تھا۔ "تو یہاں کیا کرنے آیا تھا!"

"میں تو پہاڑ کی سیر کرنے آیا تھا۔"

"سیر! ہا ہا ہا..... وہ آدمی بھیانک سی ہنسی ہنسنے لگا "سیر تو تجھے ہم اچھی کروائیں گے۔"

یاور کچھ نہ بولا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ سے دعائیں مانگ رہا تھا اور یہاں سے فرار کے منصوبوں پر غور کر رہا تھا۔

اشرف نے عظیم کے ہاتھ میں دبے ہوئے پرس کو حیرت سے دیکھا۔ ارے!" وہ بولا "یہ کہاں سے آگیا؟"

"میرا خیال ہے یاور کسی مشکل میں پھنس گیا ہے یہ پرس اسی کا ہے" عظیم نے پریشان ہو کر کہا۔

"پرس جس کا بھی ہے، تم دونوں ہاتھ اٹھا لو۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

عظیم اور اشرف چونک پڑے کیوں کہ گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان رائفل تانے ان کی طرف بڑھ رہا تھا اشرف اور عظیم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کی آنکھوں میں پیغامات کا تبادلہ کیا۔ دونوں ایک دوسرے کا مطلب سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے ٹوکریاں رکھ کر ہاتھ اٹھائے وہ آدمی رائفل تانے ہوئے ان کے بالکل قریب آپہنچا۔ اسی وقت اشرف نے دل میں اللہ کو یاد کیا اور بسم اللہ پڑھ کر ایک چھلانگ لگائی وہ آدمی بالکل بوکھلا گیا اسے بالکل توقع نہ تھی کہ یہ لڑکے اتنے تیز ثابت ہوں گے۔ اشرف کی لہراتی ہوئی ٹانگ اس شخص

کی رائفل پر پڑی، رائفل فضا میں کئی فٹ اچھل کر دور کسی کھڈ میں جا گری۔ وہ شخص دھڑام سے نیچے گرا اور اس کا سر بڑے زور سے پتھریلی چٹان سے ٹکرایا۔ وہ کرب سے تڑپا اور بے ہوش ہو گیا۔

"چلو اب یہاں سے۔" اشرف نے جلدی سے کہا "یہ ہوش میں آ گیا تو مشکل ہو گی۔"

"لیکن یار کار کیا بنے گا۔ یہ تو کوئی خطرناک ڈاکو یا اسمگلر لگتے ہیں۔" عظیم نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

اتنے میں ان کے کانوں میں کسی گاڑی کی آواز آئی۔ دونوں نے آواز کی سمت بڑھ کر نیچے دیکھا نشیب میں ایک پتھریلے راستے پر ایک بڑی جیپ کھڑی تھی اور ایک آدمی اس میں سے اتر کر اوپر آ رہا تھا اس کے پاس ایک بڑا تھیلا تھا جو ذرا پھولا پھولا سا لگ رہا تھا۔ اشرف اور عظیم چھپ کر دیکھنے لگے آنے والے نے خاکی پتلون اور قمیض چڑھا رکھی تھی اس نے اوپر پہنچ کر ایک چٹان کے قریب پڑے گھاس کے ڈھیر کے پاس آ کر مخصوص انداز سے سیٹی بجائی۔ ذرا دیر کے بعد کہیں سے ویسی ہی سیٹی کی مدھم سی آواز آئی۔ آنے والے نے تین بار اسی انداز سے سیٹی بجائی۔ اشرف اور عظیم نے دیکھا کہ گھاس پھوس کے ڈھیر میں حرکت پیدا ہوئی اور اس میں سے داڑھی والا ایک شخص نکل کر باہر آ گیا اس نے پگڑی باندھ رکھی تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے اور بدن پر سیاہ رنگ کی شلوار قمیض تھی۔ اس نے خاکی پتلون والے کو دیکھتے ہی کہا "آ جا نذیرے، تیرا ہی انتظار تھا۔"

"بس دینو استاد، کچھ دیر ہو گئی پہنچنے میں" نذیرے نے ہنس کر کہا۔ پھر دینو استاد نے مخصوص سیٹی بجائی وہ کان لگا کر ادھر اُدھر کچھ سننے کی کوشش کرتا رہا پھر بولا "یہ ماجا پتہ نہیں کہاں مر گیا میں نے اس سے کہا ہے ہمیشہ ادھر ڈیوٹی دو۔ میرا خیال ہے اس کا نشہ ٹوٹ رہا ہو گا۔ خیر اسے آج مرغا بناؤں گا۔ تم آؤ۔ آج ایک لڑکا پھنس گیا ہے میرا خیال ہے اُسے بھی تم لے جاؤ۔ بیگو داد اسے اچھے پیسے مل جائیں گے میں نے لڑکے کو باندھ دیا ہے۔ پہلے مال نکالو۔ آج بس ہم دونوں ہی ہیں۔ شیرو کو میں نے کام سے شہر بھیج دیا تھا"

اور باقی آدمی؟" نذیرے نے پوچھا۔

"سب دوسرے اڈے پر ہیں"

وہ دونوں گھاس پھوس کے ڈھیر میں غائب ہو گئے۔ ان کے جاتے ہی عظیم اشرف کا ہاتھ پکڑ کر نشیب کی طرف دوڑا۔ جیپ کے قریب پہنچ کر اس نے بڑی ذہانت سے دو ٹائروں کی ہوا اس طرح نکال دی کہ نہ تو کوئی دیکھ سکے اور نہ ہی ہوا کے نکلنے کی آواز سن سکے۔

باقی دو کی ہوا کیوں نہیں نکالی؟" اشرف نے پوچھا۔

"نہیں، اس طرح انہیں شک ہو جائے گا" عظیم نے کہا "اب آؤ کہیں چھپ جائیں"

مگر یار ہم کس طرح ان کا مقابلہ کریں گے ہمارے پاس لے دے کے پھل کاٹنے والی ایک چھری ہے اور ان کے پاس رائفلیں۔" اشرف نے پریشان ہو کر کہا۔

"بھئی اللہ پر بھروسہ کرو۔ وہی ہمارا سہارا ہے" عظیم نے اسے تسلی دی۔ اللہ نے انسان کو جو عقل دی ہے اسے استعمال کرنا چاہیئے اور اللہ سے مدد مانگنی چاہیے۔ اور اب سامان کی ٹوکری مجھے دو" پھر اشرف کو اپنے منصوبے کے متعلق سمجھانے لگا۔

دونوں ایک چٹان کے پیچھے چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دینو استاد، نذیرے کے ساتھ ایک بڑا تھیلا اٹھائے آتا دکھائی دیا۔ انہوں نے تھیلے کو جیپ میں رکھ دیا پھر واپس چلے گئے اور اسی طرح تین چکر لگا کر انہوں نے مزید تین تھیلے جیپ میں رکھ دیئے۔ پانچویں بار جب وہ لوٹے تو انہوں نے رسیوں میں بندھے ہوئے یاور کو اٹھا رکھا تھا۔ یاور کو انہوں نے جیپ میں ڈال دیا۔ پھر دونوں اگلی نشستوں پر جا بیٹھے نذیرے نے انجن اسٹارٹ کیا لیکن اگلے ہی لمحے جیپ اپنی جگہ سے ذرا سا کھسک کر رہ گئی اس کے دونوں پچھلے ٹائروں کے گھسنے سے پھس پھس کی آواز برآمد ہوئی۔ دینو استاد اور نذیرا فوراً جیپ سے اترے۔ دینو استاد نے نذیرے کو کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

"قسم لے لو استاد، ٹائر بالکل ٹھیک تھے" نذیرا صفائیاں پیش کرنے لگا۔

"بکواس بند کرو۔ تم سخت لاپروا آدمی ہو۔ ٹائروں میں ہوا پہلے ہی کم ہو گئی چلتے وقت چیک کیوں نہیں کی۔ اب یہاں تو ہوا بھرنے سے رہی۔ تم جاؤ شہر سے نیا ٹائر لے کر آؤ۔ اتنے میں ایک ٹائر بدلتا ہوں۔ فالتو پہیہ ٹھیک تو ہے نا؟"

"بالکل بالکل استاد"

"بس پھر دفع ہو جاؤ اور جلدی آنا۔ مال ویسے ہی لیٹ ہو گیا ہے اور تم نے یہ نئی مصیبت کھڑی کر دی ہے۔"

نذیرا تیز تیز قدم بڑھاتا روانہ ہو گیا اور دینو استاد، جیپ سے جیک نکال کر پہیہ بدلنے لگا۔ اس نے جیک لگایا گاڑی اوپر کو اٹھ گئی۔ اس نے نٹ کھول کر فالتو پہیہ نکالا اور خراب پہیئے کے نٹ کھولنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نٹ بہت مضبوطی سے لگے ہوئے تھے۔ اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا اور بڑبڑایا۔

"ماجا کمبخت ہوتا تو کام جلدی ہو جاتا" پھر اس کی نظر جیپ میں پڑے ہوئے یاور کی طرف اٹھی اس نے پانا پھینک کر یاور کی رسیاں کھولنی شروع کر دیں۔

"دیکھ بے" اس نے یاور سے کہا "یہ پہیہ کھولنا ہے، بھاگا تو گولی مار دوں گا"

"یاور رسیاں کھل جانے پر جیپ سے اتر آیا اور ہاتھ پاؤں سیدھے کرنے لگا زور سے جھٹکنے لگا۔

"بس بند کر یہ بازی گری، پہیہ کھول!" دینو استاد نے اسے گھرکا۔

یاور نے پانا اٹھایا اور پہیہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا دینو استاد نے جیپ سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ پھر وہ ایک پتھر پر بیٹھ کر مزے سے لمبے لمبے کش لگانے لگا۔ یاور ایک نٹ کھول چکا تھا اور دوسرا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اچانک چٹان کی اوٹ میں چھپے ہوئے عظیم اور اشرف بجلی کی سی تیزی سے لپکے اشرف نے چادر کا پھندا بنا کر دینو استاد پر پھینک دیا جو اس کی گردن میں جا کر اٹک گیا۔ دینو استاد الٹ کر بھد سے گرا اس نے بے تابی سے ہاتھ پاؤں مارے اشرف نے بڑی مضبوطی سے چادر کو پکڑ رکھا تھا، اسی وقت عظیم نے چاٹ کے مصالحے کی پوری پیڑیا دینو استاد کی آنکھوں میں جھونک دی، چاٹ کا مصالحہ وہ کینو کھانے کے لئے ساتھ لائے تھے۔

مصالحہ آنکھوں میں پڑتے ہی، دینو استاد بلبلا کر چیختے ہوئے تڑپنے لگا۔ اسی کشمکش میں چادر اشرف کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دینو استاد اپنی دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے اندازے سے چشمے کی طرف بھاگ رہا تھا۔ چادر اس کے گلے میں جھول رہی تھی۔ تینوں لڑکے دینو استاد کے پیچھے دوڑے۔ اشرف سب سے آگے تھا۔

دینو استاد کو نظر تو نہیں آ رہا تھا۔ تیزی سے دوڑتے ہوئے وہ اچانک، ایک درخت کے موٹے سے تنے سے ٹکرایا۔ ٹکر اتنی شدید تھی کہ دینو استاد کے منہ سے ایک دردناک چیخ نکلی اور وہ دھڑام سے گر پڑا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ اتنے میں لڑکے اس کے سر پر پہنچ گئے۔

عظیم ذہانت کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہی رسّی اٹھا لایا تھا جس سے دینو استاد نے یاور کو باندھا تھا تینوں نے مل کر دینو استاد کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے باندھ دیئے۔ دینو استاد کی رائفل انہوں نے الگ کر لی تھی۔

دینو استاد کی بے ہوشی زیادہ طویل نہ تھی۔ اس نے جلد ہی آنکھیں کھول دیں لیکن خود کو رسّیوں میں جکڑا ہوا دیکھ کر اس کی زبان سے گندی گندی گالیاں نکلنے لگیں۔ وہ دھمکیاں دینے لگا۔

"میرے آدمی ابھی آتے ہی ہوں گے وہ تم سب کو گولی مار کر الٹا لٹکا دیں گے۔"

"اس کا تو علاج ہمارے پاس ہے" یاور نے اپنی ویٹ لفٹنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے دینو استاد کو اٹھایا اور ایک طرف چٹانوں میں لے جا کر ڈال دیا۔ پھر اس نے گھاس پھوس جمع کی اور دینو استاد پر پھیلا دی۔

"دیکھو" دینو استاد اب نرم پڑ گیا "مجھے کھول دو، میں تم سب کو مالا مال کر دوں گا"

"چپ رہو" عظیم نے اسے ڈانٹ دیا "تمہاری ناجائز کمائی ہمیں نہیں چاہیئے۔"

"اس طرح کام نہیں چلے گا" یاور نے دینو استاد کا رومال اس کی جیب سے نکالا اور دینو استاد کے منہ میں ٹھونس دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر تینوں لڑکے ایک طرف ہو کر صلاح مشورے کرنے لگے۔ طے یہ پایا کہ عظیم شہر پہنچ کر پولیس کو اطلاع دے گا۔ اشرف اور یاور یہیں ٹھہریں گے تاکہ اگر دینو استاد کے ساتھی آ بھی جائیں تو دینو استاد کو یرغمال بنا کر کچھ دیر انہیں دُور رکھا جا سکے۔

اتنے میں انہیں دینو استاد کے اس ساتھی کا خیال آیا جو چٹان کے قریب بے ہوش پڑا تھا عظیم کو وہیں چھوڑ کر اشرف اور یاور غار کی طرف روانہ ہو گئے جیپ میں رسی موجود تھی اسے لے کر دونوں غار کے قریب پہنچے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی شخص سگریٹ کے کش لگاتا ہوا ایک چٹان پر بیٹھا ہے۔ اس نے انہیں دیکھ کر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ نشہ کی سگریٹ پیئے ہوئے تھا۔ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ دراصل اس کو جب ہوش آیا تو دینو استاد کو اطلاع دینے کے لئے وہ غار میں پہنچا لیکن دینو استاد کو نہ پا کر اس نے سوچا کہ نشہ کی سگریٹ کے چند کش لگا لئے جائیں۔ دینو استاد کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھا کر وہ کئی سگریٹ پی گیا۔

یاور اور اشرف نے اس شخص کو قابو میں کر کے رسیوں سے باندھ دیا۔

"اسے غار میں پھینک دو" یاور نے کہا۔

"کون سا غار؟" اشرف نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ ہے غار" اشرف نے گھاس پھوس کا ڈھیر اٹھایا اور رسیوں میں بندھے شخص کو اٹھا کر غار میں پھینک دیا۔

اس کام سے فارغ ہو کر دونوں تیزی سے دینو استاد کے پاس پہنچے اور عظیم شہر جانے والی سڑک کی طرف روانہ ہو گیا۔ سڑک پر پہنچتے ہی اتفاق سے ایک بس مل گئی بس میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی۔ بس کنڈیکٹر نے کسی نشست کے نیچے سے ایک مونڈھا نکالا اور نشستوں کے درمیان خالی مونڈھا رکھ کر عظیم کو اس پر بٹھا دیا۔

بس جلد ہی شہر پہنچ گئی۔ عظیم پولیس ہیڈ کوارٹر کے پاس ہی اتر گیا۔

ڈی آئی جی کے دفتر کے باہر کھڑے کانسٹیبل نے عظیم کو روکنا چاہا لیکن وہ اسے ہٹا کر اندر گھس گیا ڈی آئی جی صاحب کسی سے فون پر بات کر رہے تھے انہوں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا وہ فون پر چند لمحوں تک بات کرتے رہے۔ یہ چند لمحے عظیم کو چند سال کے برابر محسوس ہوئے۔

ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر ڈی جی نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"جناب ہم نے اسمگلروں کے سردار کو پکڑ لیا ہے" عظیم نے دھڑکتے دل سے کہا۔

کیا؟" ڈی آئی جی صاحب چونک گئے "کہاں؟ کیسے؟"

ہم پکنک منانے گئے تھے....." عظیم نے انہیں جلدی جلدی ساری بات سے آگاہ کیا۔

اس نے انہیں اسمگلروں کی جیپ کا نمبر بھی بتا دیا جسے ڈی آئی جی صاحب نے نوٹ کر لیا۔ پھر ڈی آئی جی صاحب نے انٹر کام پر کسی کو جلدی جلدی ہدایات دیں پھر ریوالور اٹھا کر بغلی ہولسٹر سے لٹکاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

"چلو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔"

عظیم ڈی آئی جی صاحب کے ساتھ باہر آیا۔ باہر پولیس کی جیپیں تیار کھڑی تھیں عظیم ڈی آئی جی اور چند پولیس والوں کے ساتھ ایک جیپ میں بیٹھ گیا۔ دوسری جیپ میں چند دیگر پولیس افسر بیٹھے جیپیں تیزی سے حرکت میں آگئیں اور شہر سے باہر جانے والی سڑک کی سمت روانہ ہو گئیں۔

اشرف اور یاور چٹانوں میں چھپے ہوئے تھے دینو استاد رسیوں میں جکڑا ہوا پڑا تھا۔ اچانک انہیں تیز تیز قدموں کی آہٹ سنائی دی دینو استاد کسمسانے لگا۔ اشرف اور یاور چونکے۔ دفعتاً اتنے میں کسی نے چٹانوں کے اوپر سے کہا۔

"دینو استاد۔ کہاں ہو؟" پھر وہ کسی سے کہنے لگا۔

"ماجار سیوں میں بندھا ہوا ٹھکانے میں پڑا تھا اسے ہم نے کھولا ہے۔ وہ نشہ میں وہیں لیٹا ہے پتہ نہیں کیا گڑبڑ ہو گئی۔"

وہ تعداد میں تین تھے۔ پھر ان میں سے ایک چٹان سے اترنے کی کوشش کرنے لگا اسی وقت جیپوں کی آواز اس سناٹے میں گونجنے لگی۔ تینوں آدمیوں نے چونک کر دیکھا پھر ان کے منہ سے نکلا "پولیس! بھاگو" وہ تینوں بھاگنے لگے۔

جیپیں رکتے ہی پولیس والے کود کر نیچے اترے اور بھاگنے والوں کے پیچھے دوڑنے لگے بھاگنے والے پلٹ کر فائر بھی کرتے جا رہے تھے لیکن پولیس کے تربیت یافتہ کمانڈو ان فائروں سے بچتے ہوئے ان کے پیچھے دوڑتے رہے اور شہر جانے والی سڑک کے قریب انہیں جا لیا۔ تینوں کو ہتھکڑیاں ڈال کر واپس لے آیا گیا۔ پولیس نے ان کا اسلحہ قبضے میں کر لیا تھا۔ ادھر عظیم کی قیادت میں ڈی آئی جی اور کچھ پولیس افسروں نے پہنچ کر دینو استاد کو حراست میں لے لیا۔

یاور کی نشاندہی پر پولیس نے غار میں پہنچ کر دینو استاد کے چوتھے ساتھی کو بھی پکڑ لیا۔

ڈی آئی جی صاحب نے عظیم، اشرف اور یاور، تینوں کی پیٹھ ٹھونکی اور بولے۔

"شاباش! تم تینوں بہت بہادر بچے ہو۔ ان اسمگلروں کی ہمیں عرصہ سے تلاش تھی پہلے انہوں نے یہاں سے چھ سو میل دُور اڈہ بنا رکھا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہ یہاں آگئے ہیں تم نے انہیں پکڑوا کر زبردست کام کیا ہے جس پر تمہیں انعام ملے گا۔ اب تم گھر جاؤ آگے کا کام ہمارا ہے ابھی ان اسمگلروں کے ایک بڑے اڈے کا صفایا باقی ہے جس کا پتہ ہمیں دینو استاد اور یہ چاروں بتائیں گے۔

عظیم، اشرف اور یاور نے اپنی ٹوکریاں تھرماس اور مچھلی پکڑنے کا سامان تلاش کیا عظیم نے گھڑی دیکھی ڈھائی بج رہے تھے۔

"چلو یار پکنک تو غارت ہوگئی لیکن اللہ کا شکر ہے بڑے مجرم پکڑے گئے جو پتہ نہیں کتنے لوگوں کو نشہ آور اشیاء کھلا کر غارت کر رہے تھے چلو بھئی ظہر کی نماز کا وقت نکلا جا رہا ہے۔"

وہ تینوں پولیس کی جیپ میں بیٹھے اور جیپ "وائی ڈبل اے" کی ٹولی کو لے کر شہر کی جانب روانہ ہوگئی۔

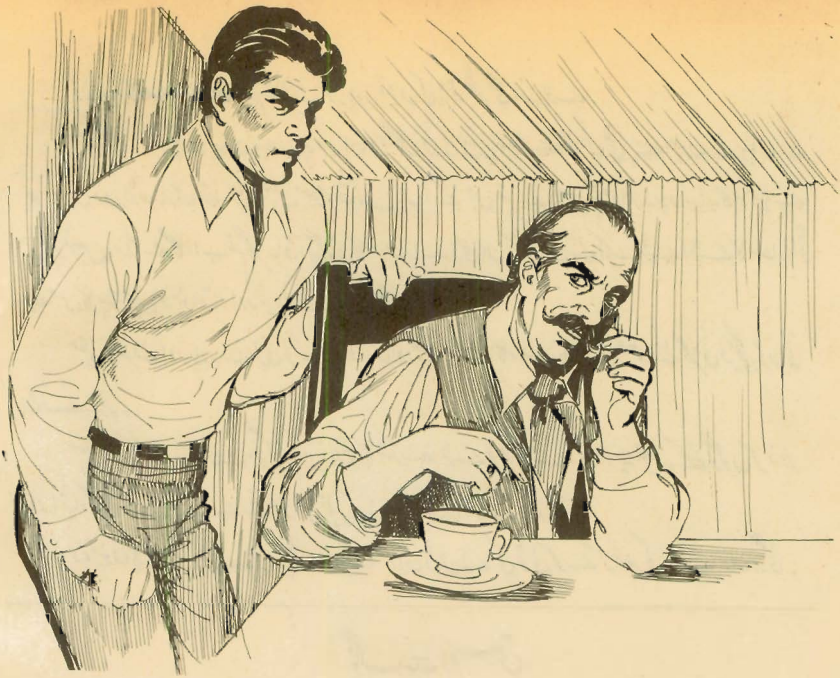
ناگ سے دوستی

رُوس میں ایک خاتون نے گزشتہ اسّی برس سے ایک نہایت زہریلا ناگ پال رکھا ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ناگ کو بھی پیار سے رام کیا جا سکتا ہے۔ وہ پیالے میں دُودھ ڈال کر اُسے کھنکھناتی رہتی ہے حتیٰ کہ سانپ آکر دودھ پینے لگتا ہے۔ رات کو بڑھیا اپنے بستر پر سوتی ہے تو یہ سانپ بستر کے نیچے ایک چٹائی پر محوِ استراحت ہوتا ہے۔

آپ کیسے زندہ ہیں

آٹھ دس نوکر چاکر آس پاس چل رہے تھے اور ان کے درمیان شہر کا رئیس ترین انسان شاہانہ انداز میں قدم اٹھاتا ہوا ایک دانشور کے حُجرے میں داخل ہوا۔ دیکھا کہ وہ دانشور چولہے پر کتیلی چڑھائے خود چائے بنا رہا ہے۔ دانشور کو اس حال میں دیکھ کر رئیس غمزدہ ہوگیا، اور افسوس کرتے ہوئے کہا۔" جناب آپ کو اس حالت میں دیکھ کر مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ میں یہ سوچتا ہوں کہ نوکروں کے بغیر آپ اپنی زندگی کیسوں گزارتے ہیں؟"

دانشور نے بے نیازی سے جواب دیا۔" اور جناب! میں یہ سوچتا ہوں کہ آپ ان سارے نوکروں کے ساتھ زندہ کیسوں کریں؟"۔



چھپا رستم

حافظ ولی اللہ ارباب
انعام یافتہ کہانی

شام کا وقت تھا۔ ہر طرف بچے کھیل کود میں مصروف تھے۔ محنت کش مزدور اپنے اپنے کاموں سے فارغ ہو کر گھروں کی طرف واپس لوٹ رہے تھے۔ سورج غروب کی نوید دے رہا تھا۔ کھیل کے میدان میں بچوں کی چیخ و پکار تھی۔ بچوں کا ایسا شور.... جس نے انہیں دنیا کے ہنگاموں سے بے خبر کر رکھا تھا۔ ایسے میں ایک نوجوان ٹہلتا ہوا ان کے قریب سے گزرا۔ نوجوان پینٹ بوشرٹ میں ملبوس تھا۔ خوش وضع ہونے کے ساتھ ساتھ وہ خوش شکل بھی تھا۔ اس کی گہری نظریں اردگرد کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ بچوں کے پاس چند ثانیے رک کر وہ آگے بڑھ گیا۔

یہ نوجوان کبھی کبھار ادھر نکل آتا تھا۔ کچھ وقت گزار کر اور ہوٹل سے چائے پی کر واپس چلا جاتا تھا۔ کیونکہ یہ علاقہ شہر سے کچھ دور تھا۔ یہی وجہ تھی کہ سورج غروب ہونے کے بعد لوگوں کی آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی۔ عموماً یہ نوجوان یا تو مین ہوٹل پر چائے پیتا تھا۔ مگر آج خلافِ معمول ایک پرانے چھپڑ کے بنے ہوئے ہوٹل کی طرف جا رہا تھا۔ یہ پرانا ہوٹل ریلوے لائن عبور کر کے دوسری طرف پڑتا تھا۔ ہوٹل کے آس پاس خاردار جھاڑیاں

تھیں۔ ہوٹل کی چھت دھوئیں سے کالی ہو چکی تھی۔ یہ اس علاقے کا بدنام ہوٹل تھا۔ جس میں جرائم پیشہ لوگ اپنے گھناؤنے کاروبار کرتے تھے مگر آج تک پولیس کو اس ہوٹل کے خلاف کارروائی کرنے کے لئے کوئی ٹھوس ثبوت نہیں مل سکا تھا۔

نوجوان نے ہوٹل میں داخل ہو کر ایک نظر تمام میزوں پر ڈالی۔ دائیں طرف کچھ لوگ کسی بات پر بحث کر رہے تھے۔ اُس میز پر صرف تین آدمی بیٹھے تھے۔ جبکہ بائیں طرف ایک میز پر کونے میں ایک شخص ہاتھ میں چھوٹا آئینہ لے کر دوسرے ہاتھ سے اپنی لمبی لمبی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا۔ وہ شخص آس پاس کے ماحول سے بے نیاز تھا اس کے گھنگھریالے بال، لمبی ناک اور چہرے پر ایک زخم اس کی شخصیت کے تعارف کے لئے کافی تھیں۔

نوجوان کے قدم اس لمبی مونچھوں والے کی طرف بڑھنے لگے۔ نوجوان نے السلام علیکم کہا اور کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔

لمبی مونچھوں والے نے چند لمحوں کے لئے نظر اپنے آئینے سے ہٹائی اور پھر سر سے پاؤں تک سرسری نظر ڈالتے ہوئے وعلیکم السلام کہہ کر اپنی نظریں دوبارہ آئینے میں گاڑ دیں اور دوبارہ مونچھوں کو تاؤ دینے لگا۔ جیسے آج ہی اُسے مونچھوں کو تاؤ دینے کا موقع ملا ہو۔

"آپ اس شہر میں نئے آئے ہیں شاید؟"۔ نوجوان نے کچھ سوچ کر گفتگو کا آغاز کیا۔

"جی نہیں۔ ہم اکثر اسی ہوٹل میں ہوتے ہیں۔" وہ بولا۔

یہ سُن کر نوجوان گڑبڑا گیا۔ اور اُس کی زبان لڑکھڑانے لگی۔ وہ پریشان سا ہو گیا کہ وہ اپنا تعارف کس طرح کرائے۔

"وہ .... جی .... مم .... میں .... ایک"۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"ہاں۔ ہاں کہہ دو۔ بلا جھجک کہہ دو کسی قسم کا خوف نہ کرو۔ یہ محفوظ جگہ ہے" اس شخص نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"جی وہ ڈر رہا ہوں۔ بس نیا نیا ہوں ابھی ....." نوجوان نے ڈرڈر کر کہا۔ ارے تم ایسے خواہ مخواہ گھبرا رہے ہو۔ وہ بھی ہم سے۔ اچھا بس میں سمجھ گیا۔ تم بھی ہماری ہی لائن کے آدمی ہو۔ مگر تم مجھے بتاتے ہوئے ڈر رہے کہ میں کہیں غلط آدمی تو نہیں"۔ اس شخص نے صورتحال سمجھ کر کہا۔

"جج ... جی ہاں"۔ نوجوان نے جلدی سے کہا جیسے اُس شخص نے اُس کے مطلب کی بات کہی ہو۔

"بھئی۔ تم کونسا دھندا کرتے ہو؟"۔ اُس شخص نے نوجوان سے پوچھا۔

"وہی دھندا جی۔ جو آپ کرتے ہیں"۔ نوجوان نے تسلی سے کہا۔

"نہیں بھئی۔ کیا تم بھی تخریب کاری اور اسلحہ اسمگلنگ کرتے ہو؟" اس شخص نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مگر ہم وقتِ ضرورت چرس اور ہیروئن کا بھی ہاتھ مار لیتے ہیں۔" نوجوان اب کافی حد تک نارمل ہو چکا تھا۔

"ہم سے کیا مطلب؟ تمہارے ساتھ اور کون ہے"؟ اس شخص نے تجسس سے پوچھا۔

ہمارا پورا گروہ "طوطا" کہلاتا ہے۔ شبان، رشید اور بلال ہمارے سرگرم رکن ہیں۔ شبان، رشید عام لوگوں اور پولیس کو دھوکہ دینے اور بلال وقتِ ضرورت ٹھکانے لگانے کا کام کرتا ہے۔" نوجوان نے بتایا۔

"حیرت ہے۔ راکو نے کبھی تمہارے بارے میں بتایا نہیں۔" وہ پھر چونک کر بولا۔ "مگر یہ راکو ابھی تک آیا نہیں ہے۔ جبکہ سوا چھ بج چکے ہیں۔"

ساڑھے چھ بج گئے مگر راکو نہیں آیا۔ مونچھوں والا کچھ پریشان ہونے لگا۔ نوجوان نے پوچھا۔

"مال لائے ہیں آپ؟"

مونچھوں والے نے چند لمحے سوچ کر اور پھر تذبذب کی حالت میں گردن اثبات میں ہلا دی۔ وہ زیادہ ہی پریشان ہونے لگا تھا۔

"حیرت ہے راکو کو ضرور آنا چاہیے تھا۔ میرے پاس کافی اسلحہ ہے۔ جبکہ اُستاد نے کہا تھا کہ جمعرات کو ہنگامہ ضرور کرنا ہے کیوں کہ جمعہ کے روز ردِعمل کے طور پر لوگ خود بخود ہنگامے کریں گے اور ابتدا میں راکو کی ذمہ داری ہے۔ کسی ایک کو گولی مار دے۔" اس شخص نے پریشان ہو کر کہا۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ آپ ہماری اوطاق پر رات محفوظ ہو کر گزار سکتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ استاد امتیاز خان آپ سے مال خرید لے اور ہمیشہ کے لئے خرید و فروخت کی بات بن جائے۔

مونچھوں والے نے کافی گہری نظروں سے نوجوان کو دیکھا۔ پھر یہ سوچ کر اس شہر میں دو گاہک بن جائیں گے۔ وہ رضامند ہو گیا اور نوجوان کے ساتھ چل پڑا۔

دونوں ریلوے لائن عبور کر کے شہر کی طرف چل پڑے۔ مونچھوں والے نے اچانک پوچھا "تم انسپکٹر رحیم کو جانتے ہو؟" نوجوان اگر عقلمندی سے کام نہ لیتا تو یہ سُن کر اُچھل جاتا۔ مگر اس نے نہایت سکون سے کہا۔ "ہاں جانتا ہوں۔ مگر کیوں؟"

"راکو نے مجھے خاص طور پر اُس سے محتاط اور ہوشیار رہنے کے لئے کہا تھا کہ وہ بڑا تیز و طرار ہے۔" اس شخص نے کہا۔

"ارے نہیں بھائی! آپ گھبرائیے نہیں۔ وہ آج چھٹی پر ہے۔ وہ ہوتا تو ہم بھی اتنی تسلی سے دھندا نہیں کر سکتے تھے۔"

نوجوان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ لیکن پھر فوراً ہی بولا "کیوں نہ استاد امتیاز کو میں ٹیلیفون پر اطلاع دیدوں کہ ہم آ رہے ہیں اور انسپکٹر رحیم کے بارے میں بھی معلوم ہو جائے گا۔"

"ہاں ترکیب تو اچھی ہے۔" مونچھوں والے نے کہا۔

نوجوان نے قریبی جنرل اسٹور سے ٹیلیفون کیا "ہیلو... ثبان، رشید اور بلال..... ہنو... انسپکٹر رحیم کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟ وہ واپس نہیں آیا... اچھا سنو! ایک مہمان آ رہا ہے میرے ساتھ۔ استاد سے کہو اس کے استقبال کا بندوبست کرے۔"

ٹیلیفون کر کے دونوں پھر چل دیئے۔ مونچھوں والے نے پریشان ہو کر کہا۔

"دیکھو! مجھ سے دھوکہ نہ کرنا۔ کہیں تم یہ سوچ رہے ہو کہ مال لے لو گے اور رقم ہضم کر جاؤ گے۔ یہ تم لوگوں کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔"

"ارے نہیں۔ ہم یہ بات تو سوچ بھی نہیں سکتے کہ مال لے لیں گے اور معاوضہ نہ دیں۔"

نوجوان نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

تین چار گلیوں کے موڑ ختم ہونے پر نوجوان نے ایک عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارا اڈہ ہے یہی ہماری اوطاق ہے۔"

م۔ مگر۔ یہ تو پولیس اسٹیشن ہے۔" مونچھوں والے نے گھبرا کر کہا۔

جی ہاں۔ میں نے یہیں ٹیلیفون کیا تھا کہ میں مہمان لا رہا ہوں۔ اُس کا استقبال کرنا ہوگا۔ یہ ہماری اوطاق ہے۔ ہمیں آپ جیسے مہمانوں کی اکثر تلاش رہتی ہے۔" نوجوان نے مسکرا کر کہا۔

مونچھوں والے نے پیچھے بھاگنا چاہا مگر گلی کے کونے پر سپاہی رائفل تانے کھڑے تھے۔ مونچھوں والے کی حالت ایسی تھی جیسے کوئی سانپ اُسے سونگھ گیا ہو۔

"ہتھکڑی لگا دو۔" نوجوان نے کہا "اِکو مجھے اچھی طرح جانتا تھا لہٰذا ہوٹل میں بیٹھا دیکھ کر وہ غائب ہو گیا۔ لیکن اب کہاں جائے گا؟ میں پریشان تھا کہ تخریب کار گرفتار کیوں نہیں ہوتے؟ افسوس کہ تخریب کاروں کی سازشوں سے ہم آپس میں لڑتے ہیں۔ صبر و تحمل سے کام لے کر قانون سے تعاون کریں تو امن و امان کی صورتحال خراب نہ ہو۔"

اور مونچھوں والے سے مخاطب ہو کر نوجوان نے کہا "تم جیسے مہمان کی مہمانداری کے لئے یہی اوطاق صحیح ہے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ تم سے مال لے کر معاوضہ ضرور دیں گے۔ لہٰذا تمہیں بہت اچھے معاوضے کے طور پر عبرتناک سزا دی جائے گی۔ تم پریشان ہو رہے ہو کہ میں کون ہوں؟ میں اپنا تعارف کرا دیتا ہوں کہ مجھے انسپکٹر رحیم کہتے ہیں۔"

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

ہم سالنامہ ۸۴ء کی اشاعت کے موقعہ پر

دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں

اور دعا کرتے ہیں کہ

یہ خوبصورت ماہنامہ یونہی علم کی روشنیاں بکھیرتا رہے

اور وطن کے ننھے سفیر

اس سے علمی اور ادبی ماحنامے سے استفادہ کرتے رہیں

منجانب: راوی گلاس ۱۰ دیال سنگھ مینشنز۔ دی مال لاہور

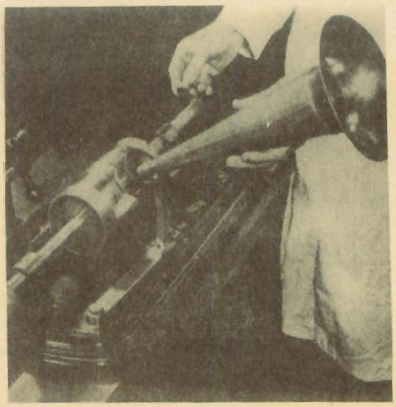
روشنی کا سفیر

محمد سلیم مغل

سیٹی بجاتی ہوئی ٹرین تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی غالباً وہ لیٹ ہو گئی تھی اور اسے منزل پر پہنچنے کی جلدی تھی۔ خوبصورت اور سرسبز کھیتوں سے گذرتی ہوئی ٹرین جب ایک موڑ پر پہنچی تو کھیتوں میں کام کرتے ہوئے کسانوں کو ریل گاڑی کے ایک ڈبے سے دھواں اٹھتا نظر آیا پھر یکایک ٹرین رک گئی اور لوگ اپنے اپنے ڈبوں سے اُتر کر اُس جانب چل دیئے جہاں آگ لگی ہوئی تھی آگ پر قابو پالیا گیا.....

مگر پھر ایک عجیب واقعہ ہوا جسے لوگوں نے حیرت سے دیکھا..... ریلوے کے عملے نے ڈبے سے سامان پھینکنا شروع کر دیا..... یہ سامان کیا تھا..... سبزی کی ٹوکریاں، اخبارات کے بنڈل، بوتلیں، نلکیاں اور کتابیں۔ اور ایک چھوٹی سی طباعت کی مشین۔ سارا سامان پھینکنے کے بعد انہوں نے ڈبے میں موجود





ایک پندرہ سالہ لڑکے کو بھی دھکا دے کر ڈبے سے نکال دیا..... کنڈیکٹر گارڈ جو گاڑی کے لیٹ ہو جانے اور آگ لگنے پر پہلے ہی بھنایا ہوا تھا، اس لڑکے قریب آیا اور ایک زوردار تھپڑ رسید کر دیا تھپڑ اتنا شدید تھا کہ لڑکا چکرا کر گر پڑا..... سب لوگ اپنے اپنے ڈبوں میں بیٹھ گئے ٹرین چل دی اور وہ لڑکا وہیں پُرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے سامان کے قریب بیٹھ گیا۔

گارڈ کا زوردار تھپڑ اس کے کان پر پڑا تھا جس نے اُسے تقریباً بہرا کر دیا تھا..... وہ لڑکا کان کی شدید تکلیف کے باوجود اپنے سامان پر بیٹھا رہا..... اسے اپنے اس بے وقعت سامان سے نہ جانے اسقدر محبت کیوں تھی؟

یہ واقعہ ۱۸۶۲ء میں امریکہ کی ایک ریاست مشی گن اسٹیٹ کے ایک دیہاتی راستے میں پیش آیا۔ وہ پندرہ سالہ لڑکا جو آگ لگنے کا قصوروار تھا، کون تھا..... ؟ یہ تو ہم آپ کو آگے چل کر بتائیں گے فی الحال یہ جان لیں کہ اُس کے سب دوست اُسے آئل کہہ کر پکارتے تھے اور وہ اسی نام سے جانا جاتا تھا۔

آئل ۱۸۴۷ء میں ایک ایری (Erie Lake) کے قریب میلان نامی ایک بستی میں پیدا ہوا اس کے والدین ہالینڈ سے کینیڈا اور پھر کینیڈا سے امریکہ آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ آئل ایک ایسے خاندان کا فرد تھا جو مزاجاً سخت اور سرکش تھا۔ کام کاج کے معاملے میں یہ لوگ بہت زیادہ محنتی تھے..... آئل کو محنت کی عادت اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملی تھی.....

اسکول کے زمانے میں آئل کا دل کتابوں میں نہ لگتا کلاس میں استاد پڑھا رہا ہوتا اور وہ پچھلی نشستوں پے بیٹھ کر دوستوں سے گپ شپ کرتا..... البتہ اُسے سوال کرنے اور کچھ نہ کچھ پوچھتے رہنے کی عادت جنون کی حد تک تھی..... وہ ہر چیز کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ باتیں جان لے۔ ایک روز اسکول کے دورے پر آنے والے انسپکٹر نے اُسے ایک ایسا لفظ کہہ دیا جس کے معنی نالائق کے تھے..... یہ لفظ اس کی سمجھ میں تو نہیں آیا البتہ اس نے اس کا ذکر اپنی ماں سے کیا۔ ماں جو شادی سے قبل خود بھی ایک معلّمہ تھی..... غصّے میں بھری ہوئی اسکول آئی..... اور انسپکٹر سے کہا کہ تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی کہ تم میرے بیٹے کو نالائق کہہ سکو..... ماں نے شدید غصّے کے عالم میں اپنا مکّا میز پر مارا اور کہا "میں اپنے بیٹے کو اسکول سے لے جا رہی ہوں..... اور یاد رکھو میرا بیٹا نالائق نہیں ہے۔ دیکھ لینا ایک روز اس کی شہرت کے ڈنکے پوری دنیا میں بجیں گے اور دنیا اس کا نام احترام سے لے گی"

ماں نے یہ بات بڑے عزم و یقین سے کہی تھی ..... وہ بچے کو اپنے ساتھ گھر لے گئی اور اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست گھر ہی میں کیا... چونکہ وہ خود استاد رہ چکی تھی اس لئے اُسے علم تھا کہ بچے کی بہتر تربیت کس طرح ممکن ہے؟

آیل جب واقعی بڑا آدمی بن گیا..... تو اس نے اپنی ایک تصنیف میں لکھا کہ "میں جو کچھ بھی بنا ہوں ماں کا بنایا ہوا ہوں۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا تھا کہ ماں کو مایوس نہیں کروں گا..... اسے بھی میرے متعلق یقین تھا اور وہ قول کی سچی تھی۔ میرے دِل میں یہ احساس پیدا ہوا کہ میں کس کے لئے زندگی بسر کر رہا ہوں۔ ماں کی یاد میرے لئے برکت کا سرچشمہ بنی رہی"۔

آیل کسی امیر کبیر گھرانے کا فرد نہیں تھا جسے ہر چیز اس کی خواہش کے مطابق مل جاتی بلکہ اُسے اپنے مستقبل کو بنانے کے لئے چھوٹی سی عمر سے کافی محنت کرنا پڑی۔ ابتدا میں گھر ہی کے پچھواڑے آیل سبزیاں بوتا اور انہیں بازار میں فروخت کر دیتا۔ اس آمدن کو وہ گھر کے اخراجات کے علاوہ اپنی پسند کی کتابوں پر خرچ کرتا۔ سبزی کا کاروبار نفع بخش ثابت ہوا۔ آیل اپنی سبزیوں کے علاوہ "ڈیڑائے" سے سستی سبزی خریدتا اور "پورٹ ہیورون" میں جا کر بیچ دیتا جہاں اسے اچھا نفع مل جاتا۔ پورٹ ہیورون بڑا شہر تھا..... بڑے شہر کی بڑی باتیں آیل نے بڑے شہر سے فائدہ اٹھایا ..... اچھی کتب جمع کیں..... نئی نئی چیزوں کا مشاہدہ کیا..... یہیں پر اس نے ریلوے کمپنی کی اجازت سے ڈیڑائے فری پریس کے اخبار بیچنا شروع کر دیئے... ٹرین جہاں رُکتی وہیں آیل اخبار بیچتا اب ٹرین کا ایک ڈبہ اس کا مستقل ٹھکانہ بن گیا تھا۔ یہ ڈبہ کیا تھا..... ایک عجیب و غریب ڈبہ تھا جس میں آیل کے علاوہ سبزی کی ٹوکریاں، اخبارات کے بنڈل، کتابیں اور سائنسی تجربات کا بہت سا سامان رکھا رہتا تھا..... اخبار بیچنے کے بعد فارغ وقت میں آیل یہاں پر سائنسی تجربات کرتا تھا جس کا شوق اسے جنون کی حد تک تھا..... ایسے ہی ایک تجربے کے دوران تیز رفتار گاڑی نے جب ایک موڑ کاٹا تو فاسفورس کا ایک ٹکڑا زمین پر گر گیا جس سے آگ لگ گئی..... آگ لگنے سے ڈبا بدر ہونے تک کا واقعہ آپ ابتدا میں پڑھ چکے ہیں... اب آپ یقیناً جاننا چاہتے ہوں گے۔

"آیل" کا اصل نام کیا تھا...؟ --- جی ہاں یہ ایڈیسن تھا دنیا کا سب سے بڑا سائنسدان... ہزاروں ایجادات کا موجد..... ان گنت عجوبوں کا خالق..... جو بہرہ تھا مگر بے بہرہ نہیں۔

ریل گاڑی میں آگ لگنے والے واقعے سے ایڈیسن دِل برداشتہ نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد اپنا چھوٹا سا پریس

جو کبھی ریل کے ڈبے میں تھا، گھر کے تہہ خانے میں لگا لیا اور اخبارات چھاپ کر بیچنا شروع کر دیئے۔ ٹرین کے ڈبے میں ایڈیسن جو اخبار چھاپہ کرتا تھا اس کا نام "ویکلی ہیرالڈ" تھا.... ٹرین میں چھپنے والا یہ دنیا کا پہلا اخبار تھا اور شائد آخری بھی۔ یہ اخبار بھی عجیب تھا جس کا مدیر بھی ایڈیسن تھا اور رپورٹر بھی۔ وہی اس کا کمپوزیٹر تھا اور وہی سرکولیشن مینجر بھی..... یوں گویا اخبار کی سب ذمہ داریاں ایڈیسن کے سر تھیں۔ صحافی ایڈیسن موجد ایڈیسن کیسے بنا، یہ بڑی دلچسپ کہانی ہے۔

۱۸۶۲ء میں مونٹ کلیمنز اسٹیشن پہ ایڈیسن نے اسٹیشن ماسٹر کے بچے کو رحمن کے نیچے آنے سے بچا لیا اسٹیشن ماسٹر نے خوش ہو کر پوچھا.... نوجوان میں تمہارے کس کام آسکتا ہوں؟ ایڈیسن نے جھٹ سے کہہ دیا مجھے تار برقی کا کام سکھا دیں.... اسٹیشن ماسٹر خوشی خوشی تیار ہو گیا.... ایڈیسن نے نہ صرف کم وقت میں اس کام پر عبور حاصل کر لیا بلکہ خوش قسمتی سے کم وقت ہی میں ایڈیسن کو ریلوے میں ملازمت بھی مل گئی... اسٹیشن پہ ایڈیشن کی ڈیوٹی رات کو ہوتی اور رات کو ہر ایک گھنٹے بعد نمبر ۱ کا ایک سگنل دینا پڑتا جس کا مقصد صرف یہ تھا کہ ڈیوٹی پر موجود آفیسر جاگتا رہے.... ایڈیسن نے ایک ایسا آلہ بنا لیا جو ہر گھنٹے بعد متعلقہ جگہ سگنل بھجوا دیتا اور ایڈیسن خود لمبی تان کر سو جاتا۔ ایک روز کنٹرولر نے ایڈیسن کو سوتے ہوئے دیکھا تو یہ راز منکشف ہوا کہ یہاں تو ایک آلہ ایجاد ہو چکا ہے.... یہ ایڈیسن کی گویا پہلی ایجاد تھی....

ایڈیسن کا تبادلہ ایک ایسے اسٹیشن پر ہو گیا جہاں بھنورے بہت تھے بس پھر کیا تھا... ضرورت ایجاد کی ماں ہے" کے مقولے کے تحت ایڈیسن نے ایک ایسی چیز بنا ڈالی جو کمرے میں داخل ہونے والے بھنورے کو مار دیتی.....

موجدوں کو اپنی زندگی میں عجیب و غریب دور دیکھنے پڑے ہیں کوئی نہ کوئی عتاب موجدین پر ہمیشہ سے آتا رہا ہے۔ ایسا ہی ایک عتاب ایڈیسن پر اس وقت آیا جب تجربہ کرتے ہوئے سلفیورک ایسڈ گرنے سے قیمتی قالین میں سوراخ ہو گیا اور ریلوے کے حکام نے ایڈیسن کو یہ کہہ کر ملازمت سے علیحدہ کر دیا کہ ہمیں "ملازمین کی ضرورت ہے موجدین کی نہیں"۔

ایڈیسن کی ایجادات کی تعداد ہزاروں میں ہے چھوٹی بڑی تقریباً ڈھائی ہزار ایجادات پیٹنٹ کروائیں..... ہر ایجاد کی علیحدہ کہانی ہے جنہیں چند صفحات میں بیان کرنا ممکن نہیں۔ البتہ فونوگراف اور بجلی کا بلب اس کی ایسی دوا ایجادیں ہیں جس نے دنیا پر گہرے اثرات مرتب کئے.... آواز کو قید کر کے اسے دوبارہ سننا لوگوں کے لئے ناقابل یقین بات تھی۔ فونوگراف میں پہلی بار جو آواز حیرت اور استعجاب کے ساتھ سنی گئی وہ تھی

میری کے پاس ایک چھوٹا سا لیلا تھا۔ اس کی آواز برف کی طرح سفید تھی۔ آواز کو قید کر کے دوبارہ سننے کے عمل سے اس عقیدے کو تقویت ملی کہ انسان کا ہر عمل محفوظ ہے اور یوم آخرت انسان کے اعمال اس کے سامنے آئیں گے.... فونوگراف کے پلاسٹک ریکارڈ بعد میں ایک اور سائنسدان امیل لبرز نے ایجاد کئے۔

بجلی کا بلب اس اعتبار سے بڑا کارنامہ تھا کہ بجلی کی قوت سے روشنی پیدا کرنے کا خیال تو کئی سائنسدانوں نے دیا لیکن اسے ثابت اڈیسن نے کیا..... اس کا بنایا ہوا پہلا بلب ۴۰ منٹ تک روشن رہا اس کی روشنی سے آنکھیں چندھیانے اور عقل حیران ہونے لگی۔

بجلی کا بلب یوں تو اکتوبر ۱۸۷۹ء میں ایجاد ہو گیا تھا مگر اسے عام ہوتے ہوئے دو تین سال لگے۔ ۱۸۸۲ء تک نیویارک میں بجلی کی روشنی کے دور کا آغاز ہو چکا تھا۔ دنیا بھر سے لوگ اڈیسن اور اس کی دریافت کو دیکھنے آئے اور اڈیسن کو متفقہ طور پر "سب سے بڑا امریکی" قرار دیا گیا۔

اڈیسن کے کارناموں اور سائنسی تحقیق کا اصل دور ۱۸۶۹ء سے ۱۹۳۰ء تک کا ہے۔ یہ عرصہ اس نے نیویارک یا اس کے قریب نیوجرسی میں گذارا جہاں اس نے بہت بڑی تجربہ گاہ بنائی۔ اس تجربہ گاہ کی وجہ سے مینلو پارک کا نام دنیا بھر میں مشہور ہوا۔

اپنی ایجادات کی بدولت اڈیسن نے پیسہ بھی بہت کمایا مگر پیسے کو ذریعہ سمجھا مقصد نہیں.... وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ "ہیرا پھیری کے ذریعہ پیسہ کمانے والے مکروہ حیوانات سے کم نہیں"۔ اڈیسن نے دو شادیاں کیں اور دونوں سے تین تین بچے تھے۔

اڈیسن بظاہر عام سا شخص تھا... میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے مزدوروں کے ساتھ مزدور بن جاتا... بہت محنت کرتا اور بہت کم آرام کرتا۔ اکثر کہا کرتا تھا کہ "زندگی تھوڑی ہے اور کام زیادہ کرنا ہے"

۱۸ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو دنیا کا یہ عظیم اور ہمہ جہت سائنسدان ۸۴ سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا اپنے مرنے کے بعد بھی یہ عظیم موجد اپنے کارناموں کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں زندہ ہے.... جو شخص بھی اڈیسن اور اس کے کارناموں سے واقف ہے وہ اس کا نام لیتے ہوئے اسے خراج تحسین پیش کرنا نہیں بھولتا۔ آپ بھی جب روشن قمقموں کو جگمگاتے ہوئے دیکھیں تو اس محسن کو ضرور یاد کریں جس کی بدولت روشنیوں کو فروغ حاصل ہوا اور اندھیرے سمٹنے لگے۔



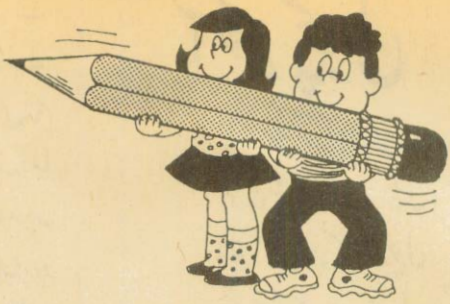
وطن کے ننھے سفیروں کے نام

ایک پیغام

پڑھنے لکھنے سے ہو کام ٹھیک نہیں ہے اب آرام
محنت ہو بس صبح و شام چمکاؤ دنیا میں نام

جیلانی انڈسٹریل کارپوریشن پرائیویٹ لمیٹڈ
الیف - ۳۱۲ ، سائٹ کراچی

ننھے ہاتھ نئی تحریریں



دُرست جواب

مرسلہ: عارف عبدالرحمن، میٹھا خیل کرک سرحد

پُرانے زمانے کی بات ہے کہ ایک ملک میں ایک بادشاہ تھا۔ بادشاہ کے بہت سے وزراء اور امراء تھے۔ ایک دفعہ بادشاہ کسی بات پر ایک امیر سے ناراض ہُوا۔ بادشاہ بہانہ بنا کر اس امیر کو سزا دینا چاہتا تھا۔ اس نے امیر کے گھر سپاہی بھیج دیئے اور اس کے ساتھ ایک حکم بھی لکھ بھیجا کہ تمہیں قید کی سزا ہو گئی ہے۔

اگر قید سے بچنا چاہتے ہو تو مجھے ایک گھوڑا بھیج دو لیکن شرط یہ ہے کہ گھوڑا نہ سفید ہو۔ نہ کالا ہو نہ دو رنگا۔ نہ سلیٹی الغرض اس نے وہ تمام رنگ گِنوا دیئے جو کسی گھوڑے کے ہوتے ہیں۔

امیر یہ سُن کر بہت پریشان ہو گیا۔ پھر اس کو جواب سُوجھ گیا۔ اس نے بادشاہ کو لکھا کہ حضور گھوڑا حاضر ہے۔ آپ کے آدمی لے جائیں لیکن شرط یہ ہے کہ نہ ہفتہ نہ اتوار نہ پیر، نہ منگل نہ بدھ اور نہ جمعرات کو آئے اور اتوار اور جمعہ کے روز بھی نہ آئے۔

البتہ ان دنوں کے علاوہ بادشاہ سلامت جس دِن چاہیں۔ گھوڑا منگوالیں۔

موم کا عجائب خانہ

مرسلہ: نعیم بابی اقبال کھارادر کراچی

لندن کی انوکھی چیزوں میں موم کا عجائب خانہ بھی ہے جس کو مادام تساؤ کا عجائب خانہ کہتے ہیں اس میں مشہور آدمیوں کے مومی پتلے بنا کر سجائے گئے ہیں۔ اور ایسی نقل اتاری گئی ہے کہ یقین ہو جائے کہ سچ مچ اصل آدمی کھڑے ہیں یہاں دیکھنے والوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ عجائب گھر میں پہنچتے ہی ایک سپاہی سیاہ وردی پہنے کھڑا نظر آتا ہے۔

دیکھنے والے کو خیال آتا ہے کہ یہ بتائے گا۔ کہ کس طرف سے عجائب خانہ دیکھنا شروع کیا جائے

لیکن دراصل یہ بھی موم ہی کا ایک پتلا ہے۔ نئے آدمی کو یقین نہیں آسکتا کہ یہ بے جان بت ہے عجائب خانے سے ایک کتابچہ ملتا ہے جس میں تمام پتلوں کے نام درج ہیں اندر جائیں تو ہر طرف دنیا کے مشہور سائنس دانوں، جرنیلوں، عالموں، شاعروں مُدیروں اور مصنّفوں میں سے اکثر کے پتلے وہاں موجود ہیں۔ لباس بھی انہیں وہی پہنایا گیا ہے، جو یہ مشہور آدمی عموماً پہنتے رہے تھے۔

کسی کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی ہے۔ کوئی گہری فکر میں ڈوبا ہوا ہے۔ ایک کا دایاں ہاتھ آگے بڑھا ہوا ہے۔ گویا وہ کسی بڑے جلسے میں تقریر کر رہا ہے۔ ایک جنرل فوجی لباس پہن کر تیار ہو رہا ہے۔ گویا ابھی گھوڑے پر سوار ہو کر لشکر کو حکم دے گا۔ مگر کوئی پتلا بول نہیں سکتا اگر انہیں زبان مل جائے تو عجائب خانے میں عجیب تماشا نظر آئے۔

عجائب خانے میں ایک تہہ خانہ ہے جس کا نام خوف کا کمرہ ہے۔ یہاں چھوٹے بچوں کو نہیں جانے دیا جاتا ہے کیونکہ وہاں بڑے بڑے ظالموں اور قاتلوں کے پتلے رکھے ہیں۔ یہاں روشنی بہت مدھم رکھی جاتی ہے تاکہ خوفناک چیزیں اور خوفناک نظر آئیں اس عجائب خانہ میں قدم قدم پر دھوکا ہوتا ہے کہ آیا یہ اصل ہے یا نقل عجائب گھر سے جب کوئی گھوم پھر کر باہر نکلے تو اُسے باہر کے آدمیوں پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ اصل ہیں یا نقل۔

آنکھ مچولی

مرسلہ: شرر آروی

آؤ بنائیں ایک ٹولی
ہاتھ میں لے کے آنکھ مچولی
رائج جتنی بھی ہیں بولی
سکھیاں اس کی، سب ہیں بھولی
پنجابی، بلوچی، سندھی، پشتو
چاروں پاکستان کی بولی
لیکن اُردو بھاشا یارو!
ہے یہ سارے دیش کی بولی
بولنے میں یہ فر فر فر فر
جیسے ہو بندوق کی گولی
سب کی خاطر پیار ہے اس میں
آؤ بھر لیں اپنی جھولی
دیکھو آیا کون دوارے
کاندھے پر لے کر کے ڈولی
بھیا لے کے ہنستے آئے
نیا شمارہ آنکھ مچولی
چاہے اس کو کچھ بھی کہہ لو
سب سے عمدہ اپنی ٹولی

مزید پنجابی

طارق بن زیادؒ

مُرسلہ۔ عبدالرشید تبسّم حاصل پور

اِسلام کے بہادروں میں طارق بن زیاد کا نام سرِفہرست ہے۔ آج سے ۱۳ سو سال قبل افریقہ کے شمال میں ایک بہادر قوم آباد تھی جسے بَربَر کہتے تھے۔ اس قوم کا ایک فرد زیاد تھا۔ جو دمشق میں سکونت پذیر تھا۔ اس کے ایک لڑکا پیدا ہوا تو طارق نام رکھا۔ اور وہ طارق بن زیاد کے نام سے مشہور ہوا۔

طارق کی ابتدائی تعلیم دمشق میں ہوئی۔ جب ۱۷ برس کا ہو گیا تو اس نے اسلامی فوج میں شامل ہو کر ایسے عظیم الشان کارنامے انجام دیئے کہ افریقہ کا حاکم موسیٰ بن نصیر اس سے بہت ہی خوش ہوا۔ لہٰذا وہ اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ جنگ کے تمام کام اسے سکھائے اور وہ بڑا جنگجو اور بیدار مغز جرنیل بن گیا۔ جب طارق فنِ حرب میں ماہر ہو گیا تو اسے مراکش کے ایک صوبہ طنجہ کا گورنر بنا دیا گیا۔ اس کے شمال میں ہسپانیہ کا ملک آباد ہے۔ جو اسلامی دور میں اندلس کہلاتا تھا۔ یہاں کی رعایا عیسائی حاکموں سے بہت نالاں تھی بادشاہ امیروں کے ساتھ تو اچھا سلوک کرتا مگر غریبوں کے ساتھ بُرا برتاؤ کرتا تھا۔ لہٰذا پہلے تو عوام نے اس کے خلاف بغاوت کی مگر بغاوت جب ناکام ہو گئی تو ان پر بے تحاشہ ظلم ڈھائے جانے لگے۔

ان مظالم سے تنگ آ کر لوگوں نے موسیٰ بن نصیر سے درخواست کی کہ وہ ہسپانیہ پر حملہ کر کے وہاں کے لوگوں کو بادشاہ کے ظلم سے چھڑائے۔ موسیٰ نے طارق کو حکم دیا کہ وہ سات ہزار مجاہدوں کو لے کر ہسپانیہ پر حملہ کر دے۔

طارق چار جہازوں میں فوج کو سوار کر کے اندلس کی طرف روانہ ہوا۔ چار جہازوں نے ان سپاہیوں کو ساحل ہسپانیہ پر جا اتارا۔ آخری جہاز میں طارق سوار ہوا۔ یہ فوج ہسپانیہ کے کنارے ایک پہاڑ کے دامن میں فروکش ہوئی جسے آج تک اس کے نام پر جبل الطارق یعنی طارق کی پہاڑی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

بعد ازاں آہستہ آہستہ پورے ہسپانیہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا اور طارق کی یہ فتح اسلام کی فتح تھی کیوں کہ اس کے حملے نے یورپ میں پیش قدمی کے راستے کھول دیئے تھے۔

جب طارق ہسپانیہ پہنچا تو اس نے اپنے تمام جہاز جلا دیئے۔ لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ کیا کیا۔ ہمارے سامنے دشمن ہے اور پیچھے سمندر ہے اور ہم یہاں غریب الوطن ہیں۔ طارق نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ہر ملک ہمارا ہے اس لئے کہ ہمارے خدا کا ملک ہے ہم یہاں رہنے آئے ہیں بھاگنے کے لئے نہیں آئے۔

چنانچہ مسلمانوں نے جان توڑ حملہ کیا اور طارق بن زیاد کی اس اچھی تدبیر کی وجہ سے مسلمانوں نے فتح حاصل کر لی

ندامت

مُرسلہ۔ زین خان پشاور

عرفان بڑا شرارتی لڑکا تھا۔ وہ ہر وقت شرارت

کے بارے میں سوچتا، ابّو اسے بہت سمجھاتے مگر وہ ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتا تھا۔

ایک دِن بہت بارش ہوئی۔ وہ کوئی شرارت سوچ رہا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی وہ باہر گیا اور اپنے دوست امجد کو بلا لایا۔ جس کو وہ شرارت سمجھا چکا تھا دونوں سڑک پر گئے اور ایک کنارے پر رسّی کے ایک سرے کو عرفان نے پکڑا اور دوسرا سرا امجد کے ہاتھ میں تھا۔ ایک دو آدمی گذرے مگر وہ نہ گرے انہوں نے جب دیکھا کہ ایک بوڑھا آدمی آرہا تھا تو دونوں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔ جیسے ہی بوڑھا وہاں پہنچا تو دونوں نے رسی کھینچی اور وہ بوڑھا گر گیا دونوں بھاگ گئے جب عرفان گھر پہنچا تو اس نے اُسی بوڑھے آدمی کو اپنے گھر میں پایا تو اس کے اوسان خطا ہو گئے ابھی وہ باہر جانے ہی لگا تھا کہ اس کی امّی نے آواز دی تو وہ ان کے پاس گیا۔ اُس کی امّی نے اُس سے کہا کہ یہ تمہارے دادا جان ہیں گاؤں سے آرہے تھے کہ راستے میں کسی شریر نے ان کو گرا دیا جب عرفان کے دادا ہوش میں آئے تو عرفان اِن سے گلے مل کر رونے لگا اور کہا کہ یہ تکلیف میں نے ہی آپ کو پہنچائی ہے مجھے مُعاف کر دیں دادا نے اُسے معاف کر دیا۔ کیوں کہ عرفان کی آنکھوں میں ندامت کے آنسو تھے اس نے شرارتوں سے توبہ کر لی اور اچھا لڑکا بن گیا۔

پہلی جنگ عظیم

مرسلہ: ناگمان خان ھمدم بلوچ تربت بلوچستان

پہلی جنگ عظیم اتوار ۲۸ جون ۱۹۱۴ء کو شروع ہوئی اور پیر ۱۱ نومبر ۱۹۱۸ء کو دن کے گیارہ بجے ختم ہوئی امریکہ کے پروفیسر نکولاس کا بیان ہے کہ اس جنگ میں بارہ کھرب روپیہ صرف اسلحہ پر صرف ہوا۔ اگر یہی رقم تعمیری کاموں میں صرف کر دی جاتی تو برطانیہ کینیڈا، امریکہ، فرانس، بلجیم، روس، جرمنی اور آسٹریلیا کے باشندوں کے ہر خاندان کے لئے پانچ ایکڑ زمین، ساڑھے چھ ہزار روپے کی مالیت کا مکان، دو ہزار روپے کا فرنیچر مہیا کیا جا سکتا تھا۔ ان ممالک میں ہر بیس ہزار آدمی کے لئے ایک کروڑ تیس لاکھ روپے کی لائبریری دو کروڑ ساٹھ لاکھ روپے کی یونیورسٹی ایک لاکھ اساتذہ اور سوا لاکھ نرسوں کے لیے معقول گزارے کے مستقل عطیے کا اہتمام کیا جا سکتا تھا اور اس کے باوجود اتنی رقم بچ جاتی کہ اس سے فرانس اور بلجیم کی تمام دولت اور جائیداد خریدی جا سکتی تھیں دوسری جنگ عظیم میں اس سے بھی زیادہ خرچ ہوا۔

ندیدہ کوّا

مرسلہ: سکینہ مسعود راولپنڈی

ایک کوّا تھا آپ تو جانتے ہیں کوّا ہر وقت کانیں کانیں کرتا رہتا ہے جس کوّے کی کہانی میں

آج آپ کو سنا رہی ہوں وہ ایک ندیدہ کوّا ہے اس کوّے کو طرح طرح کے کھانے کھانے کا بہت شوق تھا ہر وقت اس پر ایک ہی دھن سوار رہتی تھی کہ وہ قسم قسم کے کھانے کھاتا رہے ایک دِن اڑتے اڑتے اس کی نظر جو نیچے پڑی تو اس نے طرح طرح کے کھانے پکتے دیکھے تو جی للچایا اور نیچے کی طرف پرواز کی اور ایک محفوظ جگہ پر بیٹھ کر حالات کا جائزہ لینے لگا۔

اتفاق سے دیگ پکانے والا ذرا دور کوئی چیز لینے چلا گیا بس کوّے کو تو گویا موقعہ مل گیا اور جھٹ سے چاول، بریانی شامی کباب اور مزیدار کھانوں کو چکھنے لگا ذرا جلدی میں تھا اور ڈر تھا۔ کہ کہیں کوئی آ نہ جائے وہ جلدی جلدی کھانے لگا اور اس جلدی میں اس کی نظر نیچے پڑے ہوئے کوئلوں پر نہ پڑی اوپر سے کوا جو پھسلا تو سیدھا کوئلوں پر آن گرا تو منہ سے بے اختیار کائیں کائیں کی آواز سن کر دیگ پکانے والا فوراً آن پہنچا بس جی پھر کیا تھا؟ اس نے اپنی جوتی سیدھی کوے پر دے ماری۔ ایک تو کوئلوں کی جلن اوپر سے جوتی کی جو چوٹ پڑی تو سارے کھانے بھول گئے۔ اور کائیں کائیں کرتا ہوا بمشکل اُڑ پایا۔ کوّے نے ایسی توبہ کی کہ آئندہ لالچ نہیں کروں گا جو بھی روکھی سوکھی ملی اس پر اللہ کا شکر کیا کروں گا تو اس طرح کوے نے نصیحت پکڑی۔

اَقوالِ زرّیں

مرسلہ: شاہد حسین، موضع ڑہ شریف، لاہور

تحمل وقار کے ساتھ

جانچو: فراخ دلی کے ساتھ

مقابلہ کرو: احتیاط کے ساتھ

عبادت کرو: محبت کے ساتھ

سنو: توجہ کے ساتھ

ادا کرو: عجلت کے ساتھ

دیکھو: دلچسپی کے ساتھ

انتظار کرو: صبر کے ساتھ

منصوبہ بناؤ: فراست کے ساتھ

کھاؤ: اعتدال کے ساتھ

نہاؤ: پابندی کے ساتھ

سانس لو: روانی کے ساتھ

آرام کرو: وقفوں کے ساتھ

عطا کرو: فیاضی کے ساتھ

جیو: حوصلے کے ساتھ

خرچ کرو: سمجھ کے ساتھ

بولو: اختصار کے ساتھ

غور کرو: گہرائی کے ساتھ

خدمت کرو: آمادگی کے ساتھ

تمنا کرو: استحقاق کے ساتھ

اعتماد کرو: یقین کے ساتھ

امانت

مرسلہ: شہاب الدین ملک سانگھڑ

امانت کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز کسی کے پاس رکھی جاتی ہے وہ چیز اسی طرح واپس کی جاتی ہے جو کام کسی کے سپرد کیا جائے اسے اچھی طرح کیا جائے جس میں یہ خوبی ہوتی ہے اسے امین یا امانت دار کہتے ہیں اگر لین دین میں کسی قسم کی کمی بیشی کی جائے یا رکھی ہوئی چیز اسی طرح واپس نہ کی جائے یا سونپا ہوا کام اچھے طریقے سے نہ کیا جائے تو اسے خیانت کہتے ہیں۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

جس شخص میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں آپ نے زندگی بھر اس کا سبق دیا اس پر عمل کیا امانت روپے پیسے کے علاوہ فرائض اور دوسرے کاروبار میں بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر استاد کوئی والدین کو پیغام دیں اور طالب علم آدھی بات ماں باپ کو بتائے اور آدھی بات جان بوجھ کر نہ بتلائے تو گویا اس نے امانت میں خیانت کی ہے

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

مرسلہ: محمد سعید عباس کراچی

اسکول کی چھٹی کی گھنٹی بجی فہیم نے اپنا بستہ اٹھایا اور ظفر کی جانب دیکھتے ہوئے بولا چلو چلیں ظفر جو اپنا سر ڈیسک پر رکھے ہوئے بیٹھا تھا فہیم کی بات سن کر چونکا اور پھر بستہ اٹھا کر فہیم کے ساتھ اسکول سے باہر نکل گیا تمہاری طبیعت خراب تھی تو تمہیں چھٹی کر لینا چاہیے تھی۔ فہیم نے ظفر سے کہا ہاں صبح مجھے کچھ محسوس تو ہوا تھا کہ طبیعت آج خراب ہے مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ زیادہ خراب ہو جائے گی ظفر بولا اتنی دیر میں فہیم کے گھر سے ڈرائیور گاڑی لے کر آگیا چلو ظفر میں تمہیں تمہارے گھر چھوڑتا چلوں۔ فہیم نے کہا۔ نہیں لو میری گاڑی بھی آگئی ہے ظفر نے کہا اور پھر ہاتھ ہلاتا ہوا اپنی گاڑی کی جانب چل پڑا

فہیم اور ظفر اپنے اسکول کی آٹھویں جماعت میں پڑھتے تھے فہیم کے والد ایک گارمنٹ فیکٹری کے مالک تھے جب کہ ظفر کے والد ایک دوائیاں بنانے والی ایک کمپنی کے۔ ان کی کمپنی کی تیار شدہ دوائیاں اندرون ملک اور بیرون ملک سپلائی کی جاتی تھیں۔

ظفر کے والد سیٹھ افضال اس وقت اپنے آفس میں بیٹھے ہوئے تھے ان کے سامنے ان کا سیکرٹری طارق بھی بیٹھا ہوا تھا۔ طارق تمام کام ہوشیاری سے کرنا ذرا سی غلطی معاف نہیں کروں گا سیٹھ افضال نے طارق کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

آپ فکر نہ کریں سر آپ کے پلان کے مطابق ہماری کمپنی کی تیار کردہ نقلی دوائیاں پورے ملک میں موجود میڈیسن کی بڑی بڑی دو کانوں پر پہنچ گئی ہیں اور لوگ کم قیمت کی وجہ سے زیادہ تعداد میں دوائیاں خرید کر استعمال کر رہے ہیں اگر ہماری تیار کردہ دوائیاں

اسی طرح لگتی رہیں تو بہت جلد ہمیں نقلی دوائیوں کی دوسری کھیپ مارکیٹ میں بھجوانی پڑے گی طارق بولا۔

ویری گڈ تم فوراً مزید دوائیاں تیار کروانا شروع کردو تاکہ جیسے ہی مارکیٹ سے دوائیاں ختم ہوں ہم اور دوائیاں سپلائی کرسکیں" سر آپ بے فکر رہیں اس کا انتظام میں پہلے ہی کر چکا ہوں طارق نے کہا شاباش طارق اب وہ دن دور نہیں جب ہمارے سامنے نوٹوں کے ڈھیر لگے ہوں گے ہاہا ہا ہا سیٹھ افضال نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور طارق بھی اُن کے ساتھ مسکرانے لگا۔

ظفر گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے میں جا کر بستہ ایک جانب رکھ کر لیٹ گیا تھوڑی دیر بعد ظفر کی امی داخل ہوئیں اور ظفر کی جانب دیکھ کر بولیں کیا بات ہے بیٹا تم آج اگر سیدھے لیٹ گئے تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور پھر ظفر کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولیں ارے تمہیں تو تیز بخار ہے تم آرام سے لیٹو میں ابھی ڈاکٹر صاحب کو ٹیلی فون کر کے بلاتی ہوں۔

فہیم بیٹا کہاں جارہے ہو فہیم کی امی نے فہیم کی جانب دیکھتے ہوئے کہا امی میں ظفر کے گھر جا رہا ہوں اس کی طبیعت آج اسکول میں بہت خراب ہوگئی تھی ارے ہاں ضرور جاؤ میری جانب سے بھی پوچھ لینا ٹھیک ہے امی فہیم نے کہا اور اپنی سائیکل اُٹھائی اور ظفر کی گھر کی جانب چل پڑا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ظفر کے گھر پہنچ گیا آنٹی اب ظفر کی طبیعت کیسی ہے فہیم نے ظفر کی امی سے پوچھا اب کچھ ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب دیکھ کر گئے ہیں انہوں نے کچھ دوائیاں لکھ کر دیں تھیں جو میں نے کرموبابا سے منگوائی ہیں۔ لو کرموبابا آگئے انہیں نے سامنے سے آتے ہوئے کرموبابا کی جانب دیکھ کر کہا کرموبابا نے پاس پہنچ کر وہ دوائیاں ظفر کی امی کو دے دیں ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے مطابق وہ دوائیاں ظفر کی امی نے ظفر کو پلا دیں ان دوائیوں کے پیتے ہی ظفر کی حالت بہت خراب ہوگئی ظفر کی امی نے فوراً ٹیلی فون کر کے ڈاکٹر صاحب کو بلایا ڈاکٹر صاحب نے آکر ظفر کو دیکھا اور پھر بولے اسے فوراً ہسپتال میں داخل کرنا پڑے گا اور پھر وہ فہیم اور ظفر کی امی ظفر کو لے کر ہسپتال چلے گئے جاتے جاتے ظفر کی امی نے کرموبابا سے کہا کہ وہ سیٹھ صاحب کو ٹیلی فون کر کے بتا دیں کے ظفر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ ٹرن ٹرن ٹیلی فون کی گھنٹی بجی سیٹھ افضال نے ہاتھ بڑھا کر پاس میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کا رسیور اٹھایا اور بولے ہیلو کیا دوسری جانب سے کچھ سننے کے بعد بولے تم فکر نہ کرو بابا میں ابھی آرہا ہوں۔ سیٹھ افضال نے کہا اور ریسیور رکھ دیا اور پھر سامنے بیٹھے ہوئے طارق کی جانب دیکھ کر بولے طارق تم یہاں کا خیال رکھنا میں گھر جارہا ہوں ظفر کی طبیعت بہت خراب ہے۔ آپ بے فکر ہو کر گھر جائیں میں

سب کچھ سنبھال لوں گا طارق نے کہا سیٹھ افضال تھوڑی دیر میں گھر پہنچ گئے وہاں انہیں کرموں بابا سے پتہ چلا کہ ظفر کی طبیعت زیادہ خراب ہو جانے کی وجہ سے اُسے ہسپتال لے جایا گیا ہے تو وہ ہسپتال کی جانب روانہ ہو گئے

ہسپتال پہنچ کر سیٹھ افضال نے ڈاکٹر سے پوچھا ڈاکٹر صاحب اب ظفر کا کیا حال ہے سیٹھ صاحب ہمیں افسوس ہے کہ ہم آپ کے بچے کی جان نہیں بچا سکے نقلی دوائی کھانے کی وجہ سے اس کے جسم میں زہر پھیل گیا تھا نہیں ڈاکٹر یہ نہیں ہو سکتا میرا بیٹا نہیں مر سکتا سیٹھ افضال نے چیخ کر کہا ذرا دوائی کی وہ شیشی تو لاؤ جس کے کھانے سے یہ حادثہ پیش آیا ہے ڈاکٹر صاحب نے پاس کھڑی ہوئی نرس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا نرس نے پاس میز پر رکھی ہوئی وہ شیشی ڈاکٹر صاحب کو دے دی۔ ڈاکٹر صاحب نے وہ دوائی شیشی سیٹھ افضال کے سامنے کر دی جس پر ان کی کمپنی کا لگا ہوا لیبل ان کا منہ چڑا رہا تھا۔

سَاتھی

مرسلہ: محبوب احمد، کنری پاک

عامر اور مجید میں بہت دوستی تھی اور وہ ایک دوسرے کو بہت چاہتے تھے اور ایک دوسرے کے لئے جان دینے کو تیار رہتے تھے وہ دونوں ایک ہی کلاس میں پڑھتے تھے اور دونوں ذہین اور محنتی تھے۔ کلاس میں اور بھی بہت سے لڑکے تھے جو ان کی دوستی سے خائف رہتے تھے اور ان دونوں کو لڑانا چاہتے تھے۔

ان میں سے ایک نواب بھی تھا جو ان دونوں کو لڑانا چاہتا تھا۔ ایک دن نواب نے عامر کی کاپی چرا کر مجید کے بستے میں رکھ دی جب عامر نے اپنی کاپی دیکھی تو اسے اپنے بستے میں ملی تو وہ بہت حیران ہوا اور ماسٹر صاحب کو بتایا ماسٹر صاحب نے پہلے لڑکوں کو کہا کہ جس نے عامر کی کاپی چرائی ہے وہ اسے واپس کر دے مگر کسی نے واپس نہ کی۔ جب عامر نے تمام بستوں کی تلاشی لی مگر اسے کاپی نا ملی۔ تو اس نے مجید کے بستے کی تلاشی لی تو وہاں سے اسے اپنی کاپی مل گئی اور استاد صاحب نے بھی مجید کے ڈنڈے رسید کئے۔

نواب تو اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا اور عامر اور مجید ایک دوسرے سے ناراض ہو گئے۔

ایک دن نواب روڈ کراس کر رہا تھا تو مجید نے دیکھا کہ نواب کے پیچھے ایک تیز رفتار ٹرک آ رہا ہے اس نے جلدی سے نواب کے پیچھے آ کر اسے کھینچا اور ٹرک کی زد سے بچا لیا۔

نواب مجید کے اس فعل سے بہت خوش ہوا اور اسے بتایا کہ عامر کی کاپی اس نے چرائی تھی اور مجید کے بستے میں رکھی اور اس نے عامر کو بھی اصل حقیقت سے آگاہ کیا اور عامر اور مجید دوست بن گئے اور ان کے ساتھ ایک اور دوست کا اضافہ ہو گیا اور وہ تھا نواب۔

پھیتے کا غرور

ندیم احمد انصاری
لطیف آباد، عید آباد

خلیل ایک محنتی کسان تھا۔ اُس نے ایک خوبصورت

سی بلّی پال رکھی تھی۔

ایک روز خلیل جنگل کے کنارے اپنے کھیت میں ہل چلا رہا تھا، اس کی پالتو بلّی ہمیشہ کی طرح اس کے ساتھ تھی کچھ دیر تو وہ بھی خلیل کے ساتھ بیلوں کے پیچھے گھومتی رہی۔ پھر تتلیوں اور چڑیوں کا پیچھا کرتی ہوئی جنگل میں چلی گئی

جنگل میں برگد کے درخت کے نیچے ایک خونخوار چیتا آرام کر رہا تھا۔ جب اس نے بلّی کو دیکھا تو اس کو بہت تعجب ہوا۔ اس نے بلّی کو اپنے پاس بلا کر اس سے پوچھا۔

" دیکھنے میں تو تم بالکل میرے جیسی ہو لیکن آخر اتنی چھوٹی کیوں ہو۔؟"

چالاک بلّی نے اس طرح منہ بنایا جیسے بہت زیادہ بیمار ہو۔ پھر کراہ کر بولی۔

"اے جانوروں کے بادشاہ کیا بتاؤں؟ کاش تم یہ جانتے کہ انسانوں کے درمیان رہنا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے!"

"کون تمہیں تانے کی جرأت کرتا ہے؟ مجھے اس انسان کو دکھاؤ۔ میں اس سے بدلہ لوں گا۔" چیتا دہاڑا۔

بلّی چیتے کو خلیل کے پاس لے آئی۔ خلیل کو دیکھتے ہی چیتا گرجا۔

" اے ظالم انسان! تو نے میرے رشتہ دار کو کیوں اس قدر ستایا کہ اس کا قد بڑھنا رک گیا اور وہ اتنا چھوٹا ہو گیا؟ اب میں اس کی حفاظت کے لئے تم سے لڑوں گا"

خلیل نے کہا۔" مجھے منظور ہے، لیکن پہلے مجھے اپنی طاقت لینے کے لئے گھر جانا ہو گا۔"

چیتا بڑے غرور سے بولا۔" ہاں! ضرور لے آؤ۔ میں تمہارا یہیں انتظار کروں گا۔"

خلیل نے کہا۔" لیکن تم مجھے بیوقوف بنا کر غائب ہو سکتے ہو۔ اگر تم بھاگ گئے تو میرا گھر تک جانا اور طاقت لانا بے کار ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ میں تمہیں رسی سے اس پیڑ میں باندھ دوں، جب میں اپنی طاقت لے کر واپس آؤں گا تب تم سے لڑوں گا۔ اس کے بعد ہی دیکھیں گے کہ کون جیتتا ہے۔"؟

چیتا تو طاقت کے غرور میں اندھا ہو رہا تھا اس نے فوراً خلیل کی بات مان لی۔

خلیل نے اس کو ایک مضبوط رسّی سے پیڑ کے تنے میں باندھ دیا اور خود جنگل کی طرف دوڑ گیا۔ ایک جنگلی درخت سے ایک موٹی شاخ کاٹی اور اسے گھماتا ہوا واپس آیا اور چیتے کے پاس پہنچ کر بولا۔

" دیکھو یہی میری طاقت ہے۔" اور اس نے چیتے کو بے تحاشہ پیٹنا۔ شروع کر دیا۔

چیتا دھاڑا۔ زمین اور آسمان اُس کی گرج سے لرز گئے۔ خلیل اسے پیٹتا رہا۔ اور وہ دہاڑتا رہا۔ خلیل اُس وقت تک نہیں رُکا۔ جب تک اس درندے کی اکڑ نہیں نکل گئی۔

جب چیتا مار کھا کھا کر نڈھال ہو گیا۔ تب خلیل نے رسّی کھولی اور بولا۔" اب دم دبا کر فوراً یہاں سے بھاگ لو۔ دوسروں کے معاملے میں جس میں تمہارا کوئی سروکار نہ ہو کبھی دخل نہ دینا۔ جب بھی گھمنڈ تمہارا دماغ خراب کرنے لگے تو مجھے یاد کر لینا۔ چلو، نو دو گیارہ ہو جاؤ۔"

چیتا لڑکھڑاتا ہوا، درد سے کراہتا ہوا۔ مری مری سی چال چلتا ہوا جنگل کی طرف چل دیا۔ جب وہ بلّی کے

پاس سے گزرا تو لڑکھڑاتی آواز میں بولا۔

"سچ مچ یہ معجزہ ہی ہے کہ تم اتنے سنگدل آدمی کے ساتھ کم از کم اتنی بڑی تو ہوگئی ہو۔!"

چڑیا کی نصیحت

مرسلہ: سرفراز حسین زیدی، کراچی

کسی شکاری نے جال میں ایک چڑیا پھانسی۔ جب جال سے نکال کر اُس کے پَر باندھنے لگا تو چڑیا بولی "میاں شکاری! تم میرے پروں میں گرہ باندھ کر کیا کرو گے۔" شکاری نے کہا بی چڑیا صاف صاف کہو کیا چاہتی ہو؟ چڑیا نے کہا میری مانو تو میرے پروں میں گرہ لگانے کے بجائے میری تین نصیحتیں گرہ میں باندھ لو ان پر عمل کرو گے تو بہت نفع اٹھاؤ گے۔"

شکاری بولا "ٹھیک ہے نصیحت کرو دل کو لگی تو تمہیں آزاد کر دوں گا ورنہ بازار میں تم سے پیسے بناؤں گا۔ پہلی نصیحت چڑیا نے کی۔

سن لاکھ اگر کوئی سنائے۔
کیجو وہی جو سمجھ میں آئے

شکاری نے کہا "بی چڑیا! تم نے واقعی بڑے کام کی نصیحت کی انسان کو بات ہر ایک کی سننی چاہیئے۔ جو اس کی عقل میں آئے۔ اچھا اب دوسری نصیحت کرو۔ چڑیا بولی۔ نہیں پہلے مجھے آزاد کرو دم آئے گا تو دوسری نصیحت کروں گی۔ جو پہلی سے زیادہ قیمتی ہو گی۔

آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجو۔
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجو

شکاری نے کہا "بے شک کھوئی ہوئی چیز سے ہاتھ دھونا اور جاتی ہوئی کے غم میں جان کھونا بڑی نادانی ہے۔ میں تمہاری پہلی نصیحت کے ساتھ اسے بھی یاد رکھوں گا اور ہمیشہ اس پر عمل کروں گا۔" چڑیا نے کہا "میاں شکاری! بس رہنے دو تم نے میری پہلی نصیحت پر بہت عمل کیا ہے جواب دوسری پر عمل کرو گے۔ میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ سن لاکھ اگر کوئی سنائے۔ کیجو وہی جو سمجھ میں آئے مگر تم نے میری چکنی چپڑی باتوں میں آکر مجھے آزاد کر دیا حالانکہ میرے پیٹ میں ایک بیس تولے کا ہیرا تھا جو اگر تمہیں مل جاتا تو تمہاری سات پشتیں تک عیش کرتی۔" شکاری کو چڑیا کی بات سن کر اپنی نادانی پر بڑا افسوس ہوا اور اس نے کچھ سوچ کر اس کی جانب ایک بار پھر جال پھینکا مگر چڑیا اس مرتبہ ہوشیار تھی اڑ کر اونچی شاخ پر جا بیٹھی شکاری نے کھسیا کر کہا "اچھا اب تیسری نصیحت کرو۔"

چڑیا نے کہا "میاں شکاری! تم نے پہلی نصیحت کی طرح دوسری بھی ضائع کی بھلا سوچو تو! میرا سارا وزن دس تولے سے زیادہ نہیں کہیں بیس تولے کا ہیرا پیٹ میں ہو سکتا ہے اور پھر جب تم ایک بار مجھے کھو چکے ہو تو اب اس کا غم کرنے سے فائدہ؟ میں نے اپنی دوسری نصیحت میں نہیں کہا تھا کہ آتا ہو تو

ہاتھ سے نہ دیجو۔ جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجو۔

شکاری کو اپنی حماقت کا احساس ہوا تو بڑا شرمندہ ہوا۔ کچھ دیر ندامت سے خاموش رہا پھر بولا "اچھا بی چڑیا اس مرتبہ تم جو نصیحت کرو گی اس پر میں عمل ضرور کروں گا۔"

چڑیا نے کہا میری تیسری نصیحت یہ ہے کہ جب کوئی تمہیں نصیحت کرے تو اس پر عمل کرنے سے پہلے غور کر لیا کرو چڑیا یہ کہہ کر اڑتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئی۔

نظم

مرسلہ: شمس الدین ابن شیخ

پرانی دھدکالونی حیدرآباد

محبت کی نعمت سے بڑھ کر نہیں کچھ
محبت کے دامن میں آکر تو دیکھیں
برائیوں سے گرچہ ہے دل اپنا زخمی
محبت کا مرہم لگا کر تو دیکھیں
نبیؐ کے ہی نسخہ میں سب کی دوا ہے
یہ نسخہ کبھی آزما کر تو دیکھیں
نصیحت اگرچہ ہے کڑوی سی گولی
نگل کر شفا اس سے پا کر تو دیکھیں
ہے مشکل پہاڑوں پہ چڑھنا یقیناً
مگر پتھروں کو ہٹا کر تو دیکھیں
محبت خدا کی اطاعت ہے مرزاؔ
محبت کا گر آزما کر تو دیکھیں

ضدی لڑکی

مرسلہ: مریمہ مقصود جیکب لائن کراچی

"کیا مشکل ہے"۔

انیلا نے جھلاتے ہوئے کہا۔ وہ مسلسل دو گھنٹے سے اپنا یونیفارم استری کر رہی تھی مگر کپڑے تھے کہ استری ہی نہ ہو پا رہے تھے۔

اس نے ٹوٹی ہوئی استری زمین پر پٹخ دی اور اٹھ کھڑی ہوئی اسے اسکول سے دیر ہو رہی تھی انیلا کپڑے پہن کر اسکول جانے کے لئے تیار ہو گئی۔

"اچھا اماں خدا حافظ"

وہ اسکول کے راستے پر دوڑنے لگی وہ سوچتی جا رہی تھی کہ خدا نے ساری مصیبتیں ہم غریبوں ہی کے لئے بنائی ہیں میرے اسکول کی امیر لڑکیاں تو گاڑی میں اسکول آتی ہیں۔

انہی سوچوں میں غرق وہ اسکول پہنچ گئی۔

انیلا کے ماں باپ بہت غریب تھے انیلا اُن کی اکلوتی اولاد تھی ماں باپ اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر انیلا ہر وقت اپنی غریبی کا اظہار کرتی رہتی اُس کی ماں اسے بہت سمجھاتی مگر وہ کچھ نہ سنتی تھی۔ اُس کی ماں کہتی کہ "بیٹا اسی میں شکر کرو۔ کئی لوگوں کو تو دو وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی ہم تو بہتر ہیں" مگر انیلا ان کی باتوں پر کان نہ دھرتی اور ہر وقت امیروں کی برائیاں کرتی رہتی۔

ایک روز انیلا کی جماعت میں نئی لڑکی داخل ہوئی اس کا نام نائلہ تھا انیلا، نائلہ سے بہت جلتی تھی دوسری لڑکیوں سے اُس کی بُرائی کرتی کیونکہ نائلہ ایک امیر گھر کی بیٹی تھی۔ انیلا کہتی تھی کہ نائلہ مغرور لڑکی ہے جب کہ اس کے برعکس نائلہ ایک بہت ہی اچھی لڑکی تھی اکثر وہ انیلا سے بات کرنے کی کوشش کرتی مگر انیلا اُسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ وہ ایک ضدی لڑکی بن چکی تھی اس کی ماں اُس سے سخت نالاں رہتی تھی۔

ایک روز اس کا قلم کھو گیا اس نے بہت شور مچایا گھر آئی تو ماں سے بولی۔

"اماں میرا قلم کھو گیا ہے مجھے دوسرا قلم خریدنے کے لئے رقم دے دیں۔

اس کی ماں نے کہا کہ۔

"میں دوسرا قلم لے کر نہیں دے سکتی میرے پاس صرف چار روپے ہیں اور تم پندرہ روپے والا قلم لو گی۔ تمہیں اپنے قلم کو سنبھال کر رکھنا چاہیئے تھا انیلا نے بدتمیزی سے کہا "میں نہیں جانتی بس مجھے قلم چاہیئے میری جماعت کی لڑکیاں تو بہت مہنگے مہنگے قلم لے کر آتی ہیں میں تو صرف پندرہ روپے والا قلم مانگ رہی ہوں۔ واقعی غریبوں کے لئے بہت مشکلات ہوتی ہیں۔"

شام کو انیلا کے ابّو آئے تو انہوں نے انیلا کو قلم کے لئے پیسے دیئے انیلا بہت خوش ہوئی۔

عید قریب تھی۔ انیلا کی جماعت کی سب لڑکیوں کے لباس تیار ہو چکے تھے اُن کے اسکول کی چھٹیاں تھیں۔

انیلا کے کپڑے بھی بن چکے تھے البتہ اُس کے جوتے نہیں آئے تھے اُس کے باپ کے پاس پیسے نہیں تھے انیلا بہت غصّے میں تھی کہنے لگی کہ "مجھے جوتے اِس عید پر ضرور چاہئیں۔

باپ نے کہا کہ اپنے پرانے جوتے پہن لو اگلی عید پر انشاء اللہ تمہیں نئے جوتے لے دوں گا۔

خیر اِس عید پر انیلا کو نئے جوتے نہیں مل سکے تھے۔

عید کے بعد اُس کا اسکول کھُل گیا اسکول میں لڑکیوں نے اُس سے پوچھا کہ تمہاری عید کیسی گذری؛ اس نے کہا "بہت بور گذری مجھے اِس عید پر نئے جوتے نہیں مل سکے بہت غصہ آیا تھا مجھے عید والے دِن اور ہاں تمہاری عید تو بہت اچھی گذری ہوگی خاص طور پر نائلہ کی عید تو شاندار ہوئی ہوگی۔ نئے کپڑے اور نئے جوتے ملے ہوں گے واہ، واہ۔"

اتنے میں نائلہ بھی وہاں آپہنچی وہ کہنے لگی کہ بھئی کیا باتیں ہو رہی ہیں۔ حالانکہ وہ ان کی باتیں سن چکی تھی اس نے کہا کہ میں نے عید والے روز ایک ایسے معذور آدمی کو دیکھا تھا جس کے پاؤں نہیں تھے اس آدمی نے چلّا کر لوگوں کو متوجہ کیا اور کہا کہ۔

"تم لوگوں نے تو جوتے پہن رکھے ہیں مگر میرے

تو پاؤں بھی نہیں ہیں

نائلہ کی کہانی عاصمہ، ساجدہ، ارم اور انیلا نے بہت دلچسپی سے سنی انیلا نے کہا کہ۔

"واقعی نائلہ تم عظیم ہو تم نے مجھے کہانی کی صورت میں ایک نہایت اچھی بات بتائی ہے میں تمہاری شکر گذار ہوں اور وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کسی سے حسد نہیں کروں گی۔"

اتنے میں دعا کی گھنٹی بجی سب سہیلیاں مسکراتی ہوئی دُعا کے لئے چلی گئیں۔

اب انیلا اور نائلہ پکی دوست بن چکی تھیں۔

چور

مرسلہ، محمد فیصل، ٹنڈو الٰہ یار

ہماری دادی کی عمر ایک سو دس سال ہے لیکن اب بھی وہ بہت صحت مند ہیں اور باریک سے باریک چیز ڈھونڈ لیتی ہیں۔ ایک دِن دادی اماں نے صبح صبح شور مچانا شروع کر دیا۔ ہائے ہائے میری پوٹلی چور لے گیا۔ جب ابا جان نے پوچھا تو دادی اماں کہنے لگیں "میں نے ایک ایک روپیہ اکٹھا کیا تھا۔ اس میں پورے ایک ہزار روپے تھے تو ابا جان نے ہم سب کو بلایا اور پوچھا " پوٹلی کس نے چرائی ہے جب کوئی نہ مانا تو دادی نے کہا "ابھی چور کا پتہ لگ جاتا ہے انہوں نے تسبیح پر کچھ پڑھا اور ایک ڈنڈا لے کر اندر گئیں پھر ہم سب کو کہا کہ باری باری اندر جائیں اور اس ڈنڈے کو ہاتھ لگائیں جو چور ہو گا وہ اس ڈنڈے کے ساتھ چمٹ جائے گا۔" ہم سب نے باری باری ڈنڈے کے ہاتھ لگایا اور واپس آ گئے تو دادی نے ہم سب کے ہاتھ الٹ پلٹ کر دیکھے پھر سلیم سے کہا کہ تم چور ہو۔ کیونکہ میں نے ڈنڈے پر سیاہی لگائی تھی اور تم نے اس ڈر سے کہ کہیں چمٹ نہ جاؤں ہاتھ نہ لگایا اور پکڑے گئے" اور یوں دادی اماں نے آسانی سے چور پکڑ لیا۔

ساتواں شہزادہ

بینا محسن، شرف آباد، کراچی

بہت عرصہ گزرا ایران پر ایک رحم دل بادشاہ محمد سلیمان حکومت کرتا تھا۔ اُس کا ملک بہت خوشحال اور طاقت ور تھا۔ اس لئے آس پاس کے دوسرے بادشاہ اُس سے بہت جلتے تھے۔ اُس کے سات بہت ہی لائق بیٹے تھے۔ ایک دفعہ پڑوسی بادشاہ جو کہ بہت زیادہ طاقتور نہیں تھا اس لئے جنگ نہیں کر سکتا تھا۔ ساتویں شہزادے کو اغوا کر لیا اور کہلا بھیجا کہ جب تک ہمیں ملک کی پیداوار کا نصف حصہ نہیں ملتا ہم تب تک شہزادے کو نہیں چھوڑیں گے جب یہ خبر ملکہ اور بادشاہ محمد سلیمان تک پہنچی تو وہ سخت پریشان ہوئے۔ بادشاہ چونکہ بہت نیک دل تھا اس لئے وہ نہیں چاہتا تھا کہ جنگ ہو لیکن اس

کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ محمد سلیمان نے چڑھائی کردی۔ ادھر وہ بھی پوری طرح تیار تھے لیکن محمد سلمان کی فوج کے آگے وہ چوہوں کی طرح بھاگ گئے۔ پڑوسی بادشاہ کو زبردست شکست ہوئی اور ساتواں شہزادہ رہا ہوگیا۔ سزا کے طور پر محمد سلمان نے حکم دیا کہ اب یہ ملک اپنی پیداوار کا نصف حصہ ایران کو دیا کرے گا۔ اور یوں پڑوسی بادشاہ کو ساتویں شہزادے کی قید پر بہت کڑی سزا ملی۔

انجام

عبدالرشید اعوان کنڈی
سندھ

آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھی موسم بڑا خوشگوار تھا اس خوشگوار موسم میں فرحان نے سوچا کہ کیوں نہ سمندر کے ساحل پر جاکر اس موسم کا لطف اٹھایا جائے چنانچہ یہی سوچ کر فرحان اپنے بڑے بھائی ذیشان بیٹھے کہیں کہ رہے ہو باہر نکل کر دیکھو تو موسم کتنا خوشگوار ہے۔ ساحل پر چلیں ذیشان کچھ لکھنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ اس نے کہا تم جاؤ مجھے فرصت نہیں۔ فرحان کا اکیلے جانے کا دل نہیں کر رہا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ وقت کیسے گذرے۔ کافی دیر تک سوچتا رہا لیکن اس کے ذہن میں کوئی ترکیب نہ آئی۔ ٹرن ٹرن ..... ٹرن کی آواز نے اسے چونکا دیا دراصل دروازے پر گھنٹی بجی تھی فرحان نے دروازہ کھولا اور اخبار لیا اور دروازہ بند کرکے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ اس نے اخبار کھولا تو اس میں بچوں کا صفحہ تھا فرحان نے اخبار کو تو ایک طرف رکھا اور خود بچوں کا صفحہ پڑھنے لگا۔ جب اس نے بچوں کے صفحے پر اپنے دوست محبوب کی تحریر دیکھی تو سوچنے لگا میں بھی کوئی کہانی لکھوں تاکہ وہ بھی کسی اخبار کی زینت بنے۔ یہی سوچ کر اس نے قلم اور کاپی اٹھائی اور کہانی لکھنے بیٹھ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا لکھے کیا نہیں ..... فرحان دو لفظ لکھتا پھر اسے مٹا دیتا۔ آخر صفحے پر کچھ نہ لکھ پایا۔ فرحان جو کہانیاں لکھنا بڑی آسان بات سمجھتا تھا۔ آج اسے احساس ہوا کہ کہانی لکھنا بہت مشکل بات ہے۔ وہ بھاگا بھاگا اپنی بہن عاشی کے پاس گیا اور کہا کہ مجھے کہانی لکھنی ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا لکھوں کیا نہیں؛ تم کوئی مشورہ دو عاشی بولی لو یہ بھی کوئی مشکل بات ہے تم ایسا کرو کہ بھائی جان کی کہانی چرا کر نقل کرکے لکھ لو اور اسے پھر پھاڑ دو فرحان نے خوشی سے قہقہہ لگایا اور کہا واہ بھئی واہ کیا مشورہ تو میرے لئے بہت مفید ہے اب مسئلہ صرف یہی تھا کہ کہانی کو چرائی کیسے جائے کیوں کہ بھائی جان تو کمرے کے اندر کچھ لکھنے میں مصروف ہیں۔ تو عاشی نے کہا کہ تھوڑی دیر بھائی جان باہر گھومنے

چلیں جائیں گے۔ اور پھر تم بڑی آسانی سے کہانی چرا لینا۔ اب فرحان بھائی جان کے جانے کا بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ جب بھائی جان چلے گئے تب فرحان کے لئے کہانی چرانے کا بہترین موقع تھا۔

چنانچہ وہ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ذیشان کے کمرے میں چوروں کی طرح گھس گیا۔ اور ذیشان کی کہانی ڈھونڈنے لگا۔ کافی دیر ڈھونڈنے کے باوجود اسے کہانی نہیں ملی۔ فرحان پھر عاشی کے پاس آیا اور کہا عاشی بتاؤ بھائی جان نے کہانی کہاں چھپا کر رکھی ہے۔ میں نے کہانی بہت ڈھونڈی مگر نہ ملی تو عاشی نے کہا کہ کہانی بھیا کے بیگ میں پڑی ہوئی ہے۔ جلدی سے اٹھا لاؤ۔ فرحان دوبارہ بھائی جان کے کمرے میں گیا اور کہانی اٹھا لایا اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اُسے نقل کرنے لگا آخر پوری کہانی نقل کر کے لکھ لی۔

اور اسے لفافے میں بند کر کے لیٹر بکس میں ڈال آیا۔ اور ذیشان کی کہانی پھاڑ کر گندی نالی میں پھینک دی۔ ادھر جب ذیشان واپس آیا تو اس نے کہانی ڈھونڈی بہت ڈھونڈی مگر نہ ملی اور نہ ملنی تھی۔ ذیشان نے سارے گھر والوں سے پوچھ ڈالا کہ میری کہانی کہاں گئی۔ عاشی اور فرحان کے علاوہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ آخر ذیشان تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ چند ہفتوں بعد فرحان کی بھیجی ہوئی کہانی اخبار میں چھپ گئی۔ فرحان بڑا خوش ہوا۔

ادھر جب ذیشان نے اس کی کہانی اخبار میں دیکھی تو وہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے گھر آتے ہی کہا کہ فرحان نے میری کہانی چوری کر کے اپنے نام سے بھیج دی۔ فرحان کہاں ہے۔ میں اسے کہانی چوری کرنے کی سزا ضرور دوں گا۔ ذیشان بڑے غصے سے کہہ رہا تھا۔ جب ذیشان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تب فرحان گھر آیا۔ تو ذیشان نے آتے ہی سوال کیا کہ تم نے میری کہانی نقل کیوں کی۔ تو فرحان نے خوفزدہ ہوتے ہوئے۔ ساری حقیقت اپنے بھائی ذیشان کو بتا دی تو ذیشان نے شفقت بھرے انداز سے فرحان کو سمجھایا کہ اگر تم کہانیاں نقل کر کے بھیجتے رہے تو تم مستقبل کے ادیب کس طرح بنو گے۔ تم روزانہ کہانیاں لکھنے کی مشق کرو اور چھوٹی چھوٹی کہانیاں لکھ کر اخبار میں بھیج دیا کرو اس طرح تم ایک نہ ایک دن بڑی بڑی اور اچھی اچھی کہانیاں لکھنے والے بہترین ادیب بن جاؤ گے۔ کہانیاں لکھنے کے لئے بھی بڑی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس طرح ہم امتحانات میں بڑی محنت کرتے ہیں اور پھر اس محنت کے نتیجہ میں ہم کو شاندار نمبر ملتے ہیں اگر محنت نہ کریں تو امتحان میں فیل ہو جاتے ہیں۔ فرحان اپنے بھائی کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ آخر فرحان نے عہد کر لیا کہ وہ کہانیاں لکھتا رہے گا اور کبھی بھی ہمت نہیں ہارے گا۔ چنانچہ اس نئے عزم کے ساتھ وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اتفاق کی برکت

مرسلہ: ھالہ حسن، اسلام آباد

کسی شہر میں ایک لڑکی اپنے امّی ابّو کے ساتھ رہتی تھی اس لڑکی کا نام تھا "ڈیانا"

ڈیانا کو جانور پالنے کا بہت شوق تھا اس لئے اس کو اس کے ابّو نے بلّی کے دو بچے لاکر دیئے تھے دونوں بلّی کے بچے آپس میں بہت لڑتے تھے۔ بلی کے بچوں کی ماں دونوں کو بہت سمجھاتی کہ اتفاق میں برکت ہے۔ مگر وہ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے اُڑا دیتے۔ وہ ایک ساتھ کھیلتے بھی نہ تھے ایک دن ایک بلّی کا بچہ باغ کی سیر کر رہا تھا۔ کہ ایک بہت بڑی بلّی سامنے آگئی اور اس نے بلی کے بچے کو مارنا شروع کر دیا اور دوسرا بھائی اس کو دیکھتا رہا جب بلّی چلی گئی تو پہلا بلّی کا بچہ اپنے گھر آیا اور اپنے بھائی سے کہا کہ آج مجھے ایک بلّی نے شدید زخمی کیا ہے اگر ہم دونوں باغ میں ہوتے اور مل کر مقابلہ کرتے تو وہ مجھے چھو بھی نہ سکتی پھر دونوں میں دوستی ہو گئی ایک دن وہ باغ میں کھیل رہے تھے کہ وہی بلّی سامنے سے آتی ہوئی نظر آئی بلّی نے دونوں پر حملہ کیا مگر دونوں بلّی کے بچوں نے مقابلہ کیا اور اس طرح بلّی بھاگ گئی اب دونوں بلّی کے بچوں کو پتہ چل گیا کہ اتفاق میں برکت ہے۔

ٹارچ اور مچھر

عنبر چغتائی

چلتے پھرتے گنبد نے — یعنی گل محمد نے
نیلامی سے فوجی کی — مچھر دانی لے ڈالی
گو پھٹی پرانی تھی — پھر بھی مچھر دانی تھی
وہ اور انکے دو بیٹے — مچھر دانی میں لیٹے
سُوراخوں سے مچھر آئے — کان پہ انکے روئے گائے
دیکھی جب یہ بیدردی — اُٹھ کر بجلی گل کر دی
جگنو اک اُڑتا اُڑتا — بھولا بھٹکا آ نکلا
رستہ جگنو نے پایا — مچھر دانی میں آیا
گل محمد جھنجلائے — غصّے میں یوں چلائے
دیکھی حرکت مچھر کی — بیٹھے بیٹھے کیا سوجھی

دیکھا جب اندھیرا ہے
ٹارچ لے کر آیا ہے

ایجادات کی کہانی

مرسلہ: شہزاد آفریدی، کراچی

دو بین مشہور سائنس دان گیلی لیو نے ایجاد کی۔

دنیا کا پہلا اسٹیم انجن "جیمز واٹ" نے ایجاد کیا۔

۱۸۰۴ء میں دنیا کا پہلا ریلوے انجن ایجاد ہوا۔ اس کے موجد کا نام "جارج اسٹیفنسن" تھا۔

دنیا کی سب سے پہلی لالٹین ۱۸۱۵ء میں سر ہمفرے ڈیوی نے ایجاد کی۔

۱۸۳۱ء میں "فیراڈے" نے بجلی کے کرنٹ کو ظاہر کر کے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا۔

دنیا کا پہلا جہاز دو بھائیوں "اورول اور ولبرٹ رائٹ" نے ایجاد کیا، اور پہلی بار ۱۷ دسمبر ۱۹۰۳ء کو پرواز کی۔

دنیا کا پہلا فلم کیمرہ ۱۸۸۴ء میں فاکس ٹالبوٹ نے ایجاد کیا۔ اس کے بعد کیمرے نے ترقی کی اور اس طرح سینما گھر بنائے جانے لگے۔

"جان لوئی" کی کوششوں سے ۳۰ ستمبر ۱۹۲۹ء کو بی بی سی نے اپنا پہلا ٹیلیویژن پروگرام نشر کیا، اور اس کے موجد کو حکومت برطانیہ نے بابائے ٹیلیویژن کا خطاب دیا۔

لاپرواہی کا نتیجہ

سعود احمد ڈی ایم سی ایم۔ سوسائٹی کراچی

ایک لڑکا تھا اکرم۔ وہ ہر کام میں تیز تھا خواہ پڑھائی ہو یا کھیل کا میدان ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا کلاس میں بھی اول آتا تھا لیکن ان اچھائیوں کے ساتھ اسمیں ایک بہت بُری عادت بھی تھی وہ یہ کہ اپنی چیزوں کو کبھی جگہ پر نہیں رکھتا تھا۔ جو چیز استعمال کرتا۔ وہیں چھوڑ کر اٹھ جاتا۔

اس کی امّی اس کو بہت سمجھاتیں، اکثر ڈانٹتیں مگر اس کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اس کی امّی اس کی اس عادت سے بہت پریشان تھیں ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس کو کسطرح سمجھائیں کہ اس کی یہ عادت ختم ہو۔

اگر گھر میں کوئی چیز کھو جاتی تو اس پر اکرم کا ہی نام آجاتا اب چاہے اس سے کھوئی ہو یا نہیں اسی کو ڈانٹ پڑتی۔ ان تمام باتوں کے باوجود اس نے اپنی عادت نہ چھوڑی۔

ایک دن اس کو اپنے کئے کی سزا خود ہی مل گئی۔ ہوا یوں کہ ایک روز اس کے تمام گھر والوں کو صبح سے کہیں جانا تھا۔ لیکن چونکہ اس روز اکرم کا میچ تھا اور چونکہ وہ بہت اچھا کھیلتا تھا سب کا اصرار تھا وہ اس میچ میں ضرور کھیلے لہذا وہ سب کے ساتھ نہ جا سکا۔ مگر اس کی امّی یہ سوچ کر پریشان ہو رہی تھیں کہ جانے ان کے پیچھے اکرم گھر کا کیا حال کرے گا اس وجہ سے وہ آخر تک اکرم کو ہدایت دیتی رہی کہ "دیکھو بیٹے" "گھر کی ہر چیز جگہ پر رکھنا۔ جگہ جگہ نہ بکھیرنا وغیرہ وغیرہ۔

پھر جب اس کے تمام گھر والے چلے گئے اور وہ اکیلا رہ گیا تو اس کو بوریت محسوس ہوئی۔ اس نے سوچا کہ کیوں نہ کہانیاں پڑھی جائیں اور اپنی ساری کہانیاں لے کر بیٹھ گیا اور پڑھنی شروع کی تو اس کو یہ لگا کہ جیسے یہ کہانی پڑھی ہوئی ہے اس نے اس کہانی کو ایک طرف ڈالا اور دوسری اٹھالی پھر یکے بعد دیگرے ہر کہانی کا یہ ہی حشر ہونے لگا۔ جلدی اس کا دل اکتا گیا تو وہ کہانیاں وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا اس طرح پورے کمرے میں کہانیوں کی کتابیں بکھری ہوئی تھیں۔

اب اس نے سوچا کہ کچھ اور کرنا چاہیئے یکایک

اس کو خیال آیا کہ سر نے جو ڈرائینگ کرنے کو دی تھی وہ کر لی جائے۔ پھر وہ اپنے واٹر کلر وغیرہ لے کر بیٹھ گیا۔ کلر کر کے اس نے ڈرائنگ وہیں سکھانے کے لئے رکھی اور سب چیزیں وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا کیوں کہ اسی وقت کال بیل بجی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی اس کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ سامنے ہی اس کا دوست عدنان کھڑا تھا۔

"واہ یار اچھا ہوا تم آ گئے میں اکیلا بور ہو رہا تھا سب لوگ تو صبح سے ہی گئے ہوئے ہیں۔" اکرم نے خوش ہو کر کہا۔

"اچھا! لیکن تم کیوں نہیں گئے۔ عدنان نے پوچھا "ارے عدنان! تم بھول گئے آج تو ہماری ٹیم کا میچ ہے۔" اکرم نے اسے یاد دلایا۔

اوہ! ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا" عدنان نے کہا" اچھا بھئی اب اندر بھی چلو گے یا یہیں کھڑا رکھو گے" عدنان نے پوچھا"۔

"کیوں نہیں۔ کیوں نہیں آؤ اندر آؤ اب ہم خوب مزے سے کھیلیں گے اکرم نے عدنان سے کہا پھر اکرم عدنان کو لے کر اپنے کمرے میں آ گیا عدنان نے جو اس کے کمرے کا نقشہ دیکھا تو اس نے فوراً پوچھا۔ "ارے کیا تمہارے کمرے کی صفائی نہیں ہوئی جو اس قدر پھیلا ہوا ہے۔"

عدنان نے اندر داخل ہوتے ہی کہا۔

"نہیں بھئی صبح تو امّی نے کی تھی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر کمرے میں ایک زندہ وجود ہو تو کمرہ تو پھیلے گا اور اب میں ان چیزوں کو کہاں تک سمیٹوں۔ امی آئیں گی تو سمیٹ لیں گی" اکرم نے لاپرواہی سے کہا۔

"اچھا بھئی جیسے تمہاری مرضی لیکن میری امی تو کہتی ہیں کہ اس طرح چیزیں پھیلانے سے آدمی ان سے ٹکرا کر گر بھی سکتا ہے۔ عدنان نے اس کو بتایا۔

"ارے میں کوئی انڈھا تھوڑی ہوں جو گر جاؤں گا اللہ نے مجھ کو آنکھیں دی ہیں۔" اکرم نے جواب دیا۔"

اس کی بات سن کر عدنان خاموش ہو گیا پھر وہ لوگ لوڈو کھیلنے لگے اس سے دل بھر گیا تو کیرم کھیلنے لگے۔

پھر وہ لوگ لوڈو اور کیرم وغیرہ یوں ہی چھوڑ کر اٹھ گئے۔

"ارے یار ان چیزوں کو تو جگہ پر رکھ دو" عدنان نے کہا۔ "کیا بات ہے یار جب سے آئے ہو مسلسل نصیحتیں کئے جا رہے ہو۔ لگتا ہے کہ آج تمہارے اندر کسی بوڑھے کی رُوح گھس گئی ہے؟

اکرم نے ناک بھنویں چڑھاتے ہوئے کہا۔

"جیسے تمہاری مرضی میں تو تمہارے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں۔

عدنان نے جواب دیا۔

اور پھر وہ دونوں باورچی خانے میں چائے بنانے کے لئے چلے گئے۔

"چائے بنانا بھی کیا مشکل کام ہے پہلے چائے کا پانی پکاؤ پھر پتی ڈالو پھر دودھ جوش کرو اور پھر کپ

میں ڈالو اُف! کتنا مشکل کام ہے" اکرم نے اکتاہٹ سے کہا" کاش کہ کوئی پاؤڈر ہوتا۔ پانی میں پاؤڈر ڈالتا اور پھر جھٹ چائے بن گئی۔"

" اکرم! تم اس قدر کام کرنے سے کیوں گھبراتے ہو۔ فکر نہ کرو تھوڑے عرصے بعد تو ایسا ہوگا کہ کھانے کی گولیاں آجائیں گی نہ کھانا پکانے کی جھنجھٹ اور نہ زیادہ اہتمام کرنے کی حاجت۔ عدنان نے اس کو بتایا اتنی دیر میں چائے تیار ہوگئی اور ان دونوں نے کمرے میں بیٹھ کر چائے پی تھی کہ اکرم کو ایک دم سے خیال آیا کہ میچ کا تو ٹائم ہو چکا ہے۔

" ارے یار میچ کا وقت تو ہوگیا۔ اور ہم کو احساس ہی نہیں ہوا۔" اکرم نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

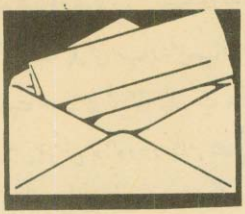
" اوہ! میں ابھی تیار ہو کر آیا تم بھی جلدی سے تیار ہو جاؤ ہم دونوں ساتھ ہی چلیں گے" عدنان نے جلدی سے کہا۔ اور پھر وہ تیار ہونے اپنے گھر چلا گیا اور اکرم تیار ہونے لگا۔ اس نے ایک شرٹ نکالی جس کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے اس نے وہ شرٹ وہیں پر پھینکی اور دوسری پینٹ شرٹ نکال لی اور جلدی جلدی پہنی۔ اتنی دیر میں عدنان تیار ہو کر آگیا" ارے بھائی تم اب تک تیار نہیں ہوئے۔" عدنان نے حیرانی سے پوچھا" بس یار ہو گیا تیار۔ صرف جوتے پہننے ہیں یہ بتاؤ کہ یہ والے جوتے پہنوں یا وہ والے" اکرم نے عدنان کو جوتے دکھاتے ہوئے پوچھا۔

" یہ پہن لو یہ زیادہ اچھا ہے۔" عدنان نے سفید جوتوں کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر دوسرے جوتے وہیں چھوڑ کر وہ میچ کھیلنے چلے گئے۔" اور جب اکرم رات کے وقت اپنے گھر آیا تو..... جیسے ہی وہ گھر میں داخل ہوا۔ لائٹ چلی گئی اب وہ لیمپ ڈھونڈنے کے لئے اپنے کمرے میں ٹارچ لینے کے لئے جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا تو وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اور اس کی آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ اور کمرے میں سب گھر والے جمع تھے اور اس کے ایک ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی امی سے پوچھا امی میں کہاں تھا۔

" بیٹے جب ہم آئے تو بیل دینے سے بھی تم نے دروازہ نہ کھولا تو ہم سمجھے کہ شاید تم ابھی آئے نہیں اور ہم چابی سے دروازہ کھول کر اندر آگئے تو دیکھا کہ تم اپنے کمرے میں بے ہوش پڑے ہوئے ہو۔ اور تمہارا منہ ٹکر کی پلیٹ پر تھا اور ہاتھ پیالی پر جس کی وجہ سے پیالی ٹوٹ گئی تھی۔ اور تمہارے ہاتھ سے خون بہہ رہا تھا۔ اور تمہاری ڈرائنگ کاپی پر پانی پھیل چکا تھا پورا کمرا بکھرا ہوا تھا تم کو اٹھا کر پلنگ پر بٹھایا اور ڈاکٹر کو بلا کر دکھایا تو انہوں نے بتایا کہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں ہے سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے بے ہوش ہوگئے ہیں۔ اور ہاتھ پر پٹی باندھ دی۔

اکرم کو اپنی غلط عادت کی سزا مل چکی تھی۔ اس کے بعد اکرم نے اس عادت سے توبہ کر لی۔ اب اس کے کمرے کی ہر چیز اپنی جگہ پر ہوتی ہے۔

آؤ ملائیں ہاتھ





محمد ہلال حنیف ، تیرہ سال
جماعت ہفتم ،مشغلہ ،ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی

معرفت، رحمانیہ سلک ملز، سرگودھا روڈ، فیصل آباد



محمد کامران رفیق ، تیرہ سال
جماعت نہم ،مشغلہ، معلوماتی کتب پڑھنا
بڑے ہوکر پائیلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، کیمسٹری

۲/۸۰ الیف، مارٹن کوارٹرز، نزد عثمانیہ مسجد، کراچی



انتظار مہدی ، چودہ سال
جماعت ہشتم ،مشغلہ، فٹبال کھیلنا
بڑے ہوکر انسپکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اسلامیات

رول نمبر ۴۲، گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۲، ڈیرہ اسمٰعیل خان



سدفراز جمیل، گیارہ سال
جماعت پنجم ،مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو

مکان نمبر ۱۲۱/۱ محلہ میانہ پورہ، گرین وڈ اسٹریٹ، سیالکوٹ



عمر النور خان ،پندرہ سال
جماعت نہم ،مشغلہ، فٹبال کھیلنا
بڑے ہوکر کمانڈو بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، بیالوجی

مکان نمبر ۳، گلی نمبر ۳۷، غازی نگر، عثمان آباد، کراچی ۳



غلام مرتضیٰ ، تیرہ سال
جماعت ہشتم ،مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہوکر انجینئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

۵۱/۷، نیو وحدت کالونی ——— حیدرآباد



آصف شہزاد، آٹھ سال
جماعت سوئم، مشغلہ، آنکھ مچولی پڑھنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس

پوسٹ بکس نمبر ۱۳۶۴، ایف بی ایریا ——— کراچی



کاشف منور، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہوکر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی

مکان نمبر بی/۲۹۷، گلی نمبر ۱۵، ٹرنک بازار، ——— راولپنڈی



جواد حسن، چودہ سال
جماعت دہم، مشغلہ معلومات عامہ
بڑے ہوکر فوجی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ریاضی

موضع جودھر پور، تحصیل کبیر والا، ——— ضلع خانیوال



عبدالرحیم قادری، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، خوشخطی
بڑے ہوکر عالم دین بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سندھی

ایم آر، ۱۷/۶ عبدالرحمٰن اسٹریٹ جوڑیا بازار، ——— کراچی



شاہد حسین، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر اسکول ٹیچر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، بیالوجی

خان صاحب جنرل اسٹور، موہڑہ شریف، ——— لاہور



محمد اظہر عنایت، چودہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کہانیاں پڑھنا
بڑے ہوکر آرمی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، ریاضی

عنایت اللہ عقب ریاض مارکیٹ، ریلوے روڈ، شکر گڑھ



عادل نیم، گیارہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

مکان نمبر ۲۸، چاند بی بی روڈ، ——— کراچی



محمد ندیم، سولہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، بیالوجی

مکان نمبر ۵/۶، رحمانیہ مسجد، ناظم آباد، ——— کراچی



ایس ایم، شہاب، تیرہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

۹/ایل النصیر اسکولز، لیاقت آباد ——— کراچی



شبیر حسن، آٹھ سال
جماعت سوئم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہوکر کرکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو

معرفت رجب علی سنیئر ایگزیکٹو مینجر حبیب شوگر ملز، نوابشاہ



وجاہت اللہ، چودہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، مطالعہ کورس
بڑے ہو کر انجنیئر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی

۷/ ۸۲ دارالاکرام، اولڈ سکھر ——— سندھ



عبداللہ خان آفریدی، پندرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر پرنسپل بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اسلامیات

مکان نمبر ایف/۳-۱۳۵، بلدیہ ٹاؤن ——— کراچی نمبر ۵



حفیظ الرحمٰن، سترہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر کرکٹ ماسٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، الیکٹریسٹی

۱۰/ ۲۵ بی ون ایریا، لیاقت آباد ——— کراچی ۱۹



محمد بچل، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، مطالعہ کرنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، معاشرتی علوم

معرفت مہر علی جروار، اناج منڈی، ——— شہداد کوٹ



محمد سعید گلاب، پندرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کہانی لکھنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، سائنس

کوارٹر نمبر ۱۹/۱۳ ایس ——— کورنگی نمبر ۱ کراچی



ریحان الدین جمیل، چودہ سال
جماعت ہفتم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب

۵۲۶/۸ لیاقت آباد ——— کراچی ۱۹



راشد احمد، گیارہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، مطالعہ کرنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حیاتیات

۵۲/۲ الیف سی ایریا، لیاقت آباد، ——— کراچی



محسن ندیم، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی

پی/۲۹۴ گلی نمبر ۳ گیٹ نمبر ۱، سمن آباد، فیصل آباد



سید اشعر اشرف، چودہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، ہاکی کھیلنا
بڑے ہو کر کمانڈر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، اردو

سی/۱۳۶ بلاک آئی نارتھ ناظم آباد ——— کراچی



محمد انجم، چودہ، سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر کیا ہوں گا، ابھی نہیں سوچا!
پسندیدہ مضمون، مطالعہ پاکستان

مسلم واچ میکر، ایم اے جناح روڈ ——— سانگھڑ



محمد ارشد خان، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہو کر ملک کی خدمت کرنا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
۱۹، بی ون ایریا، لیاقت آباد ——— کراچی ۱۹



ساون چانڈیو، گیارہ سال
جماعت چہارم، مشغلہ، قلمی دوستی
بڑے ہو کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا
پسندیدہ مضمون، اسلامیات
معرفت لہنو چانڈیو، نثار کریانہ اسٹور، کنری تھرپارکر



جنید ایوب، گیارہ سال
جماعت پنجم، مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہو کر فوجی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
نزد لال ٹنکی، سمن آباد ——— لاہور



ضمیر احمد، چودہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کتب پڑھنا
بڑے ہو کر ملک و قوم کی خدمت کروں گا
پسندیدہ مضمون، اسلامیات
ایل/۲۲، کورنگی نمبر ۴ ——— کراچی ۳۱



خالد ایاز، اٹھارہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر ڈاکٹر بنوں گا۔
پسندیدہ مضمون، انگریزی
مکان نمبر ۲۰/۸۰ دربار روڈ، حافظ آباد ——— پنجاب



عبداللہ آفریدی، چودہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، رسائل پڑھنا
بڑے ہو کر فوجی بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی
مکان نمبر ۲۲۹۵، فیصل کالونی، بلدیہ ٹاؤن، کراچی



ظہور حسین شاہ، سولہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، ٹکٹ جمع کرنا
بڑے ہو کر فوجی آفیسر بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، حساب
مکان نمبر بی/۳۸ مظفر آباد کالونی، ——— لانڈھی، کراچی



طارق ندیم، تیرہ سال
جماعت ہشتم، مشغلہ، کہانیاں پڑھنا
بڑے ہو کر فوج میں جانا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، انگریزی
گورنمنٹ ہائی اسکول نمبر ۱ چشتیاں، ضلع بہاولنگر



آصف حسین، پندرہ سال
جماعت نہم، مشغلہ، کرکٹ کھیلنا
بڑے ہو کر پائلٹ بننا چاہتا ہوں
پسندیدہ مضمون، مطالعہ پاکستان
سی/۲۹-۳۰، جی او آر کالونی ——— حیدر آباد



وحید کلہوڑو، سولہ سال
جماعت دہم، مشغلہ، دوستی کرنا
بڑے ہو کر سندھ کا گورنر بنوں گا
پسندیدہ مضمون، سندھی
نزد پولیس ہیڈ کوارٹر، نواز منزل، شکارپور روڈ، سکھر



ایک صفحہ امّی ابُو کے لیے

اَبّو وعدہ کیجئے

اُبّو آپ چاہتے ہیں ناکہ ہم لوگ پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنیں۔ اَبُو آپ کی خواہش ہے ناکہ ہم لوگ بڑے ہوکر وطن کا نام روشن کریں۔ اور آپ یہ بھی چاہتے ہیں ناکہ ہم اپنے سیرت اور کردار کی تعمیر کریں؛

اِس مقصد کے لئے آپ نے ہمیں اچھے سے اسکول میں داخلہ لے کر دیا ہے۔ آپ ہر ماہ اسکول کی بھاری فیس بھی ہمارے ہی لئے ادا کرتے ہیں۔ آپ ہمارے دیگر تعلیمی اخراجات کا بوجھ بھی برداشت کرتے ہیں اور ہمارے آرام و آسائش کا کتنا خیال رکھتے ہیں۔

آپ کتنے اچھے ہیں اَبُو مگر سچ سچ بتایئے اَبُو آپ روزانہ اپنی کاروباری مصروفیات میں سے کتنا وقت ہمارے لئے نکالتے ہیں؟

ہمیں گھر میں پڑھانے کے لئے آپ کتنا وقت صرف کرتے ہیں؟ آپ ہمیں جس کردار میں ڈھالنا چاہتے ہیں، کیا آپ خود بھی ہمارے لئے ویسے ہی کردار کا نمونہ ہیں....؟

اَبُو آپ ہی ہمارا آئیڈیل نہیں ہوں گے تو ہم دوسروں کا آئیڈیل کیسے بنیں گے....؟

ہم آپ سے کچھ بھی تو نہیں چاہتے۔ بس ہر روز تھوڑا سا پیار۔ تھوڑی سی توجہ۔

اَبُو وعدہ کیجئے۔ آپ ہمیں اپنی ہر چیز سے زیادہ عزیز رکھیں گے۔ اور اپنے پیار کا ثبوت اپنے عمل سے دیں گے۔ ہم بھی آپ سے وعدہ کرتے ہیں کہ ہم آپ کو مایوس نہیں کریں گے۔ ہم روز و شب کی محنت سے آپ کے خوابوں میں تعبیر کا رنگ بھر دیں گے۔ انشاء اللہ



ASHRAF PRODUCTS.

P.O. Box No. 3546 KARACHI. CABLE: TWO-IN-ONE

Regd. No. M-266 JULY 1987
Monthly AANKH MICHOLEE Karachi



بلو بینڈ مارجرین - غذائیت اور لذت سے بھرپور

بچوں کو توانائی کا خزانہ چاہیئے۔ اپنے بچوں کو بلو بینڈ دیجئے کیونکہ بلو بینڈ بچوں کی بہترین نشوونما کرنے والی غذا کا ایک اہم حصہ ہے غذائیت اور لذت سے بھرپور بلو بینڈ میں وٹامن اے اور ڈی شامل ہیں۔ بلو بینڈ کو ڈبل روٹی کے سلائس یا نان پر لگا کر دیجئے، آپ کے بچے اس کو بہت پسند کریں گے۔ بلو بینڈ نے صحت کو لذت کی شکل دی ہے۔



بلو بینڈ مارجرین
خاندان کی چاہت بھری نگہداشت کے لئے

لاریب پرنٹنگ پریس کراچی فون: ۲۱۷۳۱۰-۲۱۷۴۴۰